اردو زبان و لسانیات

گوپی چند نارنگ

رام پور رضا لائبریری

''اردو زبان اور لسانیات'' پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ان گراں قدر لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو زبان کے حوالے سے وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ یہ مضامین گذشتہ پچیس تیس سال کے دوران اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں کہ یہ ہندوستان کے سماجی، تہذیبی، تاریخی اور لسانی تناظر میں اردو زبان کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرتے ہیں اور اردو میں جدید لسانیاتی مباحث کا باقاعدہ طور پر آغاز کرتے ہیں۔ان یادگار مضامین کی اشاعت سے اردو کے لسانیاتی ادب میں نہ صرف وقیع اضافہ ہوا ہے بلکہ اردو زبان کو علمی وقار بھی حاصل ہوا ہے۔ یہ مضامین نارنگ صاحب کی لسانیاتی فکروبصیرت کو سمجھنے اور ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں اردو کو درپیش مسائل سے متعلق ایک صاحب نظر ادیب کے موقف کو جاننے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اردو زبان اور اس کے رسمِ خط سے نارنگ صاحب کو جو فطری اور والہانہ لگاؤ ہے اور اردو کے لسانیاتی مسائل و مباحث سے انھیں جو گہری دلچسپی ہے اُس کی واضح تصویر ہمیں ان مضامین میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ، جنھوں نے لسانیاتِ جدید کی تربیت امریکہ کی وسکانسن اور انڈیانا یونیورسٹیوں میں قیام کرکے حاصل کی، ہمارے عہد کے ایک جید عالمِ زبان وادب اور بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد ودانشور ہیں۔ لسانیات وصوتیات سے انھیں گہری دلچسپی ہے۔ اطلاقی لسانیات کے تمام شعبوں میں جو شعبہ نارنگ صاحب کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے وہ اسلوبیات ہے۔ نارنگ صاحب اس کے بنیادگذاروں میں ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک علمی امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں

(بقیہ دوسرے فلیپ پر)

اردو زبان اور لسانیات

اردو زبان اور لسانیات

گوپی چند نارنگ

رام پور رضا لائبریری
قلعہ رامپور، رامپور یوپی 244901

سلسلۂ مطبوعات رام پور رضا لائبریری

© author

Urdu Zabaan aur Lisaaniyaat

by

Gopi Chand Narang

سنہ اشاعت : 2006

قیمت : 450 روپے

کمپوزنگ : محمد موسیٰ رضا

ناشر : ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

افسر بکار خاص، رام پور رضا لائبریری

مطبع : پرنٹولوجی انک

2660، کوچہ چیلان، دریا گنج، دہلی 110002

ISBN : 81-87113-89-0

انتساب

انتظار حسین کے نام

جو ہمارے عہد میں اردو زبان

اور اس کے تہذیبی مضمرات کا

روشن استعارہ ہیں

فہرست

حرفِ آغاز	وقارالحسن صدیقی	9
دیباچہ	گوپی چند نارنگ	11
پیش لفظ	مرزا خلیل احمد بیگ	15

1	اردو ہماری اردو	37
2	اردو کی ہندستانی بنیاد	51
3	اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ	56
4	اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر	71
5	اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک I	78
6	اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک II	90
7	قصہ اردو زبان کا	101
8	اردو رسم الخط — ایک تاریخی بحث	108
9	اردو رسم الخط: تہذیبی و لسانیاتی مطالعہ	116
10	اردو املا اور لسانیات (روایت اور اجتہاد کی روشنی میں)	141
11	دتاتریہ کیفی کی لسانی خدمات	169
12	احتشام حسین کی لسانی خدمات	191
13	فرمان فتح پوری اور اردو	205

14	کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ	218
15	اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی	259
16	انجمن ترقی اردو کی کل ہند اردو کانفرنس	270
17	بہار کا تاریخی اقدام	277
18	کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس	282
19	اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت	285
20	ہمزہ کیوں؟	297
21	ن یا ں	312
22	اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی — امتیازی خصوصیات کی روشنی میں	331
23	اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی — امتیازی خصوصیات کی روشنی میں	356

1 / 437	Aspiration and Nasalization in the Generative Phonology of Hindi-Urdu	24
36 / 402	Generative Phonology and the Retroflex Flaps of Hindi-Urdu	25

حرف آغاز

میرے کئی برس کے مسلسل اصرار پر پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنی انتہائی مصروفیتوں سے وقت نکال کر اردو زبان پر لکھے گئے اپنے پچیس انتہائی اہم مضامین منتخب کیے اور کتابی شکل دی۔ یہ مضامین ہندوستان کی صدیوں کی ملی جلی تہذیب اور ثقافت کی آئینہ دار اردو زبان کے تاریخی ارتقا اور پس منظر کو بڑی علمی و تکنیکی مہارت سے پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ بین الاقوامی سطح کے مشہور دانشور، ادیب، نقاد اور ماہرِ لسانیات ہیں اور اردو زبان کے ایسے ہر دلعزیز اسکالر ہیں کہ انھیں ملک کی ساہتیہ اکادمی کے پریسیڈنٹ کے لیے بذریعہ انتخاب نہایت اہم اور وقیع قومی منصب پر فائز کیا گیا ہے اور اس قدر فعال شخصیت ہیں کہ اکادمی کے ذریعہ کئی بین الاقوامی سطح کے سمینار اور فنکشن آرگنائز کیے گئے ہیں۔ ان کی کوششوں سے ہندوستان کی سبھی زبانوں کی ترقی ہورہی ہے اور بالخصوص اردو زبان کو بھی مزید وقار حاصل ہوا ہے۔

نارنگ صاحب نے اپنی پوری زندگی اردو ادب، تاریخ، ثقافت اور لسانیات کی خدمت میں صرف کی ہے۔ ان کے اس خیال سے سبھی متفق ہوں گے کہ اردو کو محض ایک زبان سمجھنا اور اسے آٹھویں شیڈول کی درجہ بندی تک محدود رکھنا اردو کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ اردو زبان ہندوستان کی ایک ہزار سالہ مشترک تہذیب کی وراثت ہے۔ نارنگ صاحب کے خیال میں اردو کا رسم الخط بھی بڑی تہذیبی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے جسے تبدیل کرنا زبان کی شخصیت کے قتل کے مترادف ہے۔

اس کتاب میں ایسے مضامین منتخب کیے گئے ہیں جن سے اردو زبان کی تاریخ، خصوصیات اور رسم الخط کے مختلف پہلوؤں پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ زبان کی ہیئت،

اس کی صوتیات، اسلوبیات اور بہت سارے تکنیکی مسائل کو بڑے ہی دلکش طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب زبان و ادب کی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے اور غالباً کسی ایک کتاب میں اتنے اہم متنوع مضامین اکٹھا شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب زبان و ادب کے ریسرچ اسکالروں کے لیے لاجواب ثابت ہوگی۔

اس کتاب میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، صدر شعبۂ لسانیات علی گڑھ یونیورسٹی کا عالمانہ اور مبسوط 'پیش لفظ' شامل ہے جس سے کتاب کی اہمیت اور معنویت پر روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر نارنگ صاحب کی فرمائش پر میں نے 'حرف آغاز' کے طور پر چند سطریں لکھ دی ہیں جو کہ رضا لائبریری کے اشاعتی پروگرام کا حصہ ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اردو ادب کے سنجیدہ طلبا اور خاص طور پر اردو لسانیات پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے بڑی معلوماتی اور مفید ثابت ہوگی۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے میں عالی جناب شری ٹی وی راجیسور صاحب، گورنر اترپردیش اور چیئرمین رامپور رضا لائبریری بورڈ اور ممبران اشاعتی کمیٹی کا شکرگزار ہوں جنھوں نے کتاب کی اشاعت کی منظوری عنایت فرمائی اور حکومت کا بھی ممنون ہوں جو رضا لائبریری کے پروگراموں کے لیے خاطرخواہ مالی امداد فراہم کرتی ہے۔

رنگ محل، قلعہ، رضا لائبریری — وقارالحسن صدیقی

30 مئی 2006

دیباچہ

یہ بات بتانے یا جتانے کی نہیں کہ اردو سے میری وابستگی دیوانگی کی حد تک ہے۔ جب لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اردو کی خدمت کررہے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی زبان جس کے ذریعہ کروڑوں اپنی زندگی کو بامعنی بناتے یا اپنے وجود کی شناخت کراتے ہیں وہ کسی فردِ واحد کی خدمت کی محتاج کیسے ہوسکتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گڑھا بنایا اور سنوارا ہے، یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے، یہ ایک طرز حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک اندازِ نظر یا جینے کا ایک سلیقہ وطریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔

اردو کا ایک نام سیکولرازم یعنی 'غیرفرقہ واریت' اور 'بقائے باہم' بھی ہے۔ اردو نے صدیوں سے اس کی معنی خیز مثال قائم کی ہے اور ہر طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محاذ باندھا ہے۔ لمحۂ فکریہ ہے کہ کیا کسی ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد جمہوری معاشرے نہ صرف یہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا جواز فراہم کرسکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر وہ زندہ بھی رہ سکتے ہیں؟

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میرا سفرِ اردو سفرِ عشق ہے۔ عشق اثباتِ خودی کی نہیں تسلیمِ خودی کی راہ ہے جس میں 'لین' کچھ نہیں 'دین ہی دین' ہے اور میں نے تو دیا

کچھ بھی نہیں، میری بساط ہی کیا، اور لے لیا کتنا کچھ۔ یہ کسرِ نفی نہیں کہ میری پہچان جو بھی اور جیسی بھی ہے اردو کی بدولت ہے۔ یہ اردو کی فیاضی نہیں تو کیا کہ میں تو کچھ بھی نہ دے سکا اور اس نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کسی کو بھی کسی نے کیا دیا ہوگا!

اردو میری مادری زبان نہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائیکی بولی جاتی تھی، میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی، نرم اور رسیلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری و ساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اردو کو 'زبانوں کا تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی میں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے۔ کیسے ہندآریائی کے بستے میں عربی فارسی ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگارنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول و عرض میں وہ آج 'لنگوافرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

آج جب میں پچاس برس کے لسانی سفر کے بعد پیچھے مڑ کر اردو زبان کے بارے میں لکھے گئے اپنے مقالات کا انتخاب کرنے بیٹھا ہوں تو ایک کے بعد ایک ذہنی پڑاؤ سامنے آتا ہے۔ موضوعات سے اندازہ ہوگا کہ میرے تجسس و جستجو کی نوعیت کیا رہی ہوگی اور اردو زبان کو کس کس رخ سے دیکھنے اور پرکھنے سمجھنے کی میں سعی کرتا رہا ہوں۔ حق بات یہ ہے کہ یہ سب میرے باطن کی طلب کا عکس بھر ہے۔ محض اتفاق ہے کہ محبت کرنے والوں نے بعض مضامین کو سنگِ میل قرار دیا اور یہ بار بار دوسروں کے مرتبات میں بھی شامل ہوتے رہے۔ ایک مدت سے احباب کی فرمائش تھی کہ اردو زبان سے متعلق منتخب مقالات کی کتاب الگ سے تیار کردوں۔ تحریریں تو

اور بھی بہت ہیں کچھ محفوظ رہ گئیں کچھ سیلِ وقت کے ساتھ مٹ گئیں۔ فی الوقت پچیس (25) منتخب مضامین پیش خدمت ہیں۔

زیرنظر کتاب میں کئی طرح کی تحریریں ہیں علمی بھی، تاریخی بھی، تجزیاتی بھی اور نظریاتی و لسانیاتی بھی۔ شروع کے سات مضامین میں سے زیادہ تر عمومی نوعیت کے ہیں۔ بعض میں اردو کی ہندستانی بنیاد سے بحث کی گئی ہے۔ اردو کا خصوصی امتیازی نشان اس کے عربی فارسی اثرات ہیں۔ سیاسی ہنگامہ پروری کے عہد میں غلط فہمیوں کا پھیلنا ایک عام سی بات ہے۔ یوں بھی جذباتی کاروبار، علم سے کم ہی نسبت رکھتا ہے، اس لیے اس عرفان کو عام کرنا ازبس ضروری ہے کہ اردو کی جڑیں اسی سرزمین میں ہیں اور اس کی کشش و دلآویزی اور مٹھاس اور رس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اس میں کئی زبانوں اور کئی ثقافتوں کا پیوند لگا ہے۔ اردو کا چلن ہندوستان اور پاکستان یعنی پورے برصغیر میں ہے۔ اردو اور ہندی کی بنیاد ایک ہے یعنی کھڑی بولی لیکن اب یہ دونوں زبانیں الگ الگ آزاد اور مستقل زبانیں ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی طاقت ہیں اور ایک کے بغیر دوسری مکمل نہیں۔ اردو ہندوستان اور پاکستان کی متعدد بولیوں اور زبانوں کے درمیان ایک سماجی لسانی اور تہذیبی پل اسی لیے بناتی ہے کہ برصغیر کی بیس پچیس زبانوں میں سے کوئی دو زبانیں ایک دوسرے سے اتنی قریب نہیں جتنی کہ اردو اور ہندی۔ ہندوستان میں اردو کی بقا کے لیے اس رشتے پر زور دینا بیحد ضروری ہے۔ پہلے حصے کے زیادہ تر مضامین اسی معنی خیز رشتے کی مختلف جہات کو پیش کرتے ہیں۔ دوسرے حصے میں تین مضامین اردو رسم الخط پر مرکوز ہیں کیونکہ اردو کے امتیاز کے لیے اردو رسم الخط پر اصرار کرنا نہ صرف فطری بلکہ ضروری ہے۔ بعد کے تین مضامین ان ہندستانی اور پاکستانی شخصیات سے متعلق ہیں جو زبان کے بارے میں اپنے موقف کے لیے جانے جاتے ہیں۔ اگلی شق کے مضامین میں اردو کی قدیم ترین نثری کتاب کا جامع لسانی تجزیہ بھی ہے اور بہار کے دوسری زبان کے تاریخی اقدام کی گفتگو بھی۔ آخری پانچ مضامین واضح طور پر لسانیاتی ہیں، ان میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو بہت

بحث طلب ثابت ہوئے، اور اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی پر تکنیکی مضامین بھی ہیں جو اردو میں سائنسی صوتیاتی امتیازات کے پہلے مضامین ہیں۔ آخری دو مضامین دونوں زبانوں کی Generative Phonology کے خاص مسائل پر ہیں جو نیویارک اور لندن سے نکلنے والے عالمی شہرت کے لسانیاتی جرائد میں شائع ہوئے اور جن سے لسانیات کے اعلیٰ سطحی کورسز میں آج بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ چونکہ مراجعت کے لیے اکثر و بیشتر زیروکس اور مائیکروفش استعمال ہوتے ہیں، اس لیے مطالعے کی آسانی کے لیے ان کے انگریزی متن کی فراہمی ضروری تھی۔ اردوداں حضرات بھی ملاحظہ کریں گے کہ اردو کی محبت میں یہ راقم الحروف کہاں کہاں پہنچا ہے اور کیسے کیسے مراحل پائی کیے ہیں۔

خدا بھلا کرے ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی، افسر بکار خاص، رام پور رضا لائبریری اور ان کی اشاعتی کمیٹی کے اراکین کا کہ ان کی فرمائشِ خاص پر اس کتاب کا کام جو برسوں سے ٹلتا چلا آرہا تھا، مکمل ہوسکا۔ ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی کا پیہم اصرار شامل حال نہ ہوتا تو شاید یہ کتاب اس اہتمام سے منظرعام پر نہ آسکتی۔ ان کا شکریہ ان کی نوازشات اور میرے جذبات سے فروتر ہے۔ میں مشہور ماہر لسانیات اور اپنے عزیز پروفیسر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے ان مضامین کے انتخاب میں مدد دی اور نہایت جامع پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائی۔

نئی دہلی
29 مئی 2006

گوپی چند نارنگ

پیش لفظ

'اردو زبان اور لسانیات' پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ان لسانیاتی مضامین کا گراں قدر مجموعہ ہے جو اردو زبان کے حوالے سے وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ یہ مضامین گذشتہ پچیس تیس سال کے دوران اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں کہ یہ ہندوستان کے سماجی، تہذیبی، تاریخی اور لسانی تناظر میں اردو زبان کی صحیح اور سچی تصویر پیش کرتے ہیں اور اردو میں جدید لسانیاتی مباحث کا باقاعدہ طور پر آغاز کرتے ہیں۔ان یادگار مضامین کی اشاعت سے اردو کے لسانیاتی ادب میں نہ صرف وقیع اضافہ ہوا ہے بلکہ اردو زبان کو علمی وقار بھی حاصل ہوا ہے۔ یہ مضامین نارنگ صاحب کی لسانیاتی فکر وبصیرت کو سمجھنے اور ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں اردو کو درپیش مسائل سے متعلق ایک صاحب نظر ادیب کے موقف کو جاننے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اردو زبان اور اس کے رسمِ خط سے نارنگ صاحب کو جو فطری اور والہانہ لگاؤ ہے اور اردو کے لسانیاتی مسائل و مباحث سے انھیں جو گہری دلچسپی ہے اُس کی واضح تصویر ہمیں ان مضامین میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ، جنھوں نے لسانیاتِ جدید کی تربیت امریکہ کی وسکانسن اور انڈیانا یونیورسٹیوں میں قیام کرکے حاصل کی، ہمارے عہد کے ایک جید عالمِ زبان وادب اور بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد ودانشور ہیں۔ لسانیات وصوتیات سے انھیں گہری دلچسپی ہے۔ اطلاقی لسانیات کے میدان میں بھی انھوں نے اپنے جوہرِ علمی دکھائے ہیں اور اردو میں اس شعبۂ علم کو فروغ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ اس ضمن میں 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو' (1961)، Karkhandari Dialect of Delhi Urdu (1961)، 'املانامہ' (1974)، 'لغت نویسی کے مسائل'

(مرتبہ، 1985)، 'ادبی تنقید اور اسلوبیات' (1989) ان کے وہ گراں بہا علمی کارنامے ہیں جنھیں جویانِ علم و دانش ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اطلاقی لسانیات کے تمام شعبوں میں جو شعبہ نارنگ صاحب کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے وہ اسلوبیات ہے۔ نارنگ صاحب اس کے بنیاد گذاروں میں ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلوبیاتی مضامین میں نہ صرف اسلوبیات کی نظری بنیادوں سے بحث کی ہے بلکہ اس کے مثالی اطلاقی نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ انھوں نے میر، اقبال، میرانیس اور فیض کی شاعری کے جو اعلیٰ معیار کے تجزیے کیے ہیں وہ اسلوبیات کے بہترین اطلاقی نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے ان شعرا کے جو اسلوبی خصائص (Style-features) دریافت کیے ہیں ان سے بڑے دلچسپ نتائج مرتب ہوتے ہیں اور ادبی تنقید کو ایک نئی نظری جہت ملتی ہے۔ اسلوبیات اپنے مزاج کے اعتبار سے توضیحی، تجزیاتی اور معروضی ہے۔ نارنگ صاحب نے اسلوبیات کے جو اطلاقی نمونے پیش کیے ہیں ان میں یہ تینوں خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک علمی امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے پچھلے دو دہوں کے دوران ادبی تنقید کے لسانی مضمرات پر کافی غور وفکر سے کام لیا ہے اور تنقید کے اُن تمام مسالک کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے جن کا رشتہ کسی نہ کسی اعتبار سے زبان یا لسانیات سے استوار ہے خواہ وہ روسی ہیئت پسندی ہو یا ساختیات وپس ساختیات یا مظہریت یا مابعد جدیدیت یا کوئی اور جدید نظریۂ تنقید۔ ان میدانوں میں ان کا کوئی حریف نہیں اور ان موضوعات پر ان کی شائع شدہ کتابوں، مثلاً 'قاری اساس تنقید' (1992)، 'ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات' (1993)، 'اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ' (1998) اور 'جدیدیت کے بعد' (2005) کا کوئی بدل نہیں۔ یہ بات بدیہی ہے کہ ہمارے ادب پر جدیدیت کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اہلِ نقد ونظر تنقید کی نئی تھیوری اور نئے تنقیدی رجحانات ومیلانات کی جانب مائل ہی نہیں ہوتے تھے، اگرچہ یوروپی زبانوں میں ان تصورات کا فروغ بہت پہلے ہوچکا تھا۔ نارنگ صاحب اردو کے اولین نقادوں میں ہیں جنھوں نے نئی تنقیدی تھیوری اور نئے تنقیدی

مباحث پر اس طرح قلم اٹھایا کہ اردو تنقید کی گویا کایا ہی پلٹ دی۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ خواہ وہ اسلوبیات ہو یا ساختیات و پس ساختیات یا مابعد جدیدیت یا قاری اساس تنقید، نارنگ صاحب نے تنقید کے ان تمام شعبوں میں بنیادی اور ٹھوس کام کیا ہے جس سے اہلِ نقد ونظر تا دیر مستفید ہوتے رہیں گے۔

2

زیرِ نظر کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے جن میں کُل ملاکر پچیس مضامین شامل ہیں۔ پہلے حصّے میں سات مضامین ہیں جو اردو کے تاریخی تناظر کے ساتھ ساتھ اس کے حالیہ مسائل کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں نیز اردو اور ہندی کے لسانی رشتوں پر بھی بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے برِ صغیر میں اردو کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی اہمیت کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے، اردو سے متعلق نارنگ صاحب کے موقف کا بھی پتا چلتا ہے۔ نارنگ صاحب لسانیات داں ہونے کے علاوہ اردو کے شیدائی بھی ہیں۔ اردو زبان اور رسمِ خط سے انھیں سچا پیار ہے تاہم وہ اردو کے بارے میں حقیقت پسندانہ طرزِ استدلال سے کام لیتے ہیں۔ اپنے پہلے مضمون 'اردو ہماری زبان' میں وہ بجاطور پر اردو کو ''پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان محبت و یگانگت کی علامت تصور کرتے ہیں۔ اردو زبان کو وہ وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں جس کا رشتہ ہمارے ملک کی ایک ہزار سالہ تاریخ سے استوار ہے، جو ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، اور جو ہماری پہچان بھی ہے۔ وہ اپنی بات نہایت دلکش انداز اور منفرد اسلوب میں یوں کہتے ہیں:

> ''اردو کو محض اردو کہنا، اسے محض ایک زبان کہنا، اسے آٹھویں شیڈول کی درجہ بندی تک محدود رکھنا، اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں پوری ہندوستانی تہذیب، ایک ہزار برسوں کی تاریخ، باہمی میل ملاپ اور نئے ہندوستان اور اس کی تعمیر کے خوابوں اور امنگوں اور امیدوں اور ولولوں کی توہین

> ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اردو محض زبان نہیں، ایک طرزِ زندگی، ایک اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے اور وہ شکل دی ہے جسے آج ہم اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔'' ('اردو ہماری زبان')

دوسرا مضمون 'اردو کی ہندوستانی بنیاد' ہے جس میں اردو کی پیدائش، جائے پیدائش اور اس کے تاریخی ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِس مضمون کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہند آریائی لسانیات پر نارنگ صاحب کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ قدیم ہند آریائی عہد سے لے کر جدید ہند آریائی عہد تک کے ساڑھے تین ہزار سالہ لسانی تسلسل کو بخوبی سمجھتے ہیں اور ہند آریائی کے اِس تاریخی تناظر میں اردو کا کیا مقام ہے، اسے وہ بخوبی اجاگر کرتے ہیں۔ نارنگ صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے، اور تاریخی اور لسانی حقیقت بھی یہی ہے کہ ''اردو کا تعلق ہندوستان اور ہندوستان کی زبانوں سے بہت گہرا ہے۔ یہ زبان یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔ آریاؤں کی قدیم زبان سنسکرت ... اس کی جدِ امجد قرار پاتی ہے۔'' نارنگ صاحب نے اس لسانیاتی حقیقت کو بھی بخوبی واضح کردیا ہے کہ ابتدا میں ''اردو اور ہندی دو زبانیں تھیں ہی نہیں۔'' یہ تفریق بہت بعد میں شروع ہوئی جب ''اردو اور ہندی میں الگ الگ درسی کتابیں پڑھائی جانے لگیں''۔ نارنگ صاحب نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ ''ہندی منشیوں کو خاص اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ وہ اس زمانے کی ضرورت کے پیشِ نظر ہندی نثر کی کتابیں تیار کریں۔'' اردو اور ہندی کے رشتے کے بارے میں نارنگ صاحب کا یہ خیال ہے کہ یہ ''رشتہ سگی بہنوں کا ہے اور ان دونوں کی بنیاد ایک ہے لیکن اب یہ دو الگ الگ آزاد اور مستقل زبانیں ہیں''۔

تیسرا مضمون 'اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ' ہے۔ اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اردو کے وہ تمام محاورے اور کہاوتیں جو زبان زدِ خاص وعام ہیں اور جن کا استعمال بکثرت ہوتا ہے، نہ صرف یہ کہ سلیقے سے Classify کردی گئی ہیں، بلکہ غالباً پہلی بار نہایت شرح وبسط کے ساتھ ان کی سماجی توجیہ بھی بیان کی گئی

ہے۔ اور مختلف زاویوں مثلاً سماجی معنویت، مآخذ اور لسانیاتی اعتبار سے ان کی درجہ بندی بھی کی گئی ہے۔ محاوروں پر اگرچہ اس سے پہلے اردو میں کام ہو چکا ہے، لیکن جس سائنسی اور تجزیاتی انداز سے نارنگ صاحب نے اردو محاوروں اور کہاوتوں پر کام کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ محاوروں پر بنیادی کام کرنے والوں میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ غالب اور ذوق کے محاورے بھی جمع کر دیے گئے ہیں نیز سید احمد دہلوی نے 'مرقعِ زبان و بیانِ دہلی' میں اہلِ دہلی کے محاورے جمع کر دیے ہیں۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر نجم الدین دہلوی نے 'نجم الامثال' اور چرنجی لال دہلوی نے 'مخزن الامثال' کے نام سے کتابیں لکھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے زمانے میں مرزا جان طپش دہلوی نے 'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے اردو میں رائج بیشمار محاورے اور ضرب الامثال جمع کر دیے۔ عہدِ حاضر میں یونس اگاسکر نے صاف صاف اعتراف کیا کہ انھوں نے اپنا تھیسس 'اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو'، نارنگ صاحب کے علم افروز مضمون سے متاثر ہو کر لکھا۔ سیفی پریمی نے 'ہمارے محاورے' اور محی الدین حسن نے 'دِلّی کی بیگمانی زبان' جیسی کتابیں لکھ کر اس کام کو آگے بڑھایا۔ اِسی دور میں عورتوں سے متعلق محاوروں اور کہاوتوں کا مطالعہ وحیدہ نسیم نے اپنی کتاب 'نسوانی محاورے' میں پیش کیا۔ تاہم اردو کے تمام محاورے، ضرب الامثال اور روز مرہ کسی ایک کتاب یا لغت میں اب تک یکجا نہیں کیے گئے اور نہ ہی ان پر لسانی و تحقیقی نقطۂ نظر سے اب تک بھرپور کام ہوا ہے، اگرچہ بقولِ نارنگ صاحب ''محاورے کے اعتبار سے اردو نہایت دولت مند زبان ہے۔'' پنڈت کیفی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ''اردو میں محاوروں کا ذخیرہ شاید تمام زبانوں سے زیادہ ہے۔'' گوپی چند نارنگ کے مذکورۂ بالا فکر انگیز مضمون کو بنیاد بنا کر اردو محاوروں اور ضرب الامثال پر آئندہ وسیع پیمانے پر کام کیا جا سکتا ہے۔

چوتھا مضمون 'اردو کے افعالِ مرکبہ پر ایک نظر' ہے۔ یہ مضمون خالص لسانیاتی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں توضیحی (Descriptive) انداز اختیار کیا گیا ہے۔

نارنگ صاحب نے بڑی دقتِ نظر کے ساتھ اردو کے ایسے تمام افعال کو اپنے مطالعے اور تجزیے کا موضوع بنایا ہے جو دو کلموں سے مل کر بنتے ہیں۔ انھیں افعالِ مرکبہ (Compound Verbs) کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ 'فعل' کسی زبان کی گرامر کا سب سے زیادہ پیچیدہ عنصر ہوتا ہے۔ اسی لیے تحصیلِ زبان کے مرحلے میں، بالخصوص غیر مادری زبان کی تحصیل میں، اس کا سیکھنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ جب یہی فعل مرکب صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کی پیچیدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ افعالِ مرکبہ کی اردو میں بیحد متنوع صورتیں پائی جاتی ہیں جن کا لسانیاتی تجزیہ پہلی بار نارنگ صاحب نے سائنسی توضیحی انداز میں کیا ہے۔ مرکب افعال کو اردو قواعد کی تقریباً ہر کتاب میں بیان کیا گیا ہے لیکن اس کا انداز زیادہ تر روایتی ہوتا ہے یعنی یہ افعال زیادہ تر معنی (نئے اور اضافی معنی) کے حوالے سے بیان کیے جاتے ہیں۔ مرکب افعال جب جدید لسانیات کی رو سے بیان کیے جاتے ہیں تو معنی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کی ساخت (Structure) کو اہم تصور کیا جاتا ہے اور اسی کے حوالے سے ان کا مطالعہ وتجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس لسانیاتی اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نارنگ صاحب نے اردو کے افعالِ مرکبہ کی پانچ ساختیں متعین کی ہیں: (1) مادۂ فعل + فعل (بول چکنا، لکھ سکنا)، (2) حالِ مطلق + فعل (گاتے رہنا، لکھتے جانا)، (3) ماضیِ مطلق + فعل (آیا کرنا، کیا جانا)، (4) مصدر + فعل (آنا چاہنا، جانے دینا) اور (5) مضارع + فعل (کہے جانا، روئے جانا)۔ اردو کے افعالِ مرکبہ پر نارنگ صاحب کا یہ مضمون توضیحی لسانیات کی رو سے بیحد اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع پر اتنا جامع مضمون اب تک کہیں اور میری نظر سے نہیں گزرا۔

زیرِ نظر کتاب کے پہلے حصّے کے چوتھے اور پانچویں مضمون کا عنوان 'اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک' ہے۔ ان دونوں مضامین میں، جن کا عنوان ایک ہے، نارنگ صاحب نے اردو اور ہندی کی مشترک لسانی خصوصیات کو نہایت تفصیل کے ساتھ مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا موقف یہ ہے کہ ''جتنا گہرا رشتہ

اردو اور ہندی میں ہے شاید دنیا کی کسی دو زبانوں میں نہیں۔'' اس کی وجہ نارنگ صاحب یہ بتاتے ہیں:

> ''دونوں کی بنیاد اور ڈول اور کینڈا بالکل ایک ہیں، یہاں تک کہ کئی بار دونوں زبانوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہوئیں جس کے بعد دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا اور دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آ گئیں۔ اگر چہ ہندی اپنا فیضان سنسکرت سے اور اردو پراکرتوں کے علاوہ عربی اور فارسی سے حاصل کرتی ہے جس کی وجہ سے لفظیات میں خاصا فرق ہے، تاہم نسبتی اعتبار سے سگی بہنیں ہونے کی وجہ سے دونوں میں گہرا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔'' ('اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک 1')

اردو اور ہندی کی بہ طورِ زبان مشترک نشو و نما کی بات اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو جس کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے، ادبی اعتبار سے کھڑی بولی ہندی (زمانۂ حال کی ہندی) سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کا اعتراف ہندی مصنفین نے بھی کیا ہے۔ نارنگ صاحب بھی اس پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے وضاحت کی ہے کہ اردو اپنے ابتدائی اور تشکیلی دور میں 'ہندی'، 'ہندوی' اور 'ریختہ' کے ناموں سے منسوب ہوتی رہی۔ اس کا موجودہ نام 'اردو' بعد میں پڑا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کے اور بھی کئی نام پڑے جیسے کہ 'زبانِ دہلوی'، 'گجری'، 'دکنی'، وغیرہ۔ کھڑی بولی ہندی کی ادبی شکل (جسے اعلیٰ ہندی بھی کہتے ہیں) کا ارتقا بعد میں ہوتا ہے۔ شروع میں ہندی کا ادبی سرمایہ زیادہ تر بولیوں (اودھی، برج بھاشا، راجستھانی، وغیرہ) پر مشتمل تھا۔ 'ہندی' نام انیسویں صدی تک اردو کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ اودھی اور برج وغیرہ بولیوں کو اس زمانے میں بالعموم 'بھاشا' کہا جاتا تھا۔ نارنگ صاحب نے وضاحت کی ہے کہ 'ہندی' اور 'ہندوی' اردو کے قدیم نام ہیں۔ زمانۂ حال کی ہندی کا معیاری روپ جسے 'اعلیٰ ہندی' بھی کہتے ہیں کھڑی بولی پر قائم ہے اور اردو کی بنیاد بھی کھڑی بولی پر استوار ہے، اس لیے نارنگ صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ''جتنا اشتراک ان دونوں کی آوازوں اور

صرفی ونحوی ڈھانچے اور روز مرہ ومحاورے میں آج بھی پایا جاتا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دو زبانوں میں پایا جاتا ہو۔''

کتاب کے پہلے حصّے کا ساتواں اور آخری مضمون 'قصّہ اردو زبان کا' اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوسرے مضامین سے قدرے مختلف ہے کہ اس میں اردو کے لسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی ارتقا اور فروغ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح بول چال کی گری پڑی 'ریختہ' دھیرے دھیرے ادبی مقاصد کے لیے استعمال کی جانے لگی اور کس طرح یہ زبان ادبی لحاظ سے اس قدر متمول بن گئی کہ اس پر دوسری زبانیں 'رشک' کر سکیں۔ نارنگ صاحب نے اس قصّے کو ولی اور فضل علی فضلی کی 'کربل کتھا' سے شروع کیا ہے اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے ذکر کے بعد غالب پر ختم کیا ہے۔ وہ فضلی کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھتے ہیں کہ ''اگر اس کی نثر کا مقابلہ اس زمانے کی شاعری سے کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ شعر کی زبان تو کسی حد تک منجھ گئی تھی، لیکن نثر کی راہ سے کانٹے ابھی تک نہیں نکلے تھے۔'' فضلی نے کربل کتھا 33-1732 میں لکھی جو دراصل ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف 'روضۃ الشہداء' کا ترجمہ ہے۔ لیکن فضلی سے پہلے، بلکہ ولی سے بھی بہت پہلے شمالی ہندوستان میں محمد افضل افضل نے 'بکٹ کہانی' لکھی اور روشن علی نے 'عاشور نامہ' تصنیف کیا۔ 'بکٹ کہانی' کو اس کے مرتبین نے 'شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ' قرار دیا ہے۔ 'کربل کتھا' کے بعد شمالی ہند میں نثر کی ایک اور کتاب منظرِ عام پر آئی جو عیسوی خاں بہادر کی 'قصۂ مہر افروز ودلبر' ہے اور یہ شمالی ہند کی اردو کی پہلی طبع زاد نثری تصنیف ہے۔ اس کی زبان کافی حد تک صاف ستھری، سلیس اور رواں ہے۔ فارسی کے لسانی اثرات بھی اس میں نسبتاً کم ہیں اور یہ معیاری اردو سے کافی حد تک قریب نظر آتی ہے۔

3

اس کتاب کے دوسرے حصّے میں تین مضامین شامل ہیں جن میں سے پہلے دو

مضامین اردو رسمِ خط سے متعلق ہیں اور تیسرا مضمون اردو املا کے بارے میں ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی لسانیاتی دلچسپیوں میں اردو رسمِ خط اور املا خصوصیت سے شامل ہیں اور ان موضوعات ومسائل پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ مرکزی ترقیِ اردو بورڈ (اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان) کی مقرر کردہ املا کمیٹی کے برسوں تک ایک اہم رکن رہے اور اس حیثیت سے انھوں نے اردو املا کی معیار بندی کے مسئلے پر کافی دلسوزی سے غور کیا اور املا کے اصولوں کے تعین میں 'قدیم علم' اور 'رواجِ عام' کے علاوہ لسانیات اور جدید صوتیات سے بھی مدد لی۔ نارنگ صاحب نے املا کمیٹی کی سفارشات کو 'املا نامہ' (1974) کے نام سے شائع کیا جس کی اردو داں حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس کا نیا ایڈیشن بعد از نظرثانی و اضافہ 1990 میں شائع ہوا۔

1960 کے آس پاس اردو رسمِ خط کو تبدیل کرنے کی بات زوروں سے اٹھائی گئی تھی، اور اس میں وہ لوگ پیش پیش تھے جو اردو کے ادیب کی حیثیت سے اچھی طرح جانے جاتے تھے، مثلاً خواجہ احمد عباس۔ ان کا ایک مضمون ہندی کے رسالے 'دھرم یگ' میں چھپا تھا جس میں انھوں نے ''اردو والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا رسم الخط دیوناگری کرلیں۔'' گوپی چند نارنگ نے بھی اس بحث میں حصّہ لیا اور اردو رسمِ خط کا جم کر دفاع کیا۔ اس سلسلے کا ان کا ایک مضمون 'اردو رسم الخط۔ ایک تاریخی بحث' ہفت روزہ 'دوست' (دہلی) کے ستمبر 1961 کے شمارے میں شائع ہوا، یہ یادگار مضمون اِس کتاب میں بھی شامل ہے، جس میں انھوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ جو لوگ ''رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں شاید ان کی نظر سیاسی پہلو پر ہے، لسانی پہلو پر نہیں۔'' نارنگ صاحب نے اس سنجیدہ موضوع پر نہایت علمی اور سائنسی انداز سے قلم اٹھایا ہے اور ان بنیادی باتوں کی طرف اردو کے نادان دوستوں کی توجہ مبذول کرائی جن کو سمجھنے کے بعد اردو رسمِ خط کو تبدیل کرنے کا ان کا مشورہ بے معنی ہوجاتا ہے۔

نارنگ صاحب نے اس نظریے کو قطعی طور پر رد کردیا ہے کہ ہندی اور اردو ایک

زبان ہیں۔ اردو کے لیے دیوناگری رسمِ خط اختیار کرنے کا مشورہ بار بار صرف اسی لیے دیا جاتا ہے کہ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندی اور اردو دونوں ایک ہیں۔ نارنگ صاحب بجا طور پر اور برملا یہ کہتے ہیں کہ ''اردو اور ہندی ایک زبان نہیں۔'' اس لیے ان کا رسمِ خط بھی ایک نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''بنیاد کے اعتبار سے بیشک ہندی اور اردو دونوں زبانیں ایک ہیں لیکن اپنے ارتقا کے دوران بوجوہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں شور سینی پراکرت کی جانشین ہیں اور دہلی کے گرد و نواح کی کھڑی بولی پر قائم ہیں۔ اردو اور ہندی کو اب دو ملتی جلتی لیکن آزاد اور مستقل زبانیں سمجھنا چاہیے ... اپنے ارتقائی سفر میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط کا تجویز کرنا دونوں کے حق میں مُضر ہوگا۔'' ('اردو رسم الخط۔ ایک تاریخی بحث')

نارنگ صاحب اس عقیدے کے قائل ہیں کہ زبان اور رسمِ خط میں نہایت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ زبان گویا جسم ہے اور رسمِ خط اس کی کھال۔ جسم کو ایک کھال سے نکال کر کسی دوسری کھال میں ڈالنا ایک ناقابلِ عمل فعل ہے۔ اسی طرح رسمِ خط کی تبدیلی بھی ناقابلِ عمل ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو رسمِ خط بہت سے ایشیائی ملکوں مثلاً پاکستان، ایران، افغانستان، شام، عراق، سعودی عرب اور مصر وغیرہ سے ہمارے تہذیبی روابط قائم رکھنے اور انھیں مضبوط کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ دوسرے خطوں کی نسبت ایک تہائی جگہ کم لیتا ہے اور اس کے لکھنے میں وقت بھی نسبتاً کم صرف ہوتا ہے۔ نارنگ صاحب کے خیال میں ہندوستان کی لسانی رنگا رنگی کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ اردو کو اپنا رسمِ خط برقرار رکھنے کا موقع دیا جائے اور ہندوستان جیسے تکثیری ملک کے رنگا رنگ عناصر کو مٹایا نہ جائے۔ نارنگ صاحب دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں کہ ''رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ گویا عناصر کو مٹانے کی کوشش ہے اور اسی لیے ہم اس کی موافقت کرنے سے قاصر ہیں۔''

نارنگ صاحب نے اردو املا کی پیچیدگیوں پر بھی نہایت باریک بینی کے ساتھ

غور کیا ہے اور بہت سی املائی دقتوں کو لسانیات کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن روایت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ وہ املا کے مسائل پر پچھلے تیس پینتیس برسوں سے سنجیدگی سے غور کرتے رہے ہیں۔ 'املا نامہ' (1974) کی ترتیب کے دوران انھیں اس پر غور وخوض کا زیادہ موقع ملا۔ نارنگ صاحب نے جو مضمون 'اردو املا اور لسانیات: روایت اور اجتہاد کی روشنی میں' قلم بند کیا ہے، اور جو زیرِنظر کتاب میں بھی شامل ہے، اس میں ان کی اپنی سوچ ہے اور اس سوچ کا سرچشمہ علمِ لسانیات ہے جس میں نارنگ صاحب غیرمعمولی استعداد رکھتے ہیں۔ انھوں نے حروفِ تہجی، زائد حروف، اضافت، اعراب، ہجا اور املا کی متبادل شکلوں پر خالص لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے اور معیار بندی کی ایک ایسی راہ نکالی ہے جو سادہ، آسان اور قابلِ عمل ہے اور سب کے لیے قابلِ قبول بھی۔ نارنگ صاحب املا کی معیار بندی اور قاعدہ بندی کو وقت کی ضرورت مانتے ہیں۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ''روایت اور لسانیات کی آگہی کو ملانے سے نہایت سادہ اور صحیح اصول وضع کیے جاسکتے ہیں اور آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔''

4

کتاب کے تیسرے حصے میں تین مضامین ہیں، 'دتاتریہ کیفی کی لسانی خدمات'، 'احتشام حسین کی لسانی خدمات' اور 'فرمان فتح پوری اور اردو'۔ یہ تینوں مضامین اردو کی تین ممتاز شخصیتوں کی ادبی اور لسانی خدمات کے اعتراف میں لکھے گئے ہیں۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر شاعر تھے، لیکن نثر نگاری میں بھی انھوں نے کمال حاصل کیا تھا۔ انھوں نے کئی اچھے ناول اور ڈرامے لکھے۔ انشا کی 'دریائے لطافت' کا اردو میں ترجمہ کیا اور علمی و تحقیقی نوعیت کے بیشمار مضامین لکھے۔ ان تمام باتوں کے باوصف آج اردو دنیا انھیں جس حیثیت سے سب سے زیادہ جانتی ہے وہ ان کی لسانی خدمت ہے۔ نارنگ صاحب نے کیفی پر اپنے مذکورہ مضمون میں ان کی لسانی خدمات

و نظریات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیفی کی تصانیف بالخصوص 'منشورات' اور 'کیفیہ' کے حوالے سے ان کی لسانی تحقیق، ان کے نظریۂ زبان و نظریۂ آغازِ زبانِ اردو نیز تذکیر و تانیث، متروکات، تصرف و اختراع، تارید، غرابت، فصاحت، املا و انشا، وغیرہ کے مسائل پر ان کی آرا سے کھل کر بحث کی ہے اور ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف بھی کیا ہے۔ نارنگ صاحب نے مضمون کے آغاز میں ہی اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ کیفی ماہرِ لسانیات (Linguist) نہ تھے، یعنی انھوں نے لسانیاتِ جدید کی تربیت حاصل نہیں کی تھی بلکہ وہ ماہرِ علمِ زبان یا 'ماہرِ علمِ السنہ' (Philologist) تھے اور زبانوں کے مطالعے کے قدیم انداز سے ہی سروکار رکھتے تھے، جبکہ لسانیات (یا لسانیاتِ جدید) زبانوں کے توضیحی مطالعے سے سروکار رکھتی ہے اور اس کا انداز تجزیاتی اور سائنسی ہوتا ہے۔ نارنگ صاحب نے وضاحت کی ہے کہ ''زبان کے مباحث سے ان کی طبیعت کو گہری مناسبت تھی۔'' نارنگ صاحب نے سب سے پہلے ان کے نظریۂ زبان سے بحث کی ہے۔ کیفی کے نظریۂ زبان کے سلسلے میں یہ بات اہم ہے کہ وہ اردو کی آزادانہ حیثیت کے قائل تھے۔ وہ اسے عربی، فارسی یا سنسکرت اور پراکرت کے تابع نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو کے ''اصول و قواعد خود اس زبان کے استعمال اور چلن کی روشنی میں متعین ہونا چاہئیں۔'' اردو نے اپنے ارتقا کے دوران زبان میں جو تصرفات اور اختراعات کیے ہیں کیفی انھیں بہ نظرِ تحسین دیکھتے تھے، لیکن انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ متاخرین نے قدما کی اس روایت کو برقرار نہیں رکھا۔ کیفی اردو کو عربی اور فارسی کے مشکل اور ادق الفاظ و تراکیب کے استعمال سے بوجھل بنانے کے سخت خلاف تھے۔ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ اس کا شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ کیفی نے اردو متروکات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ متروکات کے قائل ضرور تھے یہاں تک کہ انھوں نے اضافت تک کو ترک کرنے کا مشورہ دے ڈالا تھا، لیکن بیجا متروکات کو وہ زبان کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ 'اصلاحِ زبان' کے نام پر دہلی اور لکھنؤ میں اندھا دھند طور پر جس طرح سے

اردو زبان سے الفاظ خارج کیے گئے، اس سے وہ خوش نہیں تھے۔ کیفی نے غرابت اور فصاحتِ زبان سے متعلق بھی بہت سی کام کی باتیں کہیں ہیں جن کا جائزہ نارنگ صاحب نے اپنے اس مضمون میں نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے بقولِ نارنگ ''اردو کو ایک آزاد اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے پیش کیا، لسانی تبدیلیوں کی طرف توجہ دلائی، تصرفات کو سراہا، عام اور سادہ زبان کے حسن کو واضح کیا اور اردو کے دائرے کو وسیع کرنے، نئے تقاضوں کو سمجھنے اور مستقبل کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنے پر زور دیا۔''

سید احتشام حسین کو آج اردو دنیا ایک ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن انھیں زبان اور مسائلِ زبان بالخصوص اردو ہندی کے لسانی اور تہذیبی مسائل سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے لسانیات کا بالا ستیعاب مطالعہ کیا تھا اور اس علم کی نظری بنیادوں اور اس کے سائنسی، معروضی اور منطقی طرزِ استدلال سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے زبان کے موضوع پر بالخصوص اردو کے حوالے سے بہت کچھ سوچا اور لکھا ہے۔ انھوں نے اردو کا لسانیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور اس کے رسمِ خط کے بارے میں اپنا موقف بھی بیان کیا ہے نیز زبان اور تہذیب کے درمیان رشتے پر بھی غور کیا ہے اور صحتِ زبان کے لسانیاتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ تاریخی لسانیات اور زبان کے عہد بہ عہد ارتقا کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'ہندوستانی لسانیات کا خاکہ' ہے جو جان بیمز کی تصنیف *An Outline of Indian Philology* کا ترجمہ ہے جس میں احتشام صاحب کا نہایت مفصل اور مبسوط 'مقدمہ' شامل ہے۔ یہ کتاب اردو میں اس مقدمے کی وجہ سے ہی مشہور ہوئی۔ نارنگ صاحب نے احتشام صاحب کے ان تمام لسانی افکار وخیالات کا بہترین تجزیہ اپنے مضمون 'احتشام حسین کی لسانی خدمات' میں پیش کیا ہے جس سے ان کی اس علمی جہت کا بھی قاری کو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ احتشام صاحب کی لسانی خدمات لائقِ ستائش ہیں، لیکن نارنگ صاحب نے برصغیر کے لسانی تناظر میں جس طرح ان کی خدمات کو اجاگر کیا ہے اور ان کی اہمیت کا

احساس دلایا ہے وہ بھی کچھ کم لائقِ ستائش نہیں!

گوپی چند نارنگ کی علمی ترجیحات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات کے بارے میں وقتاً فوقتاً اپنی رائے ظاہر کرتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ 'فرمان فتح پوری اور اردو' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فرمان فتح پوری عہدِ حاضر کے علمی وادبی منظر نامے کا ایک وقیع اور معتبر نام ہے۔ وہ اردو کے ایک معروف محقق، نقاد اور اعلیٰ پایے کے لغت نویس ہیں۔ تدوینِ متن سے بھی انھیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ علاوہ ازیں وہ حلقۂ نیاز و نگار (کراچی) کے روحِ رواں اور مجلۂ 'نگارِ پاکستان' کے مدیر بھی ہیں۔ ان تمام علمی فتوحات سے قطع نظر ان کی ایک حیثیت عالمِ زبان کی بھی ہے۔ انھوں نے زبان اور مسائلِ زبان پر اردو کے حوالے سے بڑی گہرائی سے غور کیا ہے۔ اردو رسمِ خط اور املا کے مسائل، نیز اردو قواعد اور تدریسِ زبانِ اردو بھی ان کی دلچسپی کے خاص میدان ہیں۔ نارنگ صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں فرمان صاحب کی انھیں اردو خدمات یا 'اردو شناسی' کا بڑی خوبی کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے۔ نارنگ صاحب نے فرمان فتح پوری کے اس موقف کو بھی سراہا ہے کہ ''اردو کا اپنا لسانی مزاج، اپنی پہچان، اپنا تشخص اور اپنی آزادانہ حیثیت ہے۔'' اردو زبان کے تعلق سے فرمان صاحب کے بہت سے مشاہدات سے نارنگ صاحب کو اتفاق ہے۔ فرمان صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کے معیار کا تعین کرتے وقت عربی فارسی اثرات اور ہندی پراکرتی اثرات کے درمیان امتزاج اور توازن کو برقرار رکھا ہے جو ضروری ہے اور جو خود نارنگ صاحب کی روش ہے۔

5

زیرِ مطالعہ کتاب کے چوتھے حصے میں پانچ مضامین اور پانچویں اور آخری حصے میں بھی پانچ مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے دو مضامین دو اردو کانفرنسوں سے متعلق ہیں جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بہ نفسِ نفیس شرکت کی تھی۔ ایک

مضمون میں 'کربل کتھا' کا لسانیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک اور مضمون دہلی کی کرخنداری بولی کے جائزے پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں ایک مضمون بہار کے اس تاریخی اقدام پر بھی ہے جب وہاں اردو کو ہندی کے بعد دوسری زبان کا درجہ حاصل ہوا تھا۔ بقیہ پانچ مضامین خالص لسانیاتی نوعیت کے ہیں۔

انجمن ترقیِ اردو کی کل ہند اردو کانفرنس جو مارچ 1979 میں پٹنہ میں منعقد ہوئی تھی اس میں نارنگ صاحب نے اردو کو درپیش مسائل ومشکلات سے مندوبین کو آگاہ کرایا تھا۔ انھوں نے بجاطور پر فرمایا تھا کہ ''اردو کو زیادہ مشکلات کا سامنا ان ہی علاقوں میں ہے جو ہندی کے بھی علاقے ہیں اور جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے''۔ یہ وہ دور تھا جب اردو کے مخالفین اردو کو ایک 'غیر ملکی زبان' بتاتے تھے۔ اسی زمانے میں اردو کے مخالفین نے یہ بھی شوشہ چھوڑا تھا کہ اردو والے اپنا رسمِ خط بدل دیں کیونکہ یہ غیر ملکی ہے۔ اردو کو ہندی کی 'شیلی' بھی کہا جانے لگا تھا۔ نارنگ صاحب نے ان تمام باتوں کا منہ توڑ جواب اپنے اس پٹنہ اردو کانفرنس والے مضمون میں دیا ہے اور بہ بانگِ دہل یہ کہا ہے کہ اردو کی سماجی اور تہذیبی جڑیں ہندوستان کی ہی سرزمین میں پیوست ہیں، اور یہ زبان یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی اور پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے یہ بات بھی صاف لفظوں میں کہہ دی ہے کہ رسمِ خط کی تبدیلی کا مشورہ ناقابلِ قبول ہے اور اردو ہندی کی شیلی نہیں، بلکہ اس کی ہمسر ہے۔ نارنگ صاحب نے یہ حقیقت بھی بڑے کرب کے ساتھ بیان کردی ہے کہ ''ہندوستان میں شاید ہی کسی زبان کی ایسی حق تلفی ہوئی ہو جیسی اردو زبان کی''۔ نارنگ صاحب نے آج سے ربع صدی قبل اردو کے جن مسائل کا ذکر کیا تھا وہ آج بھی حل طلب ہیں، مثلاً ''مادری زبان کی تعلیم، اسکولوں میں اردو پڑھنے کی سہولتوں، انتظامیہ اور عدلیہ میں اردو کے سرکاری چلن اور اس چلن کے قانونی تحفظات کا ہونا''، وغیرہ۔

18 تا 20 اپریل 1981 کے دوران لکھنؤ میں منعقدہ کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کی روداد کو نارنگ صاحب نے ایک دلچسپ مضمون کی شکل دے دی ہے

جس میں اس کانفرنس میں کہی گئی بہت سی باتیں ریکارڈ ہوگئی ہیں اور اس زمانے کی سربرآوردہ علمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کے خیالات بھی محفوظ ہوگئے ہیں جنھوں نے اس تاریخی کانفرنس میں کسی نہ کسی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ نارنگ صاحب نے اس کانفرنس کے کھلے اجلاس کا خطبۂ صدارت پیش کیا تھا جس میں کہا تھا کہ ''زبان کا مذہب نہیں ہوتا البتہ زبان کا سماج ہوتا ہے اور ہندوستانی سماج اردو کا سماج ہے ... اردو ہندوستانی زبان ہے''۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ''ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے، ہندی اور اردو میں اٹوٹ رشتہ ہے... اردو رسمِ خط کو بدیسی کہنا مناسب نہیں کیونکہ اردو نے اس کو اپنی ہند آریائی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا ہے''۔ یہ ایک تاریخی اور یادگار کانفرنس تھی جس میں دوسو سے زیادہ غیر مسلم ادیبوں اور مصنفوں نے شرکت کی تھی۔ اردو کے مسلمان ادیبوں، شاعروں اور اساتذہ کی بھی بہت بڑی تعداد اس کانفرنس میں شریک ہوئی تھی اور سب نے مل کر اردو کے 'سیکولر مشترک کردار' کی پرزور حمایت کی تھی۔ نارنگ صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں ان تمام باتوں کا ذکر بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

'کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ' پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ایک نہایت جامع اور پرمغز مضمون ہے جس میں انھوں نے شمالی ہند کی نثر کی پہلی کتاب 'کربل کتھا' (1732-33) کی زبان کا لسانیات کی صوتی، صرفی اور نحوی سطحوں پر بالتفصیل تجزیہ کیا ہے۔ جس زمانے میں 'کربل کتھا' معرضِ وجود میں آئی وہ اردو کا ایک لحاظ سے تشکیلی دور تھا اور یہ زبان ابھی ناپختہ، خام اور سیال حالت میں تھی۔ چنانچہ دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کے اثرات بڑی حد تک اس میں نفوذ کر گئے تھے۔ اس زبان میں ابھی نثر نہیں لکھی گئی تھی (شمالی ہندوستان کی حد تک)۔ چونکہ 'کربل کتھا' فارسی کتاب 'روضۃ الشہداء' (ملا حسین واعظ کاشفی) کا ترجمہ ہے اس لیے یہ عربی فارسی الفاظ وتراکیب سے کافی حد تک بوجھل ہے۔ چونکہ اس دور کی اردو معیار بندی سے کوسوں دور تھی اس لیے الفاظ کی تحریری شکلیں اور املا کے اصول ابھی بڑی حد تک متعین نہیں ہوئے

تھے۔ نارنگ صاحب کا یہ مضمون 'کربل کتھا' کا ایک نہایت معلومات افزا دلچسپ مطالعہ اور تجزیہ ہے جس میں انھوں نے بڑی دلسوزی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ اس کا انداز توضیحی ہے اور جن اصولوں کو انھوں نے برتا ہے وہ لسانیاتی اصول ہیں اور طریقِ کار (Methodology) بھی لسانیاتی ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے 'کربل کتھا' کی لسانی اہمیت اور قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی کا جائزہ بھی نارنگ صاحب کا ایک اہم لسانیاتی کارنامہ ہے۔ لسانیاتِ جدید کے فروغ کے بعد سے بولیوں کے توضیحی مطالعے کی جانب خاص دھیان دیا گیا ہے اور ماہرینِ لسانیات نے چھوٹی چھوٹی بولیوں کو بھی جو محدود علاقوں میں بولی جاتی ہیں اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ بعض بولیوں کا سماجی سیاق وسباق میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ دہلی کی کرخنداری بولی بھی ایسی ہی ایک سماجی بولی (Social Dialect) ہے جس کے مطالعے میں نارنگ صاحب نے سماجی لسانیاتی طریقِ کار (Sociolinguistic Methodology) کو اختیار کیا ہے۔ زبانوں اور بولیوں کے اس نوع کے مطالعے کی بنیاد دراصل اس نظریے پر قائم ہے کہ جہاں جہاں سماجی سطح پر فرق پایا جاتا ہے، لسانیاتی سطح پر بھی فرق کا پایا جانا لازمی ہے۔ یعنی سماجی سطح پر تباین (Social Variation) سے ہی لسانی تباین (Linguistic Variation) پیدا ہوتا ہے۔ نارنگ صاحب نے اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی کے اس مطالعے میں اسی لسانی تباین کا پتا لگانے کی کوشش کی اور بہت کام یاب رہے ہیں۔ ان کے اس مطالعے سے زبان کی عوامی اور تہذیبی جڑوں کا بھی پتا چلتا ہے اور زبان اور اس کے بولنے والوں کے درمیان جو گہرا رشتہ پایا جاتا ہے، اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کرخنداری بولی پر نارنگ صاحب کی یہ کتاب انگریزی میں شائع ہوئی تھی۔

6

کتاب کے آخر کے پانچ مضامین خالص لسانیاتی نوعیت کے ہیں اور ان میں بہت سے باتیں تکنیکی ہیں۔ ایک مضمون میں نارنگ صاحب نے اردو زبان کے

مطالعے میں لسانیات کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور نوام چامسکی کی تشکیلی گرامر کے نظریے سے بحث کی ہے۔ اردو والوں کے لیے یہ نظریہ نیا ہے کیونکہ اردو گرامر اب بھی اپنی اسی پرانی روش پر چل رہی ہے جسے 'روایتی گرامر' کہتے ہیں اور مولوی عبدالحق کی 'اردو قواعد' جس کی عمدہ مثال ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ کچھ لوگ جو زبان جانتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں 'لسانیات' بھی آتی ہے۔ دراصل زبان کا جاننا (Knowing language) اور بات ہے اور زبان کے بارے میں جاننا (Knowing about language) اور بات۔ اگر کوئی شخص زبان جانتا ہے یعنی اس زبان کو سمجھنے، بولنے پڑھنے اور لکھنے پر اسے قدرت حاصل ہے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ شخص اس زبان کے بارے میں بھی جانتا ہو۔ زبان کے بارے میں جاننا ہی لسانیات ہے۔ نارنگ صاحب نے بجا طور پر یہ بات کہی ہے کہ ''بالعموم لوگ اس بات سے واقف نہیں کہ اردو میں مصوتوں کی تعداد دس ہے۔ بہ ظاہر اردو میں مصوتوں کے لیے صرف تین علامتیں ہیں''۔ زبان کے بارے میں اس طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جن سے بالعموم لوگ واقف نہیں ہوتے۔ لسانیات ہمیں وہ علم و آگہی بخشتی ہے جس کا استعمال ہم نہ صرف زبان کے مطالعے میں کرسکتے ہیں بلکہ ہر اس جگہ اسے بروئے کار لاسکتے ہیں جہاں جہاں زبان کا عمل دخل ہے۔ نارنگ صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں اسی نکتے کی وضاحت کی ہے۔ اگر صرف زبان کے تعلیمی کام کو ہی پیشِ نظر رکھیں تو بقولِ نارنگ ''لسانیات زبان کے پڑھنے اور پڑھانے والے کو ایک نئی نظر اور نیا ذہن دیتی ہے''۔

'ہمزہ کیوں؟' نارنگ صاحب کا ایک یادگار مضمون ہے جو بہت بحث خیز ثابت ہوا۔ ہمزہ سے متعلق نارنگ صاحب کی رائے بالکل واضح ہے کہ اردو میں ہمزہ حرف نہیں بلکہ علامت ہے جو صوتی مسلسل وقوع (Vowel Sequence) کی تحریری نمائندگی کے لیے استعمال کی جاتی ہے، مثلاً بھائی، سوئی، جاؤ، آئے، غائب، فائدہ، وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ نارنگ صاحب نے ہمزہ کو اردو سے خارج نہیں کیا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ وہ اسے اردو کے حروفِ تہجی میں شمار نہیں کرتے کیونکہ

یہ علامت محض ہے اور الگ سے اس کی اپنی کوئی آواز نہیں۔ لسانیاتی اور تعقلی نیز منطقی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہی نقطۂ نظر صحیح ہے۔ نارنگ صاحب نے اپنے اس موقف کو لسانیاتی اور سائنسی استدلال کے ساتھ اپنے مضمون 'ہمزہ کیوں؟' میں نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

نارنگ صاحب نے ایک اور صوتیاتی مسئلے پر بھی نہایت مدلل اور Convincing انداز میں بحث کی ہے اور وہ مسئلہ اردو میں ن اور ڹ یعنی دندانی (یا دنتی) نون اور غشائی نون کا ہے۔ اردو کے زیادہ تر علمائے لسانیات ان دونوں نونوں کو الگ الگ صوتیہ (Phoneme) مانتے ہیں جس سے نارنگ صاحب کو شدید اختلاف ہے۔ سنسکرت صوتیات میں پانچ قسم کے نون بیان کیے گئے ہیں۔ سنسکرت کے تتبع میں جدید ہندی میں بھی یہی پانچ نون تسلیم کر لیے گئے ہیں، یعنی (1) دندانی (یا دنتی) نون، (2) لثوی نون، (3) معکوسی نون، (4) تالوئی نون اور (5) غشائی نون۔ نارنگ صاحب نے اردو کے صوتی مزاج کو ذہن میں رکھتے ہوئے نون کی ان تمام شکلوں کا نہایت گہرائی اور لسانیاتی بصیرت کے ساتھ تجزیہ کیا اور اس تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو کے صوتی نظام میں صرف ایک نون پایا جاتا ہے جس کی حیثیت مکمل صوتیے (Phoneme) کی ہے، اور وہ دندانی نون ہے۔ اور نون کی بقیہ تمام شکلیں اسی دندانی نون کی ذیلی شکلیں (Allophones) ہیں، گویا غشائی نون کا اردو میں کوئی آزادانہ وجود نہیں۔ لسانیاتی اور صوتیاتی اعتبار سے نارنگ صاحب کی یہ بات صدفی صد درست ہے۔

کتاب کے آخری دو مضامین میں اردو آوازوں اور مصوتوں کی نئی درجہ بندی امتیازی خصوصیات کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اردو صوتیوں (Phonemes) کی اس نوع کی درجہ بندی پہلی بار عمل میں آئی ہے۔ امتیازی خصوصیات (Distinctive Features) کا یہ صوتیاتی نظریہ دبستانِ پراگ کے ایک ممتاز ماہرِ لسانیات رومن یاکوبسن کا ہے۔ اس نظریے کی رو سے ہر آواز یا صوتیہ (مصمتہ اور مصوتہ) چند صوتیاتی خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جنھیں 'امتیازی خصوصیات' کہتے ہیں۔ انھیں

خصوصیات کی بنیاد پر ایک آواز دوسری آواز سے ممیّز قرار دی جاتی ہے، کیونکہ اس نظریے کی رو سے ہر امتیازی خصوصیت بنیادی ممیّز اکائی ہوتی ہے، نارنگ صاحب نے رومن یاکوبسن کے اس نظریے کو بنیاد بنا کر اردو آوازوں کی امتیازی خصوصیات کا پتا لگایا ہے۔ نارنگ صاحب کے بہت سے دیگر لسانیاتی مضامین کی طرح یہ اوریجنل ریسرچ ہے۔ امتیازی خصوصیات کے نظریے کی روشنی میں اردو مصمتوں اور مصوتوں کا اس نوع کا صوتیاتی تجزیہ اس سے پہلے نہیں کیا گیا۔ نارنگ صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس صوتیاتی نظریے کو اردو میں متعارف کرایا اور اس کے اصولوں اور مبادیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کی تمام مصمتی اور مصوتی آوازوں کا اس نظریے کی روشنی میں صوتیاتی تجزیہ کیا اور ان کی نئی درجہ بندی پیش کی جو جوئے شیر لانے سے کم نہیں کیونکہ آگے چل کر اس پر کمپیوٹر سائنسی زبان کی اساس رکھی گئی۔ ان دونوں مقالات کی جن میں یہ تجزیے پیش کیے گئے ہیں جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ نارنگ صاحب کا یہ کام دراصل اس تحقیقی کام کا حصّہ ہے جو انھوں نے اردو صوتیات سے متعلق امریکہ کی وسکانسن یونیورسٹی اور انڈیانا یونیورسٹی میں مکمل کیا تھا۔ اس سے ان کی لسانیات وصوتیات سے گہری دلچسپی اور تحقیقی لگن کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

7

اس کتاب میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ پروفیسر نارنگ اردو زبان کے حوالے سے وقتاً فوقتاً انگریزی میں جو مضامین لکھتے رہے ہیں، ان میں سے دو خاص مضامین کا انتخاب زیرِنظر کتاب کے لیے کیا گیا ہے۔ ان دونوں مضامین کا انگریزی متن جوں کا توں اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں Path-Breaking Articles ہیں اور مختلف یونیورسٹیوں کے ایم اے اور ایم فل کے لسانیات کے کورسوں میں آج تک بطور حوالہ پڑھائے جاتے ہیں، اس لیے ان کا اصل انگریزی متن پیش کرنا ضروری تھا۔ یوں بھی اصطلاحوں اور Diacritics

کی دقت کی وجہ سے ان کا ترجمہ ناممکنات میں سے ہے۔ یہ مضامین Generative Phonology کے حوالے سے جدید لسانیات کی اعلیٰ سطحی تکنیکی زبان میں لکھے گئے ہیں اور لسانیات کے انتہائی باوقار رسالے 'Language' نیویارک اور 'General Linguistics' پن سلوانیا یونیورسٹی، فلاڈلفیا اور لندن سے ستر کی دہائی میں اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ عالمی شہرت کے ان رسالوں میں اشاعت سند کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کام گوپی چند نارنگ نے وسکانسن یونیورسٹی میں قیام کے دوران شعبۂ جرمن کے اپنے رفیق پروفیسر ڈاکٹر ڈونلڈ بیکر کے ساتھ مل کر کیا تھا جو ہندی اردو پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر بیکر نے پروفیسر نارنگ کی تحریک پر اردو زبان کی Reverse Dictionary بھی تیار کی تھی جو پروفیسر نارنگ کے پیش لفظ کے ساتھ مشہور پبلشر Manohar سے شائع ہوئی تھی۔ ان دونوں بنیادی نوعیت کے مضامین کا اطلاق اردو کے علاوہ دوسری ہندستانی زبانوں اور ہندی پر بھی ہوتا ہے اور انگریزی میں لسانیات کی تعلیم حاصل کرنے والوں کو چونکہ ان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور ان کو نمونے کے کام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس لیے ان کے متون کو جوں کا توں پیش کرنا اہمیت رکھتا ہے۔ ان سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ پروفیسر نارنگ جس طرح لسانیات کے دوسرے شعبوں میں درجۂ امتیاز رکھتے ہیں، سائنسی لسانیات میں بھی ان کا کام اعلیٰ ترین سطح کا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا شمار اگرچہ علمائے ادب میں ہوتا ہے اور وہ اردو کے منفرد و ممتاز اور بلند پایہ نقاد اور نظریہ ساز ہیں لیکن اردو زبان اور لسانیات سے بھی ان کی دلچسپی کچھ کم نہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نارنگ صاحب بنیادی طور پر ایک ماہرِ لسانیات ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کی ابتدائی تصانیف بھی لسانیاتی موضوعات پر ہی ہیں۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی میں ادب کی تعلیم کے ساتھ لسانیات کی تربیت بھی حاصل کی پھر وہ وسکانسن یونیورسٹی چلے گئے جہاں رہ کر انھوں نے لسانیات پر عبور حاصل کیا۔ وہیں انھوں نے اردو صوتیات پر اپنے خاص تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ اسی

دوران میں اپنے مطالعے کے سلسلے میں وہ انڈیانا یونیورسٹی بھی گئے ۔ لسانیات کی انھیں مضبوط بنیادوں کے ساتھ وہ وطن واپس آئے اور لسانیاتی موضوعات پر بیشمار مضامین لکھے اور توضیحی لسانیات، تاریخی لسانیات، سماجی لسانیات اور اطلاقی لسانیات کے شعبوں میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔

پچیس منتخب لسانیاتی مضامین پر مشتمل پروفیسر گوپی چند نارنگ کی یہ عالمانہ تصنیف اردو کے لسانیاتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کتابِ حوالہ کا نہ صرف اردو زبان اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے اربابِ علم خیرمقدم کریں گے بلکہ عام اردو داں حلقے میں بھی اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ان یادگار مضامین کے مجتمع ہونے سے اب ان سے استفادہ آسان ہوجائے گا۔

مرزا خلیل احمد بیگ

صدر شعبۂ لسانیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

28 فروری 2006

اردو ہماری اردو

اپنی زبان کس کو پیاری نہیں لگتی۔ اس بارے میں طرف داری برحق، لیکن سخن فہمی' بھی ضروری ہے۔ اردو کی زلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔ اردو کے حسن و خوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔ اس کے لطف و اثر اور شیرینی اور دل نشینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا۔ کون نہیں جانتا کہ اردو ہندوستان کی بلکہ اس برصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اخذ و قبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے، اور جس کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا ہے، اور جس کی جادو اثری میں 'شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی' تینوں کا ہاتھ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہند آریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔ کون نہیں جانتا جب نئی تاریخی حقیقتیں ابھرتی ہیں تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔ اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے، لسانی، سماجی اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے سابقے اور اختلاط و ارتباط سے وجود میں آئی۔ اُس وقت اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ کوئی بھی سچائی جب جنم لیتی ہے، اُس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام تو اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہوجاتی ہیں۔ پراکرتوں کی دھرتی سے جب نیا اکھوا پھوٹا اور اس میں عربی، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا تو اس کا کوئی بھی نام نہیں تھا، ہند یعنی ہندوستان کی ہر چیز 'ہندی' تھی، فارسی یائے نسبتی کے ساتھ، اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔ امیر خسرو نے اسے ہندوی بھی کہا اور دہلوی بھی۔ اسی زمانے میں جب راگ رنگ کی محفلوں میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے، تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔ دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجری کہلائی، پھر کسی نے اردو کہا، کسی نے ہندی، کسی نے کھڑی، بنیاد وہی ایک، راہیں الگ الگ ہوگئیں۔ نام سے کیا ہوتا ہے، لیکن

یہاں نام ہی سے فاصلے بڑھے اور دوریاں ہوتی گئیں۔ اس امر کے تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ ایسی کمائی جس سے کوئی انصاف پسند نظریں نہیں چرا سکتا۔ تاریخ کے سیل میں جب تہذیبیں بہہ جاتی ہیں اور نسلیں پگھل جاتی ہیں، جب چہرے کے نقوش، لباس، پہناوا، رہن سہن، طور طریقے نئی شادابیوں سے ہم کنار ہوتے ہیں، جب گل و بلبل کا رشتہ نئی رنگینیوں کی خبر دیتا ہے، جب کوئل کوکتی اور آم کے پیڑوں پر بور آتا ہے، جب دلوں کے دروازے وا ہوتے ہیں، فصل کے فاصلے ڈھل جاتے ہیں، اور وصل کے در کھلتے ہیں، ایسے میں زبان قوموں اور نسلوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے، اور محبت و یگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ تاریخ کے ایسے لمحوں میں جب تہذیب کی ہوا میں شراب کی تاثیر اور لطافت اور رس پیدا ہو جاتا ہے، تو مختلف فرقوں، گروہوں اور طبقوں میں ربط پیدا کرنے، ترسیل کے عمل کو تیز کرنے، محبت کے دو بول سنانے اور قلب و روح کو سرشار کرنے کے لیے کوئی اردو زبان پیدا ہوتی ہے۔ اردو کو محض اردو کہنا، اُسے محض ایک زبان کہنا، اُسے آٹھویں شیڈول کی درجہ بندی تک محدود رکھنا، اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں، پوری ہندستانی تہذیب، ایک ہزار برسوں کی تاریخ، باہمی میل ملاپ اور نئے ہندوستان اور اس کی تعمیر کے خوابوں اور امنگوں اور امیدوں اور ولولوں کی توہین بھی ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اردو محض زبان نہیں، ایک طرزِ زندگی، ایک اسلوبِ زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے اور وہ شکل دی ہے جسے ہم آج اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔

درباروں سے اردو کا رشتہ بڑا معنی خیز ہے۔ اردو نے درباروں سے نہیں، بلکہ خود درباروں نے اردو سے رشتہ پیدا کیا۔ اردو اصلاً بازاروں، گلیوں، کوچوں، میلوں ٹھیلوں، جوگیوں، سنتوں، فقیروں اور صوفیوں کی زبان ہے۔ ان ہی فقیروں، سنتوں اور صوفیوں نے اسے قریہ قریہ اور شہر شہر پھیلایا اور سورج کی کرنوں کی طرح یہ جہاں

جہاں پہنچی، آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب کرتی گئی۔ اس کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی، وسیع النظری اور محبت و یگانگت کا وہ تصور رہا جس سے قومیں عروج پاتی ہیں اور تاریخ میں ان کے کارناموں کے نقش جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جس کی ملتی جلتی شکلوں میں بھگتوں، سنتوں اور صوفیوں نے توحید کے ترانے گائے۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہوں یا حضرت بابا فریدالدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا ہوں یا خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، راما نند ہوں یا تکارام، کبیر ہوں یا نانک، سینکڑوں صوفیوں، سنتوں اور اولیاء اللہ نے اس زبان کے سر پر شفقت اور دعاؤں کا ہاتھ رکھا اور مذہبوں کی ظاہرداری سے ہٹ کر باطنیت کے جوہر کو دیکھا، اور روحانیت اور سچی انسانیت کے پیغام سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں کو آباد کیا۔ حضرت نظام الدین اولیا سے منسوب وہ روایت کس نے نہیں سُنی کہ ایک دن جمنا کے کنارے وہ چھت پر موجود تھے، نیچے کچھ ہندو اپنے طریقے سے پوجا پاٹھ کر رہے تھے۔ معاً یہ مصرع زبان سے نکلا:

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے

انسانیت اور رواداری کا یہ وہ درس ہے جس سے اردو کا میخانہ ہمیشہ آباد رہا ہے۔ صدیوں کے اس تاریخی عمل میں جب کوئی محمد قلی قطب شاہ کہتا ہے:

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ و مے خانہ کوں
دیکھیا ہوں ہر کہاں دِستا ہے تجھ مکھ کا صفا

یا جب کوئی میر کہتا ہے:

دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی
یہ کیا ضرور تھا جب دل سا مکاں بنایا

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مہتم بالشان سچائی گنبدِ افلاک کا سینہ چیرتی ہوئی ابھر رہی ہے۔ اردو کے ایوانِ شعر میں اس حقیقت کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے:

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا
(ولی)

کسی ہندو مسلماں نے خدا کو
نہ کعبے میں نہ بت خانے میں دیکھا

کعبہ و دیر میں حاتم بخدا غیرِ خدا
کوئی کافر نہ کوئی ہم نے مسلماں دیکھا
(شاہ حاتم)

بہکے گا تو سن کے سخنِ شیخ و برہمن
رہتا ہے کوئی دیر میں اور کوئی حرم میں
(سودا)

اسرار سے کعبے کے خبر شیخ جو رکھتا
بت خانے سے ہرگز اُسے انکار نہ ہوتا
(سوز)

شیخ کعبے ہو کے پہونچا ہم کنشتِ دل میں ہو
درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا
(خواجہ میر درد)

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انساں ہووے
(آتش)

دل بہ دل آئینہ ہے دیر و حرم
حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف
(دیا شنکر نسیم)

کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند
بشر ہیں سارے بندے حق کے سارے جھگڑے شر کے ہیں
(ذوق)

ہم موّحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں
(غالب)

مشربِ صلحِ کل ہے اے زاہد
دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے
(امیر مینائی)

اردو کی انسان دوستی کے پیچھے صدیوں کا جو فشار ہے، اُسے آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان کے ملے جلے سماج کی شیرازہ بندی میں جس زبان کی یہ مہتم بالشان روایت رہی ہو، جس نے انسان دوستی، محبت اور یگانگت کے رشتوں کو اس طور پر مضبوط کیا ہو، اسے کسی ایک مذہب یا فرقے سے وابستہ کرنا، یا اس پر بدیسی ہونے کا الزام لگانا، یا غیر سمجھنا کہاں کا انصاف ہے۔ یہ جمہوریت کے بھی منافی ہے اور ہندستانیت کے بھی۔

ہندستانی زبانوں میں اردو ہندی سے سب زیادہ قریب ہے ہندی اور اردو میں اٹوٹ رشتہ ہے

اس بات کو بھی اچھی طرح خاطر نشان کرنے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کی تمام ہند آریائی زبانوں میں اردو زبان ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے اور ان دونوں میں اٹوٹ رشتہ ہے۔ اسے صدیوں کے سامراج کی سازش کہیے یا حالات کی ستم ظریفی، یا برصغیر کی سیاست کا دباؤ، کہ وہ دو زبانیں جن میں سگی بہنوں کا رشتہ ہے، ان ہی دونوں میں افتراق اور عدم اعتماد کی فضا پیدا کردی گئی؛ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سب صدق دل سے ہندی کا احترام کرتے ہیں۔ ہندی ہماری قومی زبان ہے، ہم ہندی کی ترقی چاہتے ہیں کیونکہ اردو کو مادری اور تہذیبی سطح پر اگر حق حاصل ہوجائے تو ہندی کی ترقی ہماری ترقی، اور ہندی کا فروغ اصلاً ہمارا فروغ ہے۔ ایک عام اندازے کے مطابق اردو کے ستر (70) فیصدی الفاظ پراکرتوں کے ذریعے سے آئے ہیں یعنی ہندی ہیں۔ جتنا اشتراک اردو اور ہندی کی لفظیات (Lexicon)، صرفیات (Morphology) اور نحویات (Syntax) میں پایا جاتا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دو زبانوں میں پایا جاتا ہو۔ اردو کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف چھ ایسی ہیں جو فارسی و عربی سے لی گئی ہیں باقی سب کی سب ہندی اور اردو میں مشترک ہیں خاص طور سے ہکار (Aspirated) آوازیں، پھ بھ، تھ دھ، چھ، جھ، کھ گھ اپنے سادہ

روپ کے ساتھ پورے سٹ کی حیثیت سے ہندی اور اردو دونوں میں موجود ہیں۔ اسی طرح معکوسی (Retroflex) آوازیں یعنی ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ، ڑھ بھی ہندی اور اردو میں مشترک ہیں۔ یہ چودہ آوازیں اردو کا رشتہ پراکرتوں سے جوڑتی ہیں اور یہ نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ گویا گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اردو اور ہندی کے مصمتوں (Consonants) کا ڈھانچہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ مصوتوں (Vowels) میں تو اشتراک اس سے بھی زیادہ ہے یعنی صوتی ہم آہنگی سو فیصدی ہے۔ تفصیل کی گنجائش نہیں، مختصر یہ کہ جو دس بنیادی مصوتے اردو کے ہیں وہی ہندی کے ہیں، اور ان میں ذرّہ برابر فرق نہیں۔

صرف و نحو کا یہ عالم ہے کہ کوئی جملہ بولیے ہندی میں یا اردو میں، لفظوں کا فرق ہوسکتا ہے لیکن جملے میں لفظوں کی ترتیب بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ تذکیر و تانیث یا روزمرے یا محاورے کا فرق کہیں کہیں جھلک دکھاتا ہے لیکن اتنا فرق تو اردو کے مختلف روپوں میں بھی مل جاتا ہے۔ جملے میں فعل کی بڑی اہمیت ہے۔ اردو فعل کا ہمارا سارا سرمایہ ہندی سے جڑا ہوا ہے، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، لینا دینا، آنا جانا، رہنا سہنا، سونا جاگنا، سیکڑوں ہزاروں فعل جیسے ہندی میں ہیں، ویسے ہی اردو میں۔ اردو نے بہت سے فعل عربی و فارسی سے لیے اور انھیں بھی ہندی وضع پر ڈھال لیا۔ مثلاً فرمانا، آزمانا، خریدنا، شرمانا، گزرنا، نرمانا، گرمانا، لرزنا، خرچنا، رنگنا، نوازنا، بخشنا۔ یہ سب ہندی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

محاوروں کا معاملہ بھی اتنا ہی دلچسپ ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ صرف آنکھ، ناک، کان، منہ یا ہاتھ سے بننے والے محاوروں ہی کو دیکھ لیجیے۔ آنکھ سے بننے والے محاوروں اور ترکیبوں میں سے چند یہ ہیں :

آنکھ آنا، آنکھ اٹھانا، آنکھ لڑنا، آنکھ بچانا، آنکھ بدلنا، آنکھ بنوانا، آنکھ پتھرانا، آنکھ پھڑکنا، آنکھ پھوٹنا، آنکھ پھوڑنا، آنکھ پھیرنا، آنکھ جھکنا، آنکھ چرانا، آنکھ ہلنا، آنکھ لجانا، آنکھ لگنا، آنکھ مارنا، آنکھ ملانا، آنکھ نکالنا، آنکھیں بچھانا، آنکھیں بھر آنا، آنکھیں ٹھنڈی ہونا، آنکھیں روشن ہونا، آنکھیں موند لینا، آنکھوں میں دھول ڈالنا، آنکھوں میں رات

کاٹنا، آنکھوں میں سمانا، آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں پھرنا، آنکھوں میں بچھنا، آنکھوں میں چڑھنا، آنکھوں سے لگا لینا، آنکھوں کا پانی ڈھلنا، آنکھوں کے آگے اندھیرا آنا، آنکھوں پر قدم لینا، آنکھوں میں لہو اترنا، آنکھوں سے اوجھل ہونا، آنکھوں سے گر جانا، آنکھیں نیلی پیلی کرنا، آنکھیں کھل جانا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا، آنکھیں چار ہونا، آنکھیں دکھانا، آنکھیں مٹکانا، آنکھوں پر بٹھانا، آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا، آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، آنکھ اونچی نہ ہونا، آنکھ بند کرکے کچھ دینا، آنکھ بھر کر نہ دیکھنا، آنکھ پر پردہ پڑنا، آنکھیں ٹھنڈی کرنا، آنکھ سے آنکھ ملانا، آنکھ سے لہو ٹپکنا، آنکھ کا پانی ڈھلنا، آنکھ کا کاجل چرانا، آنکھ کی پتلی کا پھرنا، آنکھ میلی نہ کرنا، آنکھ نہ جمنا، آنکھ نیچی کرنا، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا، آنکھ مچولی، آنکھوں آنکھوں میں، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، آنکھوں کے ناخن تو لو۔ یہ صرف ایک جھلک ہے، مکمل فہرست اس سے کئی گنا بڑی ہوگی۔ اس طرح کے محاورے، کہاوتیں اور ترکیبیں ہندی اور اردو دونوں کا مشترک سرمایہ ہیں۔

اردو نے فارسی، عربی الفاظ کو ہندی لفظوں کے ساتھ ملا کر سیکڑوں نئے مرکب بنائے۔ اب یہ ہندی اردو دونوں زبانوں میں یکساں رائج ہیں۔ کون ہے جو ڈاک خانہ، عجائب گھر، چٹھی رساں، گلاب جامن، جگت استاد، شرمیلا، رنگیلا، سبزی منڈی، گھڑسوار، دل لگی، گھر داماد، گھڑی ساز، تھانیدار یا لنگوٹیا یار کا استعمال نہیں کرتا۔ یا بے گھر، بے سمجھ، بے کل، بے بس، بے چین، بے ڈول، سدابہار، دیوانہ پن، چوہے دان، کٹوردان، یا سنگھاردان سے واقف نہیں۔ یا کون ہے جس نے ''امام باڑے'' نہیں دیکھے یا ''نوچندی'' کے میلے کا ذکر نہیں سُنا، یا دل لگی باز، اکڑباز، دھوکہ باز، بٹیرباز، پتنگ باز، چوسر بازی، اور پھکڑ بازی سے واقف نہیں۔ ہندستانی سماج سے بھڑک دار کپڑے، بل دار دوپٹے، بیل دار پلنگ پوش اور توڑے دار یا ٹوپی دار بندوقیں ابھی غائب نہیں ہوئیں فارسی، عربی اور ہندی کے یہ ملے جلے لفظ، یا گنگا جمنی لفظ کتنی بڑی تعداد میں ہیں، اور اردو اور ہندی دونوں میں آج بھی کثرت

سے استعمال ہوتے ہیں۔ دھاری دار، جالی دار اور پھول دار چادریں آج بھی بچھائی جاتی ہیں، اور چوڑی دار پاجامے آج بھی پہنے جاتے ہیں۔ موتی مسجد اور موتی محل آج بھی موجود ہیں۔ اور عید ملاپ تو ہونا ہی چاہیے۔ اگر اردو اور ہندی کی کوئی بنیادی لفظیات (Basic Lexicon) تیار کی جائے، تو وہ بڑی حد تک ایک ہوگی۔

کہاوتوں اور تلمیحوں میں دونوں زبانوں کا اشتراک اور زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے، اگر چہ اردو میں اسلامی روایات کا گہرا اثر ہے، اور ہندی میں مقامی روایات کا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندی اور اردو میں سیکڑوں کہاوتیں ایک ہی طرح کی استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال، لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا، گھر کی مرغی دال برابر، ملا کی دوڑ مسجد تک، دو ملاؤں میں مرغی حرام، یہ منہ اور مسور کی دال، منہ میں رام رام بغل میں چھری، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، چور کی داڑھی میں تنکا، میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی، نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی، یہ ان سیکڑوں ہزاروں میں سے چند ہیں جو اردو اور ہندی کے مشترک سرمائے کا کثرت سے استعمال ہونے والا حصہ ہیں۔ یہ اگر سچ ہے تو پھر اردو اور ہندی کی خلیج کیسی اور اردو کی حق تلفی کیوں؟

اردو نے عربی فارسی عناصر کی تہنید کی ہے اور انھیں ہندستانی مزاج کی خراد پر اتارا ہے

اس غلط فہمی کو اب دور ہونا چاہیے کہ اردو، عربی فارسی کا ظلِ ثانی ہے یا اس کی اپنی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اردو ہند آریائی زبان ہے اور ہندی سے اس کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو اردو کسی بھی دوسری زبان کا نقشِ ثانی کیسے ہوسکتی ہے۔ اردو لفظیات کا بہ مشکل ایک تہائی حصہ فارسی، عربی، ترکی سے مستعار ہے لیکن ان لفظوں کو بھی اردو نے کس طرح اپنی خراد پر اتارا، اور کس طرح انھیں اپنایا، اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ

تہنید اور تارید کا یہ عمل صرف آوازوں کے ساتھ ہی نہیں ہوا ہے، لفظوں اور ترکیبوں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال دی جائے گی۔ اردو میں ذ، ز، ض، ظ، چار الگ الگ حرف ہیں لیکن آواز ایک رہ گئی ہے۔ عربی میں ان چار حروف کی چار مختلف آوازیں ہیں۔ اردو میں یہ سب آوازیں ایک ہوگئیں۔ ایسا کئی دوسرے حروف کے ساتھ بھی ہوا ہے جن کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے، یہ سب اردو وانے کے ہندستانی عمل کا کرشمہ ہے۔ ایسا گرامر میں بھی ہوا ہے، مثلاً ہم امیر، وزیر، فقیر کی جمع امیروں، وزیروں اور فقیروں یعنی ہندی طریقہ سے بناتے ہیں، اور ان کی مستعار جمع امرا، وزرا، فقرا بھی استعمال میں لاتے ہیں، لیکن ہر عربی فارسی لفظ پر اس قاعدے کا اطلاق نہیں ہوتا، مثلاً صندوق عربی لفظ ہے لیکن اس کی عربی جمع صنادیق ہم استعمال نہیں کرتے اور ہمیشہ ہندی جمع صندوقوں ہی لکھتے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح شمس عربی میں مونث ہے، اُسے اردو میں ہندی سورج کی وضع پر مذکر بولا جاتا ہے۔ ہندیانے کے عمل کا اثر گرامر کے علاوہ معنی کی تبدیلیوں پر بھی پڑا ہے۔ مثلاً امیر کے اصل معنی حاکم یا سردار کے تھے اور غریب کے اجنبی کے، ہم ان لفظوں کو روپیے پیسے والے اور بغیر پیسے والے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ خفا کے معنی گلا گھونٹنا ہے، ہم ناراض ہونا کے لیے بولتے ہیں۔ تیغ ہمارے یہاں تلوار ہے، اور ایران میں اُسترے کے معنی میں رہ گیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے ایک پرلطف مثال ''ظریف ومتین'' کی پیش کی ہے: ''ظریف'' ہم اس شخص کو کہتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق ہو، ''متین'' ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں، لیکن ایک ترکی اخبار میں سید سلیمان ندوی نے ایک جوتا بیچنے والے کا اشتہار دیکھا جو کہتا تھا کہ اس کے جوتے ''ظریف ومتین'' ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ جوتے مذاق بھی کریں گے، اور متانت سے بھی پیش آئیں گے۔ نہیں، وہ تو یہ اعلان کررہا تھا کہ اس کے جوتے ''ظریف'' بمعنی آرام دہ بھی ہیں اور ''متین'' یعنی مضبوط بھی۔ آپ نے دیکھا اردو میں ان لفظوں کے معنی کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ اردو نے دیسی اور بدیسی

عناصر میں جیسا اعتدال پیدا کیا ہے اس کی نظیر دوسری زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتی۔ صرف روزمرہ ہی کو لیجیے۔ آتش آگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن ''چولھے میں آتش جلا دو'' اردو میں کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اردو روزمرہ کی رو سے یہ غلطِ محض ہے۔ اردو میں ہمیشہ ''چولھے میں آگ جلادو'' کہا جائے گا۔ اگر دیسی یعنی ہندی لفظ کا محل ہے تو ہندی لفظ ہی استعمال ہوگا، عربی فارسی لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ اردو کی خوش امتزاجی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ مثلاً

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

میں لفظ آگ استعمال ہوا ہے، اور

دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

میں لفظِ آتش۔ ایک کی جگہ پر دوسرے کا استعمال، قطع نظر بحر کی ضرورتوں کے ممکن ہی نہیں۔ اردو اس معاملے میں مستعار اور ہندی لفظوں سے برابر کا سلوک کرتی ہے اور جہاں جس کا محل ہوتا ہے اُسے استعمال کرتی ہے۔ اردو کی یہ خوش مذاقی لسانی انصاف و اعتدال پر مبنی ہے، اور یہ معمولی بات نہیں۔

اردو رسم خط بدیسی نہیں۔ اردو نے اس کو اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا ہے

اب مختصراً ایک نظر اردو رسم خط پر بھی ڈال لی جائے، کیونکہ بہت سی غلط فہمیاں رسمِ خط کی وجہ سے پھیلائی جاتی ہیں۔ اردو رسمِ خط میں سینتیس (37) حروف ہیں، چودہ ہکار اور معکوسی آوازوں کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ان کی وجہ سے اردو رسمِ خط میں جو کایا پلٹ ہوئی ہے، وہ معمولی نہیں۔ یعنی اردو رسمِ خط میں ایک تہائی سے بھی زیادہ حروف کا اضافہ اردو کی ہندآریائی ضرورتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اردو بولتے لکھتے ہوئے ان آوازوں سے ہم بچ نہیں سکتے، لب و لہجہ، لفظوں کے بل اور سُر لہروں کا اضافہ ان سے الگ ہے۔ غرض اس رسمِ خط کی، جو ہم نے صدیوں پہلے

اردو کے لیے لیا تھا، اردوانے کے عمل کے دوران اتنی کایا پلٹ ہوچکی ہے کہ نہ صرف اس کی اصل آوازوں میں سے بہت سی ہم نے بدل دی ہیں، بلکہ اس میں ایسی ایسی آوازوں اور علامتوں کا اضافہ بھی ہوچکا ہے جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کا ایک صفحہ تو کیا، ایک پیراگراف بھی ان آوازوں کے بغیر لکھا نہیں جاسکتا۔ مثال کے طور پر کسی اردو اخبار یا کتاب کا ایک صفحہ بھی اگر کسی ایرانی یا عرب کے سامنے رکھا جائے تو وہ اسے صحیح نہیں پڑھ سکے گا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس رسم خط کو ہم نے عربی، فارسی سے لیا ہے اور مشرقِ وسطیٰ سے ہمارے ثقافتی رشتوں میں اس رسمِ خط سے مدد ملتی ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہ رسمِ خط اردوائے جانے کے دوران تنسیخ و توسیع کے زبردست نامیاتی عمل سے گزر چکا ہے اور خاصی حد تک بدل چکا ہے۔ چنانچہ اب اس کو بدیسی کہنا اور اس کی بنا پر ہندی اور اردو کی خلیج کو وسیع کرنا کہاں کی انصاف پسندی اور دانشمندی ہے۔ یہ رسمِ خط اب اردو کا رسمِ خط ہے، اور جس طرح دوسری ہندوستانی زبانوں کے اپنے اپنے رسمِ خط ہیں، اور وہ ہمارے رسمِ خط ہیں، اردو رسمِ خط بھی ہمارا اپنا رسمِ خط ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے

ہماری طرف داری صرف حق طلبی تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ اردو ایک زندہ زبان ہے اور زندہ زبانوں کا شیوہ ہے کہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں اردو کو یکسر نئے چیلنج کا سامنا ہے۔ اردو کی ضرورتیں، اس کی الجھنیں، اور اس کے مسائل دوسری ہندستانی زبانوں سے بڑی حد تک الگ ہیں۔ ان پر ٹھنڈے دل سے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کا شمار ہندوستان کی علاقائی (Regional) زبانوں میں ہوتا ہے لیکن اردو اس معنی میں علاقائی زبان ہرگز نہیں، جیسے دوسری ہندستانی زبانیں علاقائی زبانیں ہیں، یعنی جیسے بنگال کی زبان بنگالی، گجرات کی گجراتی، یا پنجاب کی پنجابی ہے۔ اردو

ایک ہندوستان گیر زبان ہے، اس کا زیادہ تر چلن وہاں وہاں ہے جہاں ہندی کا بھی چلن ہے، کہیں کم کہیں زیادہ۔ پھر یہ کہ اردو شمالی ہندوستان میں بھی ہے، اور جنوبی ہندوستان میں بھی، کہیں یہ کشمیری کی رفاقت کا دم بھرتی ہے، کہیں مرہٹی اور گجراتی کے ساتھ مل کر چلتی ہے، کہیں تیلگو، ملیالم، کنڑ اور تامل کی انگلی پکڑتی ہے، اور کہیں پنجابی، بنگالی، اڑیہ اور آسامی کے ساتھ ہے۔ ہندوستان کا لسانی نقشہ نہایت پیچیدہ اور گھنا ہے، اس میں زبانیں زبانوں سے اور بولیاں بولیوں سے پیوست نظر آتی ہیں۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی خطہ، یا ہندستانی سماج کا شاید ہی کوئی حصہ ہو جو یک لسانی (Monolingual) ہو، ہندوستان کے اکثر حصے، جہاں جہاں اردو کا چلن ہے، دولسانی یا سہ لسانی (Bilingual / Trilingual) ہیں اور پورا ملک دنیا کے گنجان ترین کثیر لسانی خطوں (Multilingual Areas) میں سے ہے۔ یہ کثیر اللسانیت (Multilingualism) ہندوستان میں زبانوں کے باہمی تعلقات کے لیے، بالخصوص اردو جیسی غیر طبقاتی، غیر مذہبی اور غیر علاقائی، ہمہ گیر زبان کے لیے نئے نئے چیلنج پیدا کرتی ہے۔ ان تقاضوں اور مسائل کی طرف اردو والوں نے ابھی پوری توجہ نہیں کی۔ زبانوں کی ضرورتیں وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان میں جہاں صحت و اصول اور معیار بندی پر اصرار کرنا ضروری ہوتا ہے، وہاں لفظ و معنی کی نئی تخلیقی سطحوں کی دریافت کرنا، اور زبان کے چلن کی نئی عمرانیاتی ضرورتوں پر نظر رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ اقبال کا یہ شعر:

گیسوئے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اس تناظر میں نئی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلاتا ہے۔ یاد رہے کہ اردو مادری زبان کے حقوق ہمیں ان خطوں میں حاصل ہو بھی جائیں، جہاں اردو کا چلن ہے، تو بھی لامحالہ ہم اپنے بچوں کو قومی زبان ہندی سے اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے محروم رکھنا نہیں چاہیں گے۔ حقوق ملنے سے زبان کو ایک سماجی اور قومی وقار ملتا ہے، وہ اپنے گھر میں بے گھر نہیں سمجھی جاتی، وہ بے چہرہ، برباد اور بے نشان ہونے سے بچ

جاتی ہے۔ اپنے چہرے کی شناخت ہوجائے تو پھر دوسرے چہروں کی شناخت کا عمل آسان ہوجاتا ہے۔ عزت سے عزت اور اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ کوئی محبت دوسری محبت کو فنا نہیں کرتی بلکہ اس کو بڑھاتی ہے۔ اردو کو حق ملے گا تو ہندی کا احترام بڑھے گا۔ سیکولرزم میں یقین، مشترک تہذیب سے وابستگی اور جمہوریت میں اعتماد بحال ہوگا۔ اتر پردیش میں برسوں سے اس نیک کام میں دیر ہورہی ہے۔ بہار نے تاریخی اقدام کرکے پہل کی ہے۔ لیکن اتر پردیش اور بعض دوسرے صوبوں میں مسائل باقی ہیں۔ یہ سیکولرازم کا بھی امتحان ہے اور جمہوریت کا بھی۔

(لکھنؤ کانفرنس، 1981)

اردو کی ہندستانی بنیاد

اردو کا تعلق ہندوستان اور ہندوستان کی زبانوں سے بہت گہرا ہے۔ یہ زبان یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔ آریاؤں کی قدیم زبان سنسکرت یا اِنڈک چار پشتوں سے اس کی جد امجد قرار پاتی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں زبانوں کے کئی خاندان ہیں لیکن ان میں سے دو خاندان خاص ہیں، ایک دراوڑی دوسرا ہندآریائی۔ ہندآریائی خاندان کی زبانیں پورے شمالی ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں، جنوب میں گجرات اور مہاراشٹر تک انھیں کا چلن ہے۔ مسیح کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تو جو عوامی بولیاں وہ بولتے تھے، ان کے مجموعے کو انڈک کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چاروں وید انھیں عوامی بولیوں میں تخلیق کیے گئے تھے۔ بعد میں پائینی اور پاتنجلی کے زمانے تک انھیں بولیوں کے منزہ اور شستہ روپ کو ''سنسکرت'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔ بودھوں اور جینیوں کے دور میں یہی بولیاں اپنے ارتقا کی دوسری منزل میں داخل ہوگئیں اور ''پراکرتیں'' یعنی فطری بولیاں کہلائیں، اور آگے چل کر پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ ان کی بگڑی ہوئی شکلیں جو اپ بھرنش کہلاتی تھیں، استعمال میں آنے لگیں۔ یہ ہندآریائی کے ارتقا کی تیسری منزل تھی۔ بعض پراکرتیں شروع سے رائج تھیں۔ اپ بھرنشوں میں سب سے زیادہ اثر والی مرکزی اپ بھرنش شورسینی کہلاتی تھی۔ یہ اپ بھرنش پنجاب کے مشرقی حصوں سے لے کر اودھ کے مغربی حصوں تک رائج تھی اور اس کی کئی بولیاں تھیں۔ دسویں صدی عیسوی کے لگ بھگ یہ اور دوسری ہندآریائی بولیاں اپنے ارتقا کی چوتھی منزل میں داخل ہوئیں جسے جدید ہندآریائی زبانوں کا دور کہا جاتا ہے۔ یہی زمانہ مسلمانوں کے ہندوستان آنے کا بھی ہے، جب سیاسی نقشے کے ساتھ

ساتھ ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی نقشے میں بھی تیزی سے تبدیلیاں ہونے لگیں۔ ہندی، اردو اور پنجابی اسی شورسینی اَپ بھرنش کی جانشین ہیں۔ گریرسن کی تقسیم کے مطابق ہندی کی دو شاخیں ہیں: مشرقی ہندی اور مغربی ہندی۔ مشرقی ہندی میں اودھی، بھوج پوری، چھتیس گڑھی، مگھی، میتھلی وغیرہ بولیاں شامل ہیں اور مغربی ہندی میں کھڑی، برج، ہریانی وغیرہ۔ جدید معیاری اردو اور جدید معیاری ہندی دونوں کا تعلق اسی مغربی ہندی سے ہے۔ اس لحاظ سے اردو اور ہندی کا رشتہ سگی بہنوں کا ہے اور ان دونوں کی بنیاد ایک ہے۔

اردو کے ارتقا کی کہانی ہندی کے ارتقا کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہ داستان خاصی دلچسپ ہے کہ ان دونوں کا ارتقا مغربی ہندی کی بولیوں کے ساتھ مل کر کیسے ہوا۔ اردو کی ساخت، ڈول اور کینڈے کا تعین دسویں، گیارھویں صدی سے سترھویں اٹھارھویں صدی تک ہوتا رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور نئی تاریخی اور تہذیبی ضرورتوں کے تحت جو زبان پیدا ہو رہی تھی وہ کئی ناموں سے پکاری جاتی تھی، کبھی وہ ہندوی کہلاتی تھی، کبھی گجری، کبھی ریختہ، کبھی اردو، کبھی ہندی اور کبھی دکنی۔ شاہجہاں کے زمانے کے بعد قلعہ معلیٰ کی رعایت سے اسے اردوئے معلیٰ بھی کہا جانے لگا۔ عام زبان 'ہندستانی' کے نام سے جانی جاتی تھی۔ بازاروں میں جہاں لین دین ہوتا تھا اور جہاں تجارت کی مجبوریوں سے ایک ملی جلی زبان بولنی پڑتی تھی وہاں تو اس نوزائیدہ زبان کا استعمال ہوتا ہی تھا اس کے علاوہ یہ سنتوں اور صوفیوں کی زبان بھی بن گئی تھی۔ عوام کے دلوں تک پہنچنے کے لیے نہ تو سنسکرت کا استعمال کیا جاسکتا تھا، نہ فارسی کا بلکہ کسی ایسی زبان کی ضرورت تھی جو عام فہم ہو اور جو سب کی سمجھ میں آسکے۔ اور یہ منصب اسی گری پڑی، ملی جلی ریختہ زبان کو نصیب ہوا۔ ہندی والے اس کی ابتدا برج کے آغاز سے کرتے ہیں اور اردو والے پنجابی اور کھڑی سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد وسطیٰ میں ہندو تہذیبی روایتوں کا لسانی وسیلۂ اظہار برج تھی، اور ہندو اور مسلمانوں کے پہلے ہمہ گیر تہذیبی اور لسانی سابقے کی سرزمین پنجاب تھی۔ برج تو شورسینی کی سچی جانشین تھی ہی اور اس کا ارتقا

تو ہونا ہی تھا، لیکن عین ممکن ہے کہ وہ بولی جو آگے چل کر کھڑی کہلائی، بڑی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے لسانی اور تہذیبی اشتراک سے اپنی نشوونما میں براہ راست طور پر متاثر ہوئی ہو۔ وہ یوں کہ پرانی ہندوی بولی کے نمونوں کا ذکر بارھویں اور تیرھویں صدی سے ملنے لگتا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ نوزائیدہ زبان ایک طرف تو پرانی پنجابی سے مختلف ہوگی، دوسری طرف برج سے۔ افسوس کہ مسعود سعد سلمان کا جو محمود غزنوی کے زمانے میں لاہور کے شاعر تھے، ہندوی کلام دستیاب نہیں۔ محمد عوفی نے اپنے تذکرۂ لباب الالباب میں تصدیق کی ہے کہ مسعود نے ہندوی میں شعر کہے تھے۔ اگر اس زبان کی ابتدا گیارھویں اور بارھویں صدی میں غزنویوں کے زمانے میں تسلیم نہ بھی کی جائے تو بھی اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ امیر خسرو کے زمانے تک یہ زبان ایک خاص حد تک ترقی کر چکی تھی۔ امیر خسرو نے اپنے تیسرے فارسی دیوان میں ہندوی میں شعر کہنے کا فخریہ اعتراف کیا ہے۔ لطف کی بات ہے کہ امیر خسرو کو اردو اور ہندی والے دونوں اپنا پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ امیر خسرو کا انتقال 1324 میں ہوا۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس سے تقریباً ایک صدی پہلے خلجیوں کی فوجوں نے دکن پر حملہ کیا تھا، اور اٹھہتر برس پہلے جب محمد تغلق نے پایۂ تخت دیوگیر، دولت آباد منتقل کیا تو یہی زبان وہاں جا کر گجری اور دکنی کے نام سے موسوم ہوئی اور نہایت تیزی سے ادبی زبان کا درجہ حاصل کر گئی۔ شمالی ہندوستان میں ابھی فارسی کا اثر تھا، اس لیے شمال کے مقابلے میں دکن میں اس پر توجہ زیادہ تھی مگر شمال میں بھی عوامی تحریکوں اور صوفیوں اور سنتوں نے اس کی مقبولیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اگرچہ کرشن بھگتی تحریک اور اکبر کے آگرہ کو راجدھانی بنانے سے برج کا ستارہ پھر سے چمک اٹھا لیکن شاہ جہاں نے جب دہلی کو دوبارہ بسایا تو کھڑی اس وقت تک اپنے آپ کو پہچان چکی تھی اور دہلی کی سیاسی اور تہذیبی مرکزیت کی وجہ سے اس کا اثر نئی ریختہ زبان پر غالب آنے لگا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو، اردوئے معلیٰ کے منصب پر فائز ہوگئی، اور اورنگ زیب کے بعد سے تو اس میں جیسے شعر و شاعری کی شاہراہ کھل گئی، اور زبردست ادبی سرگرمی شروع ہوگئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی ادب ابھی برج، اودھی اور راجستھانی بولیوں کا رہین منت تھا۔ یہ سب بولیاں بھی ہندی کہلاتی تھیں، اور اردو کو بھی ہندی کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ دراصل اس وقت تک اردو اور ہندی دو زبانیں تھیں ہی نہیں ورنہ فضل علی فضلی اپنی کربل کتھا کی زبان کو ''نثر ہندی'' کیوں کہتے یا محمد حسین خاں عطا تحسین نوطرز مرصع کے سبب تالیف میں ''عبارت رنگین زبان ہندی'' لکھنے پر فخر محسوس کیوں کرتے یا غالب اپنی اردو نثر کے لیے لفظ ''ہندی'' استعمال کیوں کرتے۔ فورٹ ولیم کالج میں اردو اور ہندی میں الگ الگ درسی کتابیں لکھوائی گئیں۔ یہاں چند ہندی منشیوں کو خاص اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ وہ اس زمانے کی ضرورت کے پیش نظر ہندی نثر کی کتابیں تیار کریں۔ اس کے بعد کے برطانوی تسلط، سامراجی حکمت عملی، سیاسی دباؤ اور باہمی شک و شبہ نے ایک پیڑ کی دو شاخوں کو الگ الگ کر کے رکھ دیا اور ایک بڑے تنے سے دو درخت الگ الگ بنتے چلے گئے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندی اور اردو کے الگ الگ ادبی زبان بن جانے سے ان دونوں کا لسانی رشتہ ختم ہوگیا۔ دونوں کی ادبی روایتیں، ادبی معیار، ادبی موضوعات اور ادبی تاریخ کتنی ہی الگ الگ کیوں نہ سہی، دونوں کا لسانی ڈھانچہ اب بھی ایک ہے۔ اول تو دونوں کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف پانچ چھ کو چھوڑ کر باقی سب کی سب ایک ہیں۔ ہندآریائی زبانوں کی سب سے بڑی پہچان ہکار آوازوں بھ، پھ، تھ، دھ، چھ جھ، کھ گھ کا پورا سیٹ ہے جو اردو میں پورا کا پورا موجود ہے۔ اس کے علاوہ معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، ڑ اور ٹھ، ڈھ، ڑھ بھی اردو میں جوں کی توں موجود ہیں۔ یہ آوازیں نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ صرف و نحو کا معاملہ یہ ہے کہ اسمائے صفت تو اردو نے بڑی تعداد میں عربی فارسی سے لیے، لیکن اردو فعل کا سرمایہ سارا کا سارا دیسی ہے۔ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، آنا، جانا سینکڑوں ہزاروں فعل جو زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں کلیتہً ہندآریائی ہیں۔ یہی معاملہ مرکب افعال مثلاً آجانا، گر پڑنا، مار ڈالنا، ٹوٹ جانا، سن لینا، دے دینا وغیرہ جیسے ہندی میں ہیں ویسے اردو میں۔ یہی حال فعل سے بننے والے محاوروں کا ہے مثلاً

آنکھیں بچھانا، آنکھیں بھر آنا، آنکھیں ٹھنڈی ہونا، آنکھیں روشن ہونا وغیرہ یا پھر محاورے ہیں جو دونوں زبانوں کے مختلف سرمایے کا بیش قیمت حصہ ہیں مثلاً جیسا دیس ویسا بھیس، گھر کی مرغی دال برابر، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، بچہ بغل میں ڈھنڈھورا شہر میں، مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اور تو اور ہندی اور اردو کی بنیادی لفظیات ایک ہے۔ مصدر ایک ہیں۔ امدادی افعال ایک ہیں۔ حروف جار میں، سے، پر، تک، کا، کے، کی، کو، سب ایک ہیں۔ اسی طرح ضمیریں ایک ہیں۔ سوالیہ مادے ایک ہیں۔ بنیادی اور توصیفی اعداد ایک ہیں۔ گنتی ایک ہے۔ جسم کے اعضا کے نام ایک ہیں اور تو اور رشتہ داریاں ایک ہیں اور گالیاں ایک ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اردو ہندوستان کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں سے ہے۔ اگر ایک طرف اس کا دامن سامی اور ایرانی زبانوں سے بندھا ہوا ہے تو دوسری طرف اس کی بنیاد آریائی ہے۔ اس کا رسم الخط ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے بیسیوں ملکوں میں قدرے اختلاف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اردو کے تقریباً ساٹھ ہزار الفاظ میں سے دو تہائی الفاظ یعنی چالیس ہزار الفاظ سنسکرت اور پراکرتوں کے ماخذ سے آئے ہیں۔ جس زبان کی جڑیں اپنے ملک کے لسانی ذخیرے اور اس کی تہذیبی سرزمین میں اتنی گہری ہوں، جس کا دامن اتنا وسیع ہو، جس کے لہجے میں ایک خاص کشش اور کھنک ہو، جس کے انداز میں ایک خاص شستگی اور شائستگی ہو، جس کی قومی خدمات ایسی وقیع ہوں اور جس کا ادبی سرمایہ بشمول میر، نظیر، غالب، انیس، اقبال، فراق، فیض اتنا شاندار ہو، وہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس زبان پر ہندوستان کا ایسا حق ہے جو کبھی ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ اور اردو کا بھی ہندوستان پر ایسا حق ہے جو ضرور وصول ہونا چاہیے۔

(1980)

اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ

زبان کا مذہب نہیں ہوتا۔ زبان جملوں کا مجموعہ ہے اور جملے لفظوں سے مل کر بنتے ہیں۔ مذہب لفظوں کا بھی نہیں ہوتا، لیکن لفظ چونکہ مذہب، اخلاق، فلسفہ، معاشرت، سیاست وغیرہ سے متاثر ہوتے ہیں، اس لیے لفظوں کے مذہبی یا طبقاتی مآخذ تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ہر زبان میں ایسے لفظوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد ملے گی جو کسی خاص مذہب یا طبقے، یا گروہ سے متعلق ہیں۔ لیکن ایسے تمام الفاظ استعمالِ عام کے نقطۂ نظر سے فروعی یا جزوی (Marginal) قرار پائیں گے۔ ان کے برعکس زبان کا عام ذخیرۂ الفاظ (Core) غیرمذہبی اور غیرطبقاتی ہوتا ہے۔ مثلاً ہاتھ، پاؤں، ناک، کان، ماں، باپ، بھائی، بہن، کھانا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا، آنا، جانا، ہے، تھا، گا، نے، سے، پر، تک وغیرہ کا تعلق کسی مذہب، طبقے یا گروہ سے نہیں ہے۔ یہ زبان کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ (Core) سے متعلق ہیں، جبکہ عیسیٰ، موسیٰ، خضر، سکندر، طوبیٰ، سدرہ، اندر، اگنی، ورن، جو کسی نہ کسی مذہب یا گروہ سے منسوب ہیں، جزوی استعمال کے الفاظ قرار پائیں گے۔

محاوروں اور کہاوتوں کا معاملہ لفظوں سے قدرے مختلف ہے۔ اگرچہ محاوروں میں بھی زیادہ استعمال ہونے والے اور کم استعمال ہونے والے محاورے ملیں گے اور بنیادی اور جزوی کی تفریق کی جاسکتی ہے؛ لیکن یہ محض چلن کی بنا پر ہوگی، مذہبی یا طبقاتی استعمال کی بنا پر نہیں۔ محاورے اور کہاوتیں الفاظ شماری میں چاہے کتنی پیچھے کیوں نہ رہیں، لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے عام استعمال کی چیز ہیں۔ اور جب یہ ایک بار زبان میں شامل ہوجاتی ہیں، تو اس کے بعد بلاتفریق مذہب و ملت یہ سب بولنے والوں کی مشترکہ دولت بن جاتی ہیں۔

اگر چہ ہمارے علما نے مرکب افعال کو محاوروں میں شامل نہیں کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دو آزاد فعلیہ اجزا سے مل کر بننے والے مرکب افعال دراصل ایک طرح کے محاورے ہیں، جو کثرتِ استعمال سے خاص معنی دینے لگتے ہیں۔ مثلاً چل پڑنا، آجانا، بیٹھ جانا، سن لینا، سمجھ جانا، مان جانا، کھا چکنا، لکھ سکنا، کہے جانا، چلے آنا، کھا جانا، گر پڑنا، مار ڈالنا، پڑھ لینا، کر ڈالنا، پڑھ سکنا، رکھ دینا، آنکلنا، لے اڑنا، آپڑنا، لے دینا، لے چلنا، لے بھاگنا وغیرہ۔ گرنا اور پڑنا دو مختلف فعل جب گر پڑنا میں مرکب ہوکر استعمال ہوتے ہیں، تو ان کے لغوی معنی میں توسیع ہوجاتی ہے؛ اب مرکب فعل سے الگ مفہوم برآمد ہوتا ہے۔ یہی محاورے کی شان ہے۔

یہی حال اُن مرکب افعال کا ہے جو اسم کے بعد فعل لگانے سے بنتے ہیں۔ ان میں بھی محاورے کی شان ملتی ہے کیونکہ دوسرے جز کے ساتھ مل کر پہلے جز کے معنی میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے اور اس سے نیا مفہوم برآمد ہوتا ہے۔ آنکھ سے مل کر بننے والے محاورے فرہنگ آصفیہ میں 45 صفحوں پر آئے ہیں۔ اسی طرح ناک، ہاتھ، پاؤں، آگ وغیرہ اسما سے مل کر بننے والے محاوروں کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ صرف دل سے مل کر بننے والے محاورے کئی سو ہوں گے۔ یہاں طوالت کے خوف سے محض ضروری مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے: دل پسیجنا (رحم آنا)، دل پھٹنا (بیزار ہونا)، دل پھرنا (متنفر ہونا)، دل پھیرنا (بیزار کرنا)، دل تڑپنا (بیتاب رہنا)، دل توڑنا (سخت رنجیدہ کرنا)، دل ٹھکنا (اطمینان ہونا)، دل جلانا (ناراض کرنا)، دل جمنا (جی لگنا)، دل چرانا (کسی کام کے کرنے میں کوتاہی برتنا)، دل چلنا (رغبت ہونا)، دل دُکھانا (رنج دینا)، دل دھڑکنا (افسوس یا تشویش ہونا)، دل دہلانا (خوف دلانا)، دل دیکھنا (امتحان لینا)، دل دینا (عاشق ہونا)، دل ڈوبنا (ضعف کے مارے غشی طاری ہونا)، دل رُکنا (آزردہ ہونا)، دل رکھنا (بات مان لینا)، دل سنبھلنا (ٹھیک ہونا)، دل کرنا (بہادری کرنا)، دل کڑھنا (افسوس ہونا)، دل کمھلانا (مغموم ہونا)، دل لگنا (دل آنا)، دل کھلنا (حجاب دور ہونا)، دل کھلنا (شگفتہ ہونا)، دل لینا (مائل کرنا)، دل لوٹنا (دل لوٹتا ہے سینہ کے اندر تمام رات)، دل مارنا

(نفسانی خواہشوں کو روکنا)، دل مِلنا (دل کا موافق ہونا)، دل مَلنا

جب سے عشق کیا ہے ہم نے، دل کو کوئی مَلتا ہے
اشک کی سرخی، زردیِ چہرہ، کیا کیا رنگ بدلتا ہے
(میر)

دل اٹکانا (عشق کرنا)، دل اٹھانا (اٹھانا دل کو دنیا سے عجب کارِنمایاں ہے — سودا)، دل امنڈنا (دل بھر آنا)، دل آنا (دل گیا ہاتھ سے لوگوں نے کہا دل آیا)، دل بجھنا (پژمردہ ہونا) شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے، دل ہوا ہے چراغ مفلس کا (میر) دل بڑھانا (ہمت بندھانا)، دل بہلانا (رنج بھلانا)، دل پانا (عندیہ معلوم کرنا)، دل ہلنا (لرز جانا)، ۔

ان محاوروں کی ترکیب میں ایک اسم اور ایک مصدر تھا۔ اب دل سے بننے والے ان محاوروں کی مثالیں دیکھیے جن میں جملے یا نیم جملے کی شان ہے۔ کہاوتیں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں، نیز وہ ترکیبیں بھی جن میں لفظ تو دو ہیں، لیکن ترکیب اسمیہ یا صفاتیہ ہے، فعلیہ نہیں: دل میں گرہ پڑنا (فرق آنا)، دل ہاتھ میں لینا (خوش رکھنا)، دل ہٹ جانا (متنفر ہونا)، دل میں آنا (خیال گزرنا)، دل میں گھر کرنا (دل میں بسنا)، دل میں گڑ جانا (بھا جانا)، دل ہی دل میں کہنا (چپکے چپکے کہنا)، دل پر میل نہ لانا (خیال نہ کرنا)، دل پر نقش ہونا (کسی بات کا دل میں جم جانا)، دل پر ہاتھ رکھے پھرنا (بے چین پھرنا)، دل پک جانا (صدموں یا سخت کلامیوں سے دل اکتا جانا)، دل تھام کر بیٹھ جانا (کچھ نہ کرسکنا)، دل پھیکا ہوجانا (توجہ نہ رہنا) پری رُو تیرا آرائش سے کیوں دل ہوگیا پھیکا، دل ٹھکانے لگنا (تسکین ہونا)، دل جلا (فریفتہ)، دل جمعی (اطمینان)، دل جوئی (تسلی)، دل چلا (منچلا)، دل چور (لااُبالی)، دل حاضر ہونا (طبیعت کا درست ہونا)، دل خراش (جانکاہ)، دل خواہ (مرضی کے موافق)، دل خوش کرنا (رِجھانا)، دل دار (من بھاون)، دل دریاؤ (سخی)، دل دھک سے رہ جانا (اچانک صدمہ پہنچنا)، دل دہی (تشفی)، دل ربا (معشوق)، دل زدہ (غمگین)، دل کش (خوشنما)، دل سوز (دردمند)، دل سے اترنا

(ناپسند ہونا)، دل سے دھواں اٹھنا (آہ نکلنا)، دل سے کچھ کرنا (ازخود کرنا)، دل شاد (خوش)، دل شکستہ (رنجیدہ)، دل فریب (چِت چور)، دل کا بادشاہ (من موجی)، دل کا بخار نکلنا:

چشم سے خوں ہزار نکلے گا کوئی دل کا بخار نکلے گا (میر)

دل کا غبار نکلنا (صفائی ہونا)، دل کا کنول کھلنا (شگفتہ ہونا)، دل کا مالک اللہ ہے (خدا ہی دل پھیر سکتا ہے)، دل کباب ہونا (دل جلنا)، دل کڑا کرنا (دل سخت کرنا)، دل کو دل سے راہ ہونا (طرفین سے محبت ہونا)، دل کی دل میں رہنا (حسرت رہنا)، دل کی لاگ (عاشقی)، دل گردہ (جگرا)، دل گیر (اندوہگیں)، دل لگی (مذاق)، دل لگی باز (ظریف)، دل مسوس کر رہ جانا (صدمہ کے باعث)، دل ملا (بہناپا)، دل کھٹا ہونا (بیزار ہونا)، دل میں چٹکیاں لینا (طعنے دینا)، دل میں دل ڈالنا (اپنا بنانا)، دل میں راہ کرنا (رسائی پیدا کرنا)، دل میں رکھنا (پوشیدہ رکھنا)، دل میں کھبنا (دل میں بیٹھنا)، دل میں کانٹا سا کھٹکنا (ناگوارِ طبع ہونا)، دل کو قرار ہونا (دل کو ہو قرار، تو سوجھیں سب تہوار)، دل کی پھانس (کثافتِ خاطر)، دل کے پھپھولے پھوڑنا (حسرت نکالنا)، دل اچاٹ ہونا (جی اکتانا)، دل آرام (من موہن)، دل آزار (ظالم)، دل آزردہ (ناراض)، دل برا ہونا (ناراض ہونا)، دل بھر آنا (رونے لگنا)، دل بیٹھ جانا (ہمت ٹوٹ جانا)، دل باغ باغ ہونا (نہایت شاد ہونا)، دل پر میل آنا (دل میں کدورت آنا)، دل پر سانپ لوٹنا (افسوس آنا)۔

دل سے بننے والے محاوروں اور کہاوتوں کی ان چند مثالوں سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو بولنے والا معاشرہ کتنا ''دل زدہ'' ہے وہاں اس بات کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو میں تصریف و ترکیب کا کتنا زبردست مادّہ ہے، اور لسانی لوچ اور معنوی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے محاورے اردو کی کیسی بیش بہا دولت ہیں۔

علما نے محاورے کی تعریف یہ کی ہے کہ محاورہ کم سے کم دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اس بات پر صحیح زور دیا ہے کہ اکثر محاوروں کی بنیاد استعارے پر نہیں، بلکہ تمثیل پر ہوتی ہے۔ مثلاً تین پانچ کرنا، اپنے ڈھائی

چاول بگھارنا، ہتھے چڑھنا، اس کی باتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں، دل آنا وغیرہ۔ البتہ کیفی کے اس دعوے کی تصدیق ممکن نہیں کہ ''اردو میں محاوروں کا ذخیرہ شاید تمام زبانوں سے زیادہ ہے''۔ (کیفیہ، دہلی 1942، ص 179) تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ محاورے کے اعتبار سے اردو نہایت دولت مند زبان ہے۔ یوں تو ''روز مرہ و محاورۂ غالب'' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی گئی ہے[1] لیکن غالب محاورے کے بادشاہ نہیں تھے، ان کے گوشے دوسرے ہیں۔ محاورے کو زیادہ ترقی اُن متاخرین شعرائے لکھنؤ اور رام پور نے دی، جن کی زیادہ تر توجہ زبان کی نوک پلک سنوارنے اور لفظی استعمال کے امکانات کو بروئے کار لانے پر تھی۔ ان شاعروں میں دہلی کے شاہ نصیر اور ذوق اور ظفر کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ ان کے بعد داغ ان سب سے بڑھ کر تھے۔ انھوں نے روزمرہ اور محاورے کے استعمال کو آسمان تک پہنچا دیا۔ ''محاورات داغ'' (ولی احمد خاں، 1944) کے نام سے ہزاروں اشعار پر مشتمل کتاب موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں محاورے کی کثرت اور تموّل کی ایک وجہ یہ ہے کہ غزل کے شاعروں نے بطور خاص محاورے کے استعمال کو استحکام بخشا اور اسے توسیع دی۔ اگرچہ بنیادی وجہ اس کی بھی وہی ہے جو اردو زبان کی مجموعی تراش خراش کی ضامن ہے یعنی عہد وسطیٰ میں اس زبان کے بولنے والوں خصوصاً طبقۂ اناث کا اردو کی تراش خراش اور حسن کے بارے میں حساس رہنا اور اس کو زیادہ سے زیادہ حسین اور دلکش بنانے کی کوشش کرنا۔

کیفی نے مآخذ کے اعتبار سے محاوروں کی کئی قسمیں بیان کی ہیں۔[2] اس تقسیم سے محاوروں کے سماجی کردار پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کے سماجی مآخذ کیا ہیں، اور سماجی ضرورتوں کے تحت لفظ کس طرح باہم مل کر مخصوص معنی میں استعمال ہونے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ محاورے کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ چند قسمیں سماجی معنویت کے اعتبار سے دلچسپی سے خالی نہیں۔

---

1 دہلی، 1969

2 کیفیہ، دہلی 1942، ص 180

(1) حیوانی محاورے : جیسے اونٹ کی کوئی کل ٹھیک نہیں (عجیب بونگا آدمی)، اُلو بولنا، سونے کی چڑیا، ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، بھیڑ چال، مرغ کی ایک ٹانگ، ہاتھوں کے توتے اڑنا، دم دبا کر بھاگنا، الّو کی دم فاختہ، بھیگی بلی بننا، اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے، کان کھڑے ہونا، مینڈکی کو زکام ہونا، آدھا تیتر آدھا بٹیر، ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، ہماری بلی ہمیں سے میاؤں۔

(2) اعضائی محاورے : جیسے پیٹ کا ہلکا، مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑنا، پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، دانت کھٹے کرنا، آنکھ دکھانا، پانچوں انگلیاں گھی میں سر کڑھائی میں، اس سے منہ دھو رکھو، سر پھر جانا، دماغ آسمان پر ہونا، گوشت سے ناخن جدا نہیں ہوسکتا، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔

(3) نباتاتی محاورے بھی ہماری روزمرہ کی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً آم کے آم گٹھلیوں کے دام، بانس پر چڑھنا، خربوزے سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، ہتھیلی پر سرسوں جمانا، مولی گاجر ہونا، آم کھانے ہیں کہ پیڑ گننے ہیں، نیبو نچوڑ، الٹے بانس بریلی، ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا، لوہے کے چنے چبانا، ایک انار سو بیمار۔

(4) خور و نوش کے محاورے : کھچڑی داڑھی، حلوائے بیدود، چونّی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ، آٹے دال کا بھاؤ، چپڑی اور دو دو، تھالی کا بیگن، دانت کاٹی روٹی، بُور کے لڈو، دودھ کا دودھ پانی کا پانی، ٹیڑھی کھیر۔

(5) اسی طرح پوشاکی محاورے بھی کم دلچسپ نہیں : چولی دامن کا ساتھ ہونا، اپنی پگڑی سنبھالیے گا میر، جوتیوں میں دال بٹنا، احمد کی پگڑی محمود کے سر، جوتے کھانا، جوتی پیزار ہونا۔

(6) موسمی محاورے : ہوا کا رخ دیکھنا، چھاجوں مینہ برسنا، سر منڈاتے ہی اولے پڑے، ہوا ہوجانا، ہوا باندھنا، وہ تو بجلی ہے، آگ برسنا، برس پڑنا، امیدوں پر اوس پڑنا۔

(7) فلکیاتی محاورے : چاند کا ٹکڑا، آنکھوں کا تارا، قطبین کا فرق، مین میکھ نکالنا، زمین آسمان کے قلابے ملانا، آسمان پر دماغ ہونا، ستارہ چمکنا، سنیچر آنا، بری گرہ آنا۔

(8) عددی محاورے : تین پانچ کرنا، نہ تین میں نہ تیرہ میں، پو بارہ، انیس بیس کا فرق، ایک آنکھ نہ بھانا، چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات، چاق چوبند، چھکے چھوٹنا، آٹھ آٹھ آنسو رونا۔

(9) نفسیاتی محاورے : کلیجا منہ کو آنا، سناٹا ہو جانا، سکتے میں آجانا، آستین چڑھانا، لہو کے گھونٹ پی کر رہ جانا، چہرہ فق ہو جانا، پاؤں تلے سے زمین نکلنا، کسی چیز کو دیکھ کر رال ٹپکنا، انگاروں پر لوٹنا، آنکھوں میں خون اتر آنا، باغ باغ ہونا۔

(10) آبی محاورے : آب آب ہونا، سات سمندر پار، کشتی کنارے آلگنا، لنگر ڈالنا، دریا میں رہنا اور مگر سے بیر، درد کی لہر اٹھنا، چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا، پاپ کی ناؤ بھر کر ڈوبا کرتی ہے، موج اڑانا، الٹی گنگا بہانا۔

(11) رزم اور شجاعت کے محاورے : اردو زمینی زبان ہے۔ اس میں سمندر، دریا اور پانی سے بننے والے محاورے نسبتاً کم ہیں جبکہ رزم اور شجاعت کے محاوروں سے اردو معمور ہے۔ اس زمانے کے سماجی اور سیاسی ماحول میں جنگ کا جو عمل دخل تھا، یہ اس کا راست اثر ہے۔ جس زبان کا سابقہ لشکروں سے رہا ہو، اس کے لفظوں کی ساخت اور محاوروں کی وضع سے شجاعت اور رزم کے اثر کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے : رَن پڑنا، گھمسان کا رَن، کھیت رہنا، کام آنا (لڑائی میں مارا جانا)، مورچہ باندھنا، ہلّہ بولنا، تلوار کے گھاٹ اتارنا، بال بال بچنا، تیر لگانا، چلہ چڑھانا، تلوار سونتنا، نیزہ تاننا، بندوق چھتیانا، تلواروں کی چھاؤں میں دن کاٹنا، جان پر کھیلنا، چاروں شانے چت گرنا، اڑان گھائی بتانا، دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا۔

(12) حرفت کے محاورے : سو سنار کی ایک لہار کی، کولہو کا بیل بننا، چمار چودس، دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا، بات کا کھٹائی میں پڑنا، درزی کی سوئی کبھی

گاڑھے کبھی کمخواب میں، وغیرہ۔

کہاوت اور محاورے میں بڑا فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ محاورہ کلام کا جُز بن کر اس میں جذب ہوجاتا ہے۔ کہاوت میں یہ قابلیت نہیں ہے۔ یہ اگر حذف بھی کردی جائے تو معنی میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوگا۔ نجم الامثال[1] اور مخزن الامثال[2] کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملے جلے تمدن اور معاشرت کو سمجھنے کے لیے محاوروں کے علاوہ کہاوتوں اور امثال سے بھی بیش بہا مدد لی جاسکتی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات اہم ہے کہ اردو کے کئی محاورے اور امثال ایسی ہیں جن کے موجد لال قلعے کے رہنے والے تھے۔ دہلی والے اہل قلعہ کا تتبع کرتے تھے۔ ایسے محاورے شروع میں مدتوں خاندانِ شاہی یا جہاں پناہ سے متعلق رہے مثلاً بھنڈا (حقہ)، چرن بردار (کفش بردار)، خاصہ (بادشاہوں یا امیروں کا کھانا)، سید احمد دہلوی[3] نے لکھا ہے کہ اس کا رواج دہلی کے نوابوں میں بھی ہوگیا تھا۔ آبِ حیات بادشاہ کے پینے کے اس خاص پانی کو کہتے تھے جو گنگا سے آتا تھا یعنی گنگا جل۔ گلابی شراب کی چھوٹی سی بوتل کو کہتے تھے؛ میر کا مشہور شعر ہے:

هم رہے عمر بھر شرابی سے
دلِ پرخوں کی اک گلابی سے

صاحبِ عالم شہزادے کو کہتے تھے۔ نائی کو خاص تراش اور باریک جالی دار کمرے یا الماری کو نعمت خانہ جس کے اندر مکھیاں نہ جاسکیں۔۔قول کا چھلاّ تو آج تک چلا آتا ہے۔ باندی کو ناموس کہتے تھے، سونا اور آرام فرمانا کے لیے سُکھ کرنا، تیکھی یعنی غضب ناک کا استعمال بھی مغلوں سے چلا ہے۔ خدا محفوظ رکھے کے لیے چھائیں پھوئیں کہتے تھے۔ کھانوں سے متعلق جو محاورے عہد مغلیہ کے ہندو مسلمانوں میں رائج ہوئے ان میں سے کچھ تو زبان کی ارتقائی تبدیلیوں کی نذر

1 نجم الدین دہلوی، 1876

2 چرنجی لال دہلوی، 1890

3 مرقعِ زبان و بیانِ دہلی، دہلی 1915، ص 29

ہو گئے، متعدد آج تک رائج ہیں۔ مثلاً نورمحلی پلاؤ، روغنی روٹی، رومالی روٹی، حبشی حلوا، نانِ پنبہ، نانِ تنکی، نانِ گلزار۔ اسی طرح موتی پلاؤ، نرگسی پلاؤ، حسینی کباب، نکتی کباب، نرگسی کباب۔ گل کھانا بطور نشانی چھلے وغیرہ کا داغ اختیار کرنا۔ منحوس کو سبز قدم کہتے تھے۔ اسی طرح زمین پکڑنا، ہوا باندھنا، پھبتی کہنا، بھنانا، جگر پکڑ کر بیٹھ جانا، چھٹی کا دودھ یاد آنا، چھرّا چلنا:

گالیوں کا ہم پہ چلتا روز چھرّا صاف ہے
کیا زباں ہے آپ کی، کیا روزمرّا صاف ہے

ناک پکڑے دم نکلنا بمعنی نہایت کمزور ہونا، چراغ جلے آنا، ظفر کا شعر ہے:

نہ کیوں کہ شوق کی گرمی سے دل کا داغ جلے
وہ کہہ گئے ہیں کہ آئیں گے ہم چراغ جلے

اس طرح کے سینکڑوں محاورے ہیں جنھیں لال قلعے والوں نے اور ان کے تتبع میں ہندوؤں مسلمانوں نے اردو میں اضافہ کرکے اس زبان کو انتہائی دلچسپ اور متمول بنا دیا۔

بعض خاص محاورات بیگماتِ قلعہ سے تعلق رکھتے تھے یا پھر شرفائے دہلی کی خواتین سے متعلق تھے۔ مثلاً محلدارنی یعنی معزز خادمہ، پتنگ چھری، لگائی بجھائی کرنے والی عورت کو کہتے تھے۔

کیوں نہ پھروں میں اہلی گہلی اوپر والا نکلا آج

یہاں اوپر والا سے مراد چاند ہے۔ دوڑ نگے مچانا، دوڑتے پھرنا، اس کی بات میں ذرا بھدرک نہیں یعنی استواری نہیں۔ بچوں کو ہپّا کھلانے والی ملازمہ کو ہپّو کہتے تھے، اور دایہ کو چھوچھو۔ اوڑو اوڑو ہونا یعنی بدنام ہونا۔ شیطان اچھلنا، غصہ تھوک دو، شیطان کے کان بہرے، حف نظر، تمھارے دیدوں میں رائی نون، پنڈا پھیکا پڑنا (بخار محسوس ہونا)، دل میلا کرنا، مودیخانہ (گودام)، تلوے سہلانا (خوشامد کرنا)، لپکا پڑنا (لت لگنا)، کاکلوتی (مامتا، محبت)۔ عورت پیٹ سے ہوتی تو کہتے دوجی سے ہے۔

ایسے کچھ اور محاورے دیکھیے جو کسی ایک مذہب سے مخصوص نہیں۔ کلیجا پکڑے

پھرنا، کشتم کشتا (گتھم گتھا)، منھ فق ہونا (چہرے پر ہوائیاں اڑنا)، ماتھا ٹھنکنا (آنے والی آفت کا اندیشہ ہونا)، ہونٹھ چاٹنا (مزا لینا)۔ اجلی بمعنی دھوبن، ہلکان کرنا، تھکا دینا، لہو پانی ایک کرنا، آنکھوں میں نیند گھلنا، آبے لونڈے، جابے لونڈے یعنی فضول کام لینا۔ چھاتی پر ہاتھ رکھنا، آسمان میں تھگلی لگانا، خون سفید ہونا، اندھیرے گھر کا اجالا۔

یہی حال کہاوتوں اور امثال کا ہے جو مذہب اور ذات برادری کی حدود کو توڑ کر پورے سماج میں پھیل جاتی ہیں۔ کہاوتیں دراصل سماجی سچائیاں ہوتی ہیں، جن کی بنیاد اکثر و بیشتر کسی حادثے یا واقعے یا حوالے پر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایسی تلمیحیں ہیں جنھیں انسانی تجربے یا عقل کا نچوڑ بھی کہا جاسکتا ہے۔ پہلے یہ واقعاتی طور پر ایک انسان کی زبان میں ظاہر ہوئی ہوں گی، پھر اس سے ملتا جلتا واقعہ کئی افراد کے سامنے آیا اور نتیجے کے طور پر کوئی مثل یا کہاوت بن سنور اور ترش تراش کر زبان میں داخل ہوگئی۔ کہاوتوں کے پیچھے جو حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے، کئی بار وہ کہانی کی شکل میں بھی مشہور ہو جاتا ہے جس سے وہ کہاوت دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ کئی بار یوں بھی ہوتا ہے کہ اصل واقعہ تو لوگ بھول جاتے ہیں، لیکن اس سے کوئی ملتا جلتا یا فرضی واقعہ گھڑ کر اس کہاوت سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ کئی کہاوتیں اور امثال ایسی بھی ہیں، جن کی اصل ماضی کے دھندلکے میں کھوگئی، اور کچھ معلوم نہیں کہ یہ کیسے رائج ہوئیں۔ کہاوتوں کا بہت بڑا ذخیرہ ایسا بھی ہے جو واقعاتی نہیں، بلکہ تجرباتی اور عقلی بنیاد پر وجود میں آیا یعنی ان میں کسی مخصوص تجربے کی تکرار سے ذہنِ انسانی ایک خاص نتیجے تک پہنچا۔ اس کے بعد ایک کلیہ سا بن گیا، جس تک کئی افراد یا سماج کے کئی حصے کم و بیش ایک ہی وقت میں پہنچے تھے۔ اس طرح وہ کہاوت زبان کا مستقل حصہ بن کر سب بولنے والوں کی دسترس میں آگئی۔

کہاوتوں کے بارے میں جو طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جاتی ہیں، ان کا اندازہ ان چند مثالوں سے ہوگا:

آپ موئے تو جگ مُوا۔ میر کا شعر ہے:

میرؔ! عمداً بھی کوئی مرتا ہے

جان ہے تو جہان ہے پیارے

کہتے ہیں، ایک شخص دریا میں ڈوبتا تھا۔ زور زور سے چیخنے لگا ''مجھے نکالو، نہیں تو جگ ڈوبا''۔ لوگوں نے اسے بچانے کے بعد پوچھا، ''کہو بھئی، جگ کیوں کر ڈوبا؟'' اس نے جواب میں کہا، ''جان سے جہان ہے''۔ یہ سماجی سچائی دنیا کی کئی زبانوں میں بیان کی گئی ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں: من زندہ جہاں زندہ۔ انگریزی میں ہے Death's day is doomday۔

مفت کی ماری قاضی کو بھی حلال۔ کسی قاضی کے گھر پڑوسی کی مرغی چلی آئی۔ بیوی نے ذبح کرکے پکالی۔ قاضی جی کو پتا چلا تو بہت گرمائے۔ بیوی نے کہا: کہو تو پھینک دوں۔ مگر میرا گھی مسالا بھی تو ضائع جائے گا۔ قاضی جی کو یہ منظور نہیں تھا۔ فرمایا: چلو، شوربے سے روٹی کھا لیں گے، بوٹی سے کچھ کام نہیں۔ جب لونڈی پیالے میں شوربا ڈالنے لگی، تو ساتھ بوٹیاں بھی آگئیں۔ انھیں وہ روکنے لگی تو قاضی جی نے کہا: ''کم بخت! آپ سے آتی ہیں، تو آنے دے''۔ بیوی سن رہی تھی، بولی ''مرغی بھی تو آپ سے آئی تھی''۔ قاضی جی نے کہا: ''تو ٹھیک ہے''۔

ظاہر ہے کہ مثل کہاں سے چلی ہوگی، لیکن اب اس میں مذہب کو مطلق دخل نہیں۔ اصل چیز وہ طنز ہے جو مذہب کے نام لیواؤں اور ظاہر داروں پر کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے اصول اور نصیحتیں سب دوسروں کے لیے ہوتی ہیں۔ لیکن جب معاملہ اپنا ہو تو نظر سیدھی فائدے اور غرض پر رہتی ہے، اصول اور اخلاق سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس سماجی سچائی کے پیش نظر یہ کہاوت بلا امتیازِ مذہب و ملت سب میں رائج ہے۔

مرغ کی ایک ٹانگ: ایک خانساماں نے مرغ پکا کر مالک کے آگے رکھا، تو مالک نے پوچھا ''اس کی دوسری ٹانگ کہاں ہے؟'' خانساماں نے کہا، ''حضور، اس مرغ کی نسل ہی ایسی تھی جس کے ایک ٹانگ ہوتی ہے''۔ مالک چپکا ہو رہا۔ جب کھاپی کر ٹہلنے لگا تو دیکھا کہ سامنے ایک مرغ ٹانگ سکیڑے کھڑا ہے۔ خانساماں نے

فوراً کہا، یہ مرغ بھی اسی نسل کا ہے۔ مالک نے ہش کی، مرغ نے دوسری ٹانگ نیچے رکھ دی۔ خانساماں نے کہا ''کیا خوب! حضور اس وقت بھی ایسا ہی کرتے تو وہ بھی دوسری ٹانگ نکال دیتا''۔

اڈھی کے واسطے پیسے کا تیل جلانا : کہتے ہیں، ایک افیونی کی رات کو راستے میں ایک ریوڑی گر گئی۔ اس نے تلاش میں پیسے کا تیل جلا ڈالا۔ لوگوں نے پوچھا، ''میاں، چراغ لے کر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟'' کہا ''ریوڑی گر گئی ہے''۔ پوچھنے والوں نے کہا ''اڈھی کی ریوڑی کے لیے پیسے کا تیل جلانا کیا ضروری تھا؟ ایک پیسے کی ریوڑیاں ہی لے کر کھالی ہوتیں''۔ افیونی بولا ''پیسے کا تو غم نہیں۔ ڈر یہ ہے کہ کسی بے درد کے ہاتھ لگ گئی تو وہ کھٹ سے چبا ڈالے گا''۔

نادان کی دوستی، جی کا زیاں : کہتے ہیں، ایک بڑھئی لکڑی چھیل رہا تھا۔ اس کی چمکتی ٹانٹ پر بار بار مکھیاں آ کر بیٹھ جاتیں اور بڑھئی کو ستاتیں۔ پاس بیٹھے دوست سے کہنے لگا ''یار، ان مکھیوں کا کچھ علاج کرو''۔ دو ایک بار تو اس نے اڑانے کی کوشش کی۔ جب بہت تنگ آیا تو کلہاڑی اٹھائی اور کھٹ سے بڑھئی کے سر پر دے ماری۔ مکھیاں تو اڑ گئیں لیکن بڑھئی بھی وہیں ڈھیر ہو گیا:

دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

کہاں راجا بھوج، کہاں گنگوا تیلی : کہتے ہیں، جب راجا بکرم کے برے دن آئے تو راج پاٹ سب جاتا رہا۔ شہر بہ شہر بھٹکتا ہوا کہیں جا کر ملازم ہو گیا۔ وہاں اس پر چوری کا الزام لگا اور سزا میں ہاتھ پاؤں کٹوا کر اسے شہر کے باہر پھینکوا دیا گیا۔ گنگوا تیلی نے اس کی موہنی صورت دیکھ کر اپنی فرزندی میں لے لیا۔ جب علاج معالجے سے اچھا ہو گیا، تو کولھو پر بیٹھ کر بیل کو ہنکایا کرتا اور بیٹھے بیٹھے گاتا رہتا۔ پاس ہی راجا کا محل تھا۔ راجا کی بیٹی بار بار چراغ گل کراتی، لیکن بکرم کے گائے ہوئے دیپک راگ کی تاثیر سے بجھے ہوئے چراغ پھر روشن ہو جاتے۔ آخر ٹوہ لگائی گئی تو معلوم ہوا کہ محل کے نیچے گنگوا تیلی کے کولھو پر بیٹھا ہوا ایک شخص گا رہا ہے۔ راج کماری کا دل عشق کی تاثیر سے چھد گیا۔ راج کنیا نے اصرار کیا، چاہے لُولا ہے

یا لُنجا، میں بیاہ کروں گی تو اُسی سے۔ تب سے یہ مثل مشہور ہوگئی۔ کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی۔

میرا بیل منطق نہیں پڑھا: کہتے ہیں کسی منطقی نے ایک تیلی سے پوچھا کہ بیل کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھ رکھی ہے۔ اس نے کہا، گھنٹی بجتی رہتی ہے تو میں دور ہونے پر بھی سمجھ لیتا ہوں کہ وہ چل رہا ہے۔ منطقی نے کہا، اگر وہ کھڑے کھڑے ہی گردن ہلاتا رہے تو۔ تیلی نے جواب دیا: میاں، میرا بیل منطق نہیں پڑھا ہے۔

ننانوے کے پھیر میں پڑنا: ایک غریب آدمی اور اس کی بیوی کی چار آنے روز کی آمدنی تھی۔ وہ اس غربت میں بھی بڑے خوش رہتے۔ اس کی بھاوج کو ان کی بے فکری کی زندگی پر رشک آتا تھا۔ آخر ایک دن اس نے ننانوے روپے تھیلی میں باندھ کے ان کے گھر میں پھینک دیے۔ وہ بیچارے بہت خوش ہوئے۔ بیٹھے بٹھائے لچھمی آئی۔ ہوتے ہوتے میاں بیوی دونوں کی خواہش ہوئی کہ کسی طرح اپنی آمدنی سے ایک ایک پیسہ بچا کر روپیہ جوڑیں اور ننانوے میں ملا کر سو پورے کرلیں۔ ہوتے ہوتے یہ فکر ان کے ایسی دامن گیر ہوئی کہ وہ طرح طرح کی پریشانیوں میں گھر گئے۔ تب سے یہ کہاوت چلی ہے، ننانوے کے پھیر میں پڑنا۔ غرض ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

محاورے ہوں یا کہاوتیں، ان کی سماجی توجیہہ کرتے ہوئے بعض کے بارے میں آسانی سے پتا چلایا جاسکتا ہے کہ ان کی مذہبی اصل کیا ہے۔ مثال کے طور پر نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی، گھی کے چراغ جلانا، لنکا سے جو بھی نکلے باون گز کا، کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی، رام کہانی سنانا، بگلا بھگت، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا، الٹی گنگا بہانا، جوگی کس کے میت، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے وغیرہ میں خط کشیدہ الفاظ سے صاف جھلکتا ہے کہ یہ محاورے اور کہاوتیں کس مذہب کے اثر میں پیدا ہوئیں۔ اسی طرح، گئے تھے نماز بخشوانے روزے گلے پڑے، مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال، سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی، دو ملاؤں میں مرغی حرام، خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں، گھر کی مرغی دال

برابر، ملا کی دوڑ مسجد تک، مرے کو مارے شاہ مدار، عید کا چاند ہونا وغیرہ سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ان کی شروعات کس مذہب کے سائے میں ہوئی ہوگی۔ لیکن کیا آج بھی ان کہاوتوں کا تعلق کسی خاص مذہب یا کسی خاص عقیدے کے ماننے والوں سے ہے؟ ایسی سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں، جہاں رائج ہونے کے بعد محاوروں یا کہاوتوں کا مذہبی عقیدے سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ اس ضمن میں قرۃ العین حیدر کے افسانے ''جلا وطن'' کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں جس میں انھوں نے مرزا پور اور جون پور کی مشترک زبان اور محاوروں کا ذکر کیا ہے:

> ''زبان اور محاورے ایک تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منہ نیلا پیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے — برسو رام دھڑا کے سے، بڑھیا مرگئی فاقے سے — گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا — ہاتھی گھوڑا پالکی، جے کنھیا لال کی — مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی، رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں — بھری گگری موری ڈھرکائی شام — کرشن کنھیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا، ایک مکمل اور واضح تصویر تھا''۔ (1)

محاورے اور کہاوتیں زبان کے ذخیرۂ عام سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ ذخیرہ سب استعمال کرنے والوں پر کھلا ہوا ہے۔ لفظوں میں پھر بھی ایسی مثالیں مل جائیں گی، جن کا تعلق کسی خاص مذہب یا فرقے یا طبقے سے ہو، لیکن محاورے اور کہاوتیں چونکہ وسیع تر چلن سے وجود میں آتی ہیں، اس لیے ان کا تعلق زبان کے اس مرکزی اور اساسی حصے (Core) سے ہوجاتا ہے جو سب کی دسترس میں ہے، اور جسے ذخیرۂ

---

1 پت جھڑ کی آواز، دہلی 1965، ص 59-58

عام کہنا چاہیے۔ کثرت استعمال سے محاوروں اور کہاوتوں کی مذہبی حیثیت زائل ہو جاتی ہے اور صرف لسانی حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سکہ جب ٹکسال سے باہر آجاتا ہے تو وہ اپنے استعمال کرنے والے کے تصرف میں ہوتا ہے۔ محاورے اور کہاوتیں ہماری مشترک دولت ہیں۔ یہ ہم سب کے استعمال میں ہیں، اور ان پر ہم سب کا حق ہے۔[1]

○

1 اس بحث سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی کہ سیکولرازم زبان کے اندر کھدا ہوتا ہے، اوپر سے اوڑھا نہیں جاتا۔ وہ لوگ جو سیکولرازم یا ایسے نظریات کو اوپر سے لاگو کرنے یا اوڑھنے کا کاروبار کرتے ہیں، دراصل وہ سیاسی دکان چلاتے ہیں اور اپنی تہذیبی میراث سے بے خبر ہیں۔

اردو کے افعالِ مرکبہ پر ایک نظر

اردو گرامر میں جو چیز سب سے زیادہ پیچیدہ، سب سے زیادہ مشکل اور اس لحاظ سے جس کا تجزیہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے، وہ افعال ہیں؛ اور افعال میں بھی امدادی افعال اور مرکب افعال۔ میں انھیں اردو گرامر کی اصل بنیاد کہتا ہوں۔ مولوی عبدالحق نے صحیح لکھا ہے کہ اردو میں ''سب سے زیادہ کارآمد اور کثیرالاستعمال امدادی فعل ہوتا ہے۔ امدادی افعال کی مدد سے' بے شمار لطیف اور نازک معنی پیدا ہوجاتے ہیں اور اردو زبان میں امدادی افعال نے بڑی وسعت اور نزاکت پیدا کردی ہے''۔ (قواعد اردو، بیانِ فعل) اردو اور ہندی میں افعالِ مرکبہ کے ارتقا اور ان کی لاتعداد متنوع صورتوں کے بارے میں کئی طرح کی قیاس آرائی کی جاسکتی ہے، مثلاً یہ کہ قدیم آریائی نسل وقت کی رفتار کا عجیب و غریب احساس رکھتی ہوگی، یا یہ کہ وہ ریاضیاتی ذہن رکھتی تھی اور اُس کا اثر افعال کے استعمال پر بھی پڑا، یا یہ کہ ہندوستان کی گرم آب و ہوا کی وجہ سے کاہلی اور آہستہ روی کی جو ایک عادت سی پیدا ہوجاتی ہے، ہندی اور اردو افعال کا پھیلاؤ اُسی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال وجہ کچھ ہو، اتنی بات واضح ہے کہ افعال کی گوناگوں صورتوں کی وجہ سے اردو کا معنوی رُتبہ بہت بلند ہے اور انھیں کی بدولت اردو میں زمانے اور حالت کے نازک سے نازک فرق کو نہایت صحت کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی فعل کی ان صورتوں کو دیکھیے:

کر دیا، کر دیا ہے، کر دیا تھا، کر دیا ہوگا، کر دیا کرتا ہوگا، کر دیا کرتا تھا، کر دیا کرتا ہے، کر دیا کرتا، کر دیا ہو، کر دیتا ہو، کر دیا ہوتا، کر دیتا، کر دیتا ہو، کر دے، کر دے گا، کر دیتا ہے، کر دیتا تھا، کر دیتا ہوگا۔ یہ بھی خیال رہے کہ مندرجہ بالا

ہر فعلیہ صورت سے غائب، حاضر، متکلم اور مذکر و مؤنث اور واحد و جمع کی بنا پر بیسیوں دوسری صورتیں اخذ کی جاسکتی ہیں۔

افعالِ مرکبہ کے تجزیے کے لیے سب سے پہلے ان چند جملوں کو لیجیے :

(1)	احمد آیا	ف[1]	فعل
(2)	زید بیمار ہے	ف	فعلِ ناقص
(3)	اُس نے کوشش کی	س + ف	فعلِ مرکب
(4)	میں نے اُسے سمجھا دیا ہے	ف + ف + ف	فعلِ مرکب
(5)	وہ چائے پی رہا ہے	ف + ف + ف	فعل

پہلے جملے میں ایک فعل ہے، آیا۔ اسے سادہ فعل کہا جاتا ہے۔ دوسرے جملے میں بھی ایک فعل ہے، لیکن چونکہ اس سے کام کا کرنا نہیں، ہونا ظاہر ہوتا ہے، اسے فعلِ ناقص کہتے ہیں۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں جملے میں فعل کی ساخت مختلف ہے۔ تیسرے جملے میں کوشش اسم ہے اور کرنا مصدر سے مل کر فعل بنا ہے (یعنی س + ف)۔ ہماری گرامروں میں اسے فعلِ مرکب کہا جاتا ہے۔ چوتھے جملے میں سمجھا + دیا + ہے کل تین فعل ہیں (یعنی ف + ف + ف)۔ یہ بھی فعلِ مرکب ہے۔ پانچویں جملے میں بھی فعل کی ساخت یہی ہے : پی + رہا + ہے (یعنی ف + ف + ف) مگر اسے ہماری گرامروں میں سادہ افعال ہی کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو قواعدِ اردو از مولوی عبدالحق، حالِ ناتمام کا بیان، وہ لارہا ہے، وہ لا رہے ہیں، وغیرہ، جیسے وہ لایا، وہ لائے وغیرہ سادہ افعال کی گردانوں کے ساتھ جگہ دی گئی ہے)۔ اس سے اتنی بات ظاہر ہے کہ ہماری گرامروں میں افعال مرکبہ کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فعلِ مرکب وہ ہے جو امدادی افعال یا اسما یا صفات کے ساتھ ترکیب دینے سے بنتا ہو۔ اس تعریف کی روشنی میں پانچویں جملے میں پینا کو رہنا کے ساتھ ترکیب دیا گیا ہے۔ گویا ساخت کے اعتبار سے یہ اتنا ہی مرکب فعل ہے جتنا سمجھا دینا۔ لیکن ہماری گرامروں میں اسے سادہ فعل بتایا جاتا

1 ف = فعل؛ س = اسم

ہے۔ ان گراموں کا یہ پہلو دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک طرف تو تین فعل والے فعل کو سادہ فعل کہا جاتا ہے[1] اور دوسری طرف ایک فعل والے فعل یعنی کوشش کرنا کو فعلِ مرکب کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ (یہ صحیح ہے کہ قدیم تدریسی طریقوں کے مطابق ترکیبِ نحوی کرتے ہوئے پہلے حصے کو اسم اور دوسرے کو فعل بتایا جائے گا لیکن اردو گرامر انھیں فعلِ مرکب ہی مانتی ہے۔) واقعہ یہ ہے کہ کوشش کرنا، شروع کرنا، یقین کرنا، بات کرنا وغیرہ اسمیہ فعل (Nominal Verbs) ہیں کیونکہ ان کی ساخت س + ف ہے اور اس لحاظ سے یہ سمجھا دینا، سنا دینا، گر پڑنا، بلا لینا، رکھ لینا سے مختلف ہیں جن کی ساخت ف + ف ہے۔ ساختی لسانیات (Structural Linguistics) کی رُو سے اردو کے افعالِ مرکبہ صرف وہ ہیں جو ایک سے زیادہ فعل سے ترکیب پائیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ساختی لسانیات کی مقبولیت سے پہلے کی گرامریں خواہ وہ اردو کی ہوں یا فارسی کی، سنسکرت کی یا انگریزی کی، جو سب کی سب اطالوی گراموں کی روایت کی پیروی کرتی ہیں؛ انھیں جدید لسانیات کی اصطلاح میں روایتی (Traditional) گرامر کہا جاتا ہے۔ یہ گرامریں صدیوں سے رائج ہیں اور تدریسی ضرورتوں کے لیے ان کی خوبیاں مسلّم ہیں۔ لیکن ان میں نقص یہ ہے کہ یہ فلسفیانہ تعریفوں کے سہارے چلتی ہیں، یعنی یہ زبان کو بندھے ٹکے صرفی اور نحوی تصورات کے چوکھٹے میں پیش کردیتی ہیں اور جدید ذہن کے تجزیاتی تقاضوں کا اس لحاظ سے ساتھ نہیں دیتیں کہ یہ زبان کی ساخت کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کرسکتیں۔ گویا ان گراموں کا حال تیارشدہ کپڑوں کا سا ہے۔ یعنی چیز پہلے سے تیار ہے، اب اُسے کسی نہ کسی جسم پر چست کرنا ہی پڑے گا۔ یوں ذرا سا جھول تو شاید رہے گا ہی، اسے نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ نیز کبھی کبھی تصورات کی بھول بھلیوں میں اصل مدعا گم ہوکر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا تمنا عمادی کا یہ بیان دیکھیے :

---

1 تمنا عمادی نے تو چکنا سکنا اور جانا سے مل کر بننے والے افعال (لکھ سکنا، کر چکنا، دیکھ لیا جانا) کو بھی مرکب افعال تسلیم نہیں کیا۔ (افعال مرکبہ، کراچی، 1961، ص 59، 88-89)

''جیسے ''میں نے چار روٹیاں کھالیں''، ''دو من گیہوں منگوا لیے''، ''کھالیں'' اور ''منگوا لیے'' افعال مرکبہ ہیں۔ ضمیر متکلم فاعل ہے۔ ''چار'' مفعول ہے اور ''ممیز '' اور ''روٹیاں'' اس کی تمیز۔ پھر ''دو'' ممیز ہے۔ ''من'' اس کی تمیز۔ یہاں یہ دونوں ممیز اور تمیز مل کر پھر ممیز ہو گئے اور اس مرکب ممیز کی تمیز ''گیہوں'' ہے۔ اب یہ دونوں ممیز و تمیز مل کر ''منگوا لیے'' فعل کے مفعول ہو گئے۔ یا ''دو'' کو ممیز کہیے اور ''من'' کو اس کا رفیق اور گیہوں کو تمیز۔ ممیز اپنے رفیق کے ساتھ مل کر مکمل ممیز ہوگا، اور یہ مکمل ممیز اپنی تمیز کے ساتھ مل کر منگوا لیے فعل کا مفعول ہوا، اور ضمیر متکلم تو فاعل ہے ہی''۔ (افعال مرکبہ، ص 55)

مولوی عبدالحق نے مرکب افعال کے دوسرے جزو یعنی دینا، لینا، جانا، ڈالنا، پڑنا، چکنا، رکھنا، سکنا، لگنا، چلنا وغیرہ کو بحث کی بنیاد بناتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے ساتھ لگنے سے اس سے کیا کیا نئے یا اضافی معنی حاصل ہوتے ہیں، ان کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

بتا دینا ۱	آنے دینا ۴	آیا کرنا ۳	بکے جاتا ہے ۵	بولتا رہا ۲
کہتا رہا ۲	کہے جاتا ہے ۵	چلا جانا ۳	اڑنے پانا ۴ (اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے)	
جانے دینا ۴	لے لینا ۱	سوتا رہا ۲	رویا کرنا ۳	سن لینا ۱

نا امیدی منائے جاتی ہے

شوق نقشہ جمائے جاتا ہے
۵

جدید لسانیات ان افعال کو بالکل دوسری طرح پیش کرے گی۔ یعنی وہ پہلے امدادی فعل کو نہیں، بلکہ اصل فعل کو لے گی، اور خاص طور پر اصلی فعل کی بھی اُن شکلوں کو جو بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ان ہی افعال پر دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اگر ان کو ساخت کے نقطۂ نظر سے دیکھیے، تو معلوم ہوگا کہ ان میں کم از کم پانچ طرح کی نحوی ترکیبیں (Phrase Structures)

ملتی ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے:

(1) م + ف[1] (مادۂ فعل + فعل)
(2) ح + ف (حال مطلق + فعل)
(3) ض + ف (ماضی مطلق + فعل)
(4) ص + ف (مصدر + فعل)
(5) ع + ف (مضارع + فعل)

مندرجۂ بالا افعال میں ساخت کی اس خصوصیت کو ہندسوں سے ظاہر کردیا گیا ہے۔ یعنی ''بتا دینا'' کے نیچے ہندسہ 1 لکھا ہوا ہے، اس کا مطلب ہوا: مادۂ فعل + فعل؛ ''آنے دینا'' کے نیچے 4 لکھا ہوا ہے، یعنی مصدر + فعل، علی ہذالقیاس۔ افعالِ مرکبہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ساخت کا یہ احساس نہایت ضروری ہے، کیونکہ فعل کا پہلا جزو یعنی اصل فعل ہی بنیادی چیز ہے۔ یہ اکثر و بیشتر جملے میں جوں کا توں قائم رہتا ہے، جبکہ دوسرا جزو یعنی امدادی فعل لازماً تعداد، جنس، زمانے اور حالت کا اثر قبول کرتا ہے اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ افعالِ مرکبہ کا وہی بیان زیادہ بااصول اور سلجھا ہوا ہوگا جو اصلی فعل کی مختلف شکلوں کو بنیاد بنا کر پیش کیا جائے گا۔ یہ بات خاطر نشاں رہنی چاہیے کہ زبان کی بحث میں ساخت مقدّم ہے، معنی کی سطح ساخت کی سطح کے بعد آتی ہے۔ ان افعال سے متعلق اس طرح کے تجزیے کی ایک کوشش میں نے وسکانسن یونیورسٹی میں کی تھی، اس کے نتائج مختصراً یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

(1) مادّۂ فعل سے مل کر بننے والے مرکب افعال (م + ف)

(الف) Completives کام کا تمام و کمال ختم ہونا: بول چکنا، کر چکنا، کھا چکنا

(ب) Potentials (امکانی حالت، قابلیت یا اجازت):
کر سکنا، سن سکنا، لکھ سکنا، جا سکنا

1 م = مادۂ فعل؛ ح = حالِ مطلق؛ ض = ماضی مطلق؛ ص = مصدر؛ ع = مضارع

(ج) Intensives (تکمیلِ فعل، تاکید اور زور، جبر، بے اختیاری، اچانک پن)
مار ڈالنا چیر ڈالنا کاٹ ڈالنا کھو بیٹھنا بتا دینا پی جانا لڑ پڑنا
گر پڑنا دبا رکھنا سن رکھنا لے جانا ہٹا دینا سن لینا بول اٹھنا
کر بیٹھنا چڑھ بیٹھنا ٹوٹ جانا پھینک لینا بگڑ جانا بہہ نکلنا پھوٹ نکلنا
آملنا بکھر جانا اٹھ جانا دیکھ آنا دیکھ لینا دیکھ جانا دیکھ لیا جانا
ابھر آنا اگ آنا نکل آنا ابل آنا آ جانا بول اٹھنا جاگ جانا
بھڑک اٹھنا کھا جانا ہو جانا نگل جانا (اردو میں زیادہ تعداد اسی قسم کے مرکبہ الفاظ کی ہے)

(د) Continuatives-A (جاری ہونا) کھا رہا ہے/ تھا/ ہوگا

(ہ) Statics (ایک حالت پر قائم رہنا) بیٹھ رہنا سو رہنا اٹک رہنا

(و) Personals (فاعل کی قربت) بلا لینا رکھ لینا لے لینا

(2) حالِ مطلق سے مل کر بننے والے مرکب افعال (ح + ف)

Continuatives-B (فعل کا جاری رہنا/ ہونا آہستہ آہستہ):
بولتے رہنا لکھتے رہنا گاتے رہنا لکھتے جانا بہتے جانا پڑھتے جانا
جلتے دیکھنا آتے دیکھنا مارتے جانا ڈھانپتے جانا (چھوٹے کپڑوں کو...)
دیکھتے جانا کہتے جانا کھاتے جانا
(مادّہ جنس اور تعداد سے متاثر ہوتا ہے)

(3) ماضیِ مطلق سے مل کر بننے والے مرکب افعال (ض + ف)

(الف) Habituatives (عادت): بولا کرنا رویا کرنا مارا کرنا
آیا کرنا کہا کرنا سنوارا کرنا پڑا پھڑکنا (بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے)

(ب) (تسلسل): پیے جانا کیے جانا بھاگے جانا ہنسے جانا
روئے جانا بکے جانا (پان) چبائے جانا

(ج) Continuatives-C (فعل کا جاری رہنا اور ختم ہونا): پڑے رہنا کھڑے رہنا بیٹھے رہنا (مادہ جنس اور تعداد سے متاثر ہوتا ہے)

(د) Desiratives (خواہش): مسکرایا چاہنا (وہ ظالم مسکرایا چاہتا ہے)
بولا چاہنا کیا چاہنا ہوا چاہنا (ترے کوچے میں کچھ ہوا چاہتا ہے)

(ہ) مقدور: کیا جانا دیا جانا باندھا جانا چلا جانا اٹھا جانا آیا (نہیں) جانا سویا (نہیں) جانا

(4) مصدر سے مل کر بننے والے مرکب افعال (ص + ف)

(الف) Inceptives (کام کا شروع ہونا): بولنے لگنا رونے لگنا مارنے لگنا کھانے لگنا کرنے لگنا سننے لگنا

(ب) Permissives (اجازت): بولنے دینا کھانے دینا آنے دینا اڑنے پانا (اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے) ملنے پانا جانے دینا

(ج) خواہش: آنا چاہنا جانا چاہنا لکھنا چاہنا رونا چاہنا

(5) مضارع سے مل کر بننے والے مرکب افعال (ع + ف)

Continuatives - D (فعل کا تسلسل): کہے جانا بکے جانا روئے جانا

اس خاکے میں صرف خاص خاص افعال کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض صرف خاص حالتوں اور بعض صرف خاص زمانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اکثر امدادی افعال کے بغیر استعمال ہوتے ہیں، لیکن بعض نہیں بھی ہوتے۔ ان سب کا احاطہ کرنے کی یہاں کوشش نہیں کی گئی۔ اردو میں مرکب افعال کا استعمال بہت متنوع اور خاصا پھیلا ہوا ہے۔ ان سے بننے والے محاوروں اور ترکیبوں کی تعداد بلاشبہ ہزاروں تک پہنچے گی۔ یہاں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے، یہ محض اس ضرورت کا اظہار ہے کہ اگر افعال کو ان کی ساخت کے اعتبار سے پیش کیا جائے تو انھیں سمجھنا اور سمجھانا نسبتاً آسان ہے، اور ان کا تجزیہ سائنسی حتمی صحت سے کیا جا سکتا ہے۔

(1965)

اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک-I

جتنا گہرا رشتہ اردو اور ہندی میں ہے شاید دنیا کی کسی دو زبانوں میں نہیں۔ دونوں کی بنیاد اور ڈول اور کینڈا بالکل ایک ہیں، یہاں تک کہ کئی بار دونوں زبانوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہوئیں جس کے بعد دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا اور دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آگئیں۔ اگرچہ ہندی اپنا فیضان سنسکرت سے اور اردو پراکرتوں کے علاوہ عربی اور فارسی سے حاصل کرتی ہے جس کی وجہ سے لفظیات میں خاصا فرق ہے، تاہم نسبتی اعتبار سے سگی بہنیں ہونے کی وجہ سے دونوں میں گہرا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں ہم اسی اشتراک پر اپنی توجہ صرف کریں گے۔

دونوں زبانوں کا جدامجد اِنڈِک ہے۔ ہزاروں سال پہلے جب آریہ ہندوستان آئے تھے تو وہ اِنڈِک زبان بولتے تھے جس میں چاروں وید لکھے گئے۔ اس کے معیاری روپ کو سنسکرت کا نام دیا گیا۔ اِنڈِک کے ساتھ ساتھ پراکرتوں کا ظہور ہوا اور پراکرتیں رواج اور چلن سے بدل کر اپ بھرنشیں بنیں۔ بودھوں اور جینیوں کا زیادہ تر ادب انھیں پراکرتوں وغیرہ میں ملتا ہے۔ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد سیاسی نقشے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تہذیبی اور لسانی نقشے میں بھی تیزی سے تبدیلیاں ہونے لگیں۔ عربی، فارسی اور ترکی کے اثر سے ہزاروں نئے لفظ اپ بھرنشوں میں داخل ہونے لگے اور اس طرح لین دین اور روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے ایک ملی جلی ریختہ زبان سامنے آنے لگی۔ شمالی ہندوستان میں اس وقت شورسینی اپ بھرنش کا دور دَورہ تھا جبکہ سندھ، ملتان، بہاول پور وغیرہ میں کیکئی اپ بھرنش رائج تھی۔ انھیں دو اپ بھرنشوں اور اُن کی بولیوں نے

مل کرنئی ہندوستان گیرملواں زبان کے لیے کھاد کا کام دیا ہوگا۔

شمالی ہند میں سندھ کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا پہلا باقاعدہ سابقہ پنجاب کے میدانوں میں ہوا۔ غزنویوں کی راجدھانی لاہور تھی۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پنجاب میں آباد ہوگئی، اور تہذیبی میل جول کے ساتھ لسانی اخذ و قبول اور اختلاط و ارتباط بھی شروع ہوگیا۔ غزنوی سلاطین کی حکومت پنجاب میں تقریباً ڈیڑھ سو سال رہی۔ ترک اور افغان ترکی، دری اور پشتو بولتے ہوئے آئے تھے، لیکن ان کی تہذیبی اور سرکاری زبان فارسی تھی جس کا اثر مقامی بولیوں پر پڑنے لگا۔ چنانچہ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکجائی سے ایک نئی مِلواں زبان کا پیدا ہوجانا بالکل فطری بات تھی۔ اس زبان کو اس زمانے میں ''ہندوی'' کہا گیا۔ یہ موجودہ ہندی اور اُردو کی ماں رہی ہوگی۔ اس زبان کی پیدائش کا سب سے بڑا ثبوت غزنوی دور کے فارسی شاعر مسعود سعد سلمان کا وہ کلام ہے جو محفوظ نہیں رہا، لیکن محمد عوفی نے اپنے تذکرۂ لباب الالباب اور امیر خسرو نے اپنے فارسی دیوان ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مسعود سعد سلمان ''ہندوی'' میں شعر کہتے تھے۔

غزنویوں کے بعد غوریوں کی حکومت شروع ہوئی تو راجدھانی لاہور نہیں بلکہ دہلی قرار پائی۔ اسی سے ہندی اور اردو زبان کی ملی جُلی ابتدائی تاریخ کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ غوری کے حملوں کے بعد پنجاب سے عوام کی بڑی تعداد دہلی کی طرف چلی گئی اور اپنے ساتھ اس نئی زبان ''ہندوی'' کو بھی لیتی گئی جو غزنویوں کے زمانے میں وجود میں آچکی تھی اور جو ''زبانِ لاہوری'' یعنی پنجابی سے مختلف تھی۔ دہلی کے گرد و نواح میں اس زمانے میں شورسینی کی جو قدیم بولیاں رائج تھیں، ان میں سے کھڑی، ہریانی اور برج خاصی اہم تھیں۔ چونکہ پنجابی، کھڑی اور ہریانی سے قریب تھی، اس لیے پنجاب سے آنے والوں کو برج کی نسبت کھڑی اور ہریانی میں زیادہ اپنائیت محسوس ہوئی۔ اس طرح سیاسی مرکزِ ثقل دہلی منتقل ہوجانے سے زبان کی ابتدائی تاریخ پر زبردست اثر پڑا۔ اس وقت نئی زبان کی

حالت ایک ایسی دھات کی تھی، جو کسی بھی سانچے میں ڈھالی جاسکتی ہے۔ پنجابی اور لہندا کا اثر تو نئی زبان پہلے ہی قبول کرچکی تھی، دہلی آنے کے بعد اس نے کھڑی، برج اور ہریانی بولیوں کے عناصر سے اپنی حدود کو مزید وسیع کرنا شروع کردیا۔

ہندی اور اُردو کی مشترک نشوونما کی تیسری کڑی اس نئی ملی جلی زبان کا تیرھویں اور چودھویں صدی میں دکن پہنچنا تھا۔ دکن کی فتح تو خلجیوں کے زمانے میں ہوگئی تھی، لیکن نئی زبان کے دکن میں جڑ پکڑنے کی نوبت اس وقت پیش آئی جب محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان کی آبادی کو دہلی سے دولت آباد لے جایا گیا۔ دہلی کے عوام بہت بڑی تعداد میں وہاں پہنچے اور قدرتاً نئی زبان کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ حسن گنگو کے بہمنی خاندان کے بعد اس زبان کو قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کی سرپرستی حاصل رہی اور اس نے خاصی ترقی کی۔ چودھویں سے سولھویں صدی تک کے اس زمانے میں یہ زبان جو شمالی ہندوستان کی ''ریختہ'' کے مقابلے میں ''گجری'' اور ''دکنی'' کہلاتی تھی، اب باقاعدہ شعر و ادب کی زبان کی حیثیت سے سامنے آنے لگی۔ اس کے شاعروں میں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، غواصی، مقیمی اور ابنِ نشاطی، فائز، ولی اور سراج خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جن کی غزلیں اور مثنویاں قدیم اردو کا شاندار سرمایہ ہیں اور جس کو ہندی والے بھی اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان تخلیقات کی زبان پراکرتوں سے خاصی قریب تھی۔ اس کو نہ خالص ہندی کہا جاسکتا ہے نہ خالص اردو۔ اس میں ابتدائی زبان کی ایک ایسی معصومیت، سادگی اور گھلاوٹ ہے جو بعد کی زبان میں نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر محمد قلی قطب شاہ کے یہ شعر دیکھیے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تِل جیا جائے نا

کہے تے پیا بن صبوری کروں
کہیا جائے امّا کیا جائے نا

نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے
کدھیں اس سے مِل بیسیا جائے نا

قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

یہی رنگ اس زمانے کی نثر میں بھی ملتا ہے۔ شروع کے کئی مصنفین نے نثر کو

مذہبی کاموں کے لیے استعمال کیا۔ اس دَور کی نثر میں بھی ہندی اردو کا ملاجلا انداز ملتا ہے جس کا بہترین نمونہ مُلا وجہی کی ''سب رس'' ہے۔ ''سب رس'' کی زبان ملے جلے ہندی اردو اسلوب کی بے نظیر مثال پیش کرتی ہے :

> ''دانا کوں یاں کیا چارا۔ نادان کی سمج میں اندھارا۔ سمجیا سوپایانئیں سمجیا سو گنوایا۔ جکوئی اس شراب کی مستی نئیں سمجیا، سو اس شراب کی مستی کیا جانے ... شراب کوں آپے پینا نہ یوں اچھا کہ شراب آپ کوں پیوے۔ جو شراب اِسے پیا، خراب کیا تو یو کیوں جیوے۔ گھانس آگ پر کھانے جائے تو جلنا، مچھلی خشکی پر پڑے تو تلمنا۔ چمتی، ہتی کا بھار اُچا سکتی ہے؟ ... کنکر ڈونگر کی برابری کرے گا؟ تارا چاندسوں ہم بھرے گا؟ دیوا آفتاب کے سمنکھ آئے گا؟ شرار شعلے پر موں بھائے گا؟ شراب پر ہر کوئی ہم نہیں بھاتا ... عاشق کی عبادت حسن دیکھنا، راگ سنہنا، شراب پینا ہے''۔

دکن کے مقابلے میں شمالی ہندوستان میں ہندی اور اردو کو پوری طرح سامنے آنے میں ابھی مزید انتظار کرنا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سرکاری زبان فارسی تھی اور وہی تہذیب و معاشرت اور شعر و ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ پھر بھی عوامی ضرورتوں سے نئی ریختہ زبان کی نشوونما جاری رہی۔ ایک ملی جلی عام بول چال کی زبان کی زیادہ ضرورت بازاروں، قلعوں، لشکرگاہوں، درباروں اور خانقاہوں میں پڑتی تھی۔ چنانچہ لشکر یا لشکرگاہ یعنی قلعہ بازار کی رعایت سے اس نئی زبان کو جو کبھی ''ہندوی'' کہلاتی تھی، کبھی ''ریختہ'' اور کبھی ''دکنی'' اب ''اردو'' کہا جانے لگا۔ بعض لوگوں نے اسے ''زبانِ ہندوستان'' بھی لکھا ہے، یعنی ہندوستان کی بولی اور اسی نسبت سے اسے ہند کی بولی یعنی ''ہندی'' بھی کہنے لگے۔ شمالی ہندوستان میں اس زبان کے پہلے مستند نمونے امیر خسرو کی شاعری میں ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کا بڑا حصہ سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا ہے، جس سے ان کی شکل میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوگئی ہوگی۔ تاہم اس کے مستند حصوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہندی اور اُردو کا روپ کیسا تھا۔ امیر خسرو کو ہندی اور اردو والے دونوں اپنا پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے یہ چند شعر دیکھیے :

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھوں دیس

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
مُنج جلتی جنم گیو تیرے لیکھن باؤ

بالا تھا جب سب کو بھایا؛ بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا آس کا ناؤں؛ ارتھ کرو نہیں چھوڑوں گا ٹو

یہی وہ زبان تھی جسے بھگتوں، صوفیوں، سنتوں اور جوگیوں نے اپنے اپنے کلام اور نغموں سے آگے بڑھایا، کیونکہ یہی وہ زبان تھی جس کے ذریعے وہ عوام کے دلوں تک پہنچ سکتے تھے۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات میں اس کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ کرشن بھگتوں نے اپنے علاقے کے وسیع چلن کی وجہ سے برج بھاشا کا سہارا لیا، لیکن نرگن وادی بھگتوں کے کلام میں کھڑی یعنی پُرانی ہندی کے نقوش مل جاتے ہیں۔ کبیر داس کہتے ہیں:

ماٹی کہے کمہار سے تو کا رَوندھے موئے
اک دن ایسا ہوئے گا میں رَوندھوں گی توئے

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوے پٹ بھیتر آئے کے ثابت گیا نہ کوئے

جاکو راکھے سائیاں مار سکے نہیں کوئے
بال نہ بانکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے

گرونانک کی شاعری میں بھی اسی زبان کا روپ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے:

میٹھے کو کڑوا کہیں، کڑوے کو میٹھا
رانے کو نندا کریں ایسا کل ماہیں ڈیٹھا

اسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی بعض بولیوں میں باقاعدہ شاعری کا آغاز بھی ہوگیا تھا یعنی اودھی میں ملک محمد جائسی اور تلسی داس، برج میں سورداس اور راجستھانی میں میرابائی۔ ان شاعروں کو ہندی کی ادبی روایت میں کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔ سترھویں صدی میں جب شاہ جہاں نے دہلی کو نئے سرے سے بسایا تو اردو کے چلن کو ایک معیاری درجہ ملنے لگا، اور یہ زبان ادبی حیثیت سے سامنے آنے لگی۔ اس وقت فارسی کا زور ٹوٹ رہا تھا، چنانچہ رفتہ رفتہ اورنگ زیب کے بعد اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہونے لگا۔ اس کے بعد اردو، ہندی کے لسانی دھارے جو اب تک ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے، کچھ الگ الگ ہو کر آگے بڑھنے لگے اور ہندی اردو دو ادبی زبانوں کی حیثیت سے سامنے آنے لگیں، حتیٰ کہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں کچھ ہمارے عمرانی تقاضوں کی وجہ سے اور کچھ برطانوی سامراج کی حکمت عملی کی وجہ سے اور آغاز انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کے اردو اور ہندی میں الگ الگ نصاب بنانے کی وجہ سے ہندی اور اردو میں ایک خلیج پیدا ہوگئی جو بعد میں بڑھتی چلی گئی۔

اوپر ہندی اور اردو کے مشترک تاریخی پس منظر کی جو جھلک پیش کی گئی اس سے ظاہر ہے کہ ان دونوں زبانوں نے ابتدائی ارتقا کے دوران میں مل جُل کر برج، ہریانی، پنجابی اور لہندا کئی بولیوں سے استفادہ کیا، لیکن دونوں نے سب سے زیادہ طاقت کھڑی سے حاصل کی۔ اس کے بعد ہندی اور اردو اگرچہ الگ الگ دو زبانیں بن گئیں، لیکن چونکہ دونوں کا معیاری روپ کھڑی پر قائم ہے، اور چونکہ دونوں کی ابتدائی تاریخ کئی صدیوں تک ایک رہی ہے، اس لیے جتنا اشتراک اِن دونوں کی آوازوں، اور صرفی ونحوی ڈھانچے اور روزمرہ ومحاورے میں آج بھی پایا جاتا ہے، شاید ہی دنیا کی کسی دو زبانوں میں پایا جاتا ہو۔

سب سے پہلے آوازوں پر نظر ڈالیے۔ اردو کی تقریباً چالیس آوازوں میں صرف چھ ایسی ہیں جو فارسی عربی سے لی گئی ہیں، باقی سب کی سب ہندی اور اردو میں مشترک ہیں۔ خاص طور سے سادہ اور ہکار بندشی آوازیں بھ، پھ، تھ، دھ، کھ،

گھ، چھ، جھ وغیرہ بیس کی بیس پورے سٹ کی حیثیت سے ہندی اور اردو میں تو موجود ہیں، لیکن ایسا سٹ نہ فارسی میں ہے نہ عربی میں۔ اس کے علاوہ معکوسی آوازیں یعنی ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ اور ڑھ بھی ہندی اور اردو میں مشترک ہیں، سوائے ݨ کے جس کو پراکرتوں کے تدبھو رجحان کے تحت اردو والے سادہ بنا لیتے ہیں، گویا گنتی کی چند آوازوں کو چھوڑ کر اردو اور ہندی کے مصمتوں کا ڈھانچہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ مصوتوں میں تو صوتی ہم آہنگی سو فی صدی ہے۔ ہندی اور اردو دونوں کے بنیادی مصوتے دس ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔

اب صرف ونحو کو لیجیے۔ اگر یہ کہا جائے ''آپ کا نام کیا ہے؟'' یا ''آپ کہاں جائیں گے؟'' یا ''کیا آپ میری باتیں سن رہے ہیں؟'' یا ''باہر اندھیرا ہے'' یا ''اس وقت کیا بجا ہے؟'' یا ''ارے بھئی کیا بات ہے اس کی'' تو یہ ہندی بھی ہے اور اردو بھی۔ لفظوں کا فرق ہوسکتا ہے لیکن جملے میں لفظوں کی ترتیب بالکل ایک سی ہے۔ تذکیر و تانیث کا جو فرق اردو اور ہندی میں خال خال ہے یا روزمرہ کی وجہ سے اگر کوئی اختلاف کہیں جھلک جاتا ہے تو وہ ہندی اور اردو سے مخصوص نہیں، بلکہ ایسا فرق تو دو بولیوں میں بھی راہ پا جاتا ہے۔

جملے کی جان تین چیزیں ہوتی ہیں۔ اسم، اسمِ صفت اور فعل۔ بہت سے اسم اور صفت تو ہم نے فارسی عربی سے لیے، لیکن اردو فعل کا ہمارا سرمایہ سارا کا سارا مشترک ہے۔ فعل کے بغیر جملے کا تصور کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، لینا، دینا، آنا، جانا، گانا، رونا، دھونا، رہنا، سہنا، سینکڑوں ہزاروں فعل جیسے ہندی میں ہیں، ویسے ہی اردو میں۔ افعال زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ ان ہزاروں افعال کو دیکھ کر جو ہندی اور اردو میں یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں، یہ ایمان لانا پڑتا ہے کہ ہندی اور اردو دو جڑواں بہنیں ہیں جو آزادانہ طور پر ارتقا پذیر ہیں، لیکن دونوں کی ریڑھ کی ہڈی غیر مرئی طور پر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ اردو کا دامن اس لحاظ سے اور بھی وسیع ہے کہ اس نے عربی فارسی لفظوں سے بھی ہندستانی قاعدے کے مطابق کئی نئے فعل بنائے جنھیں بعد میں ہندی نے بھی قبول

کیا۔ مثلاً بدلنا، فرمانا، شرمانا، رنگنا، خریدنا، آزمانا، بخشنا، تراشنا، داغنا، گزرنا، لرزنا، ستانا، نرمانا، گرمانا، نوازنا، قبولنا، کفنانا، دفنانا، خرچنا وغیرہ۔

یہی معاملہ مرکب افعال کا ہے جو دونوں زبانوں میں یکساں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً بنا دینا، گر پڑنا، اڑنے پانا، چلے آنا، ٹوٹ جانا، مار ڈالنا، گھر کرنا، سن لینا، بولا کرنا، کھانے دینا وغیرہ۔ ان افعال کی حیثیت دراصل محاوروں کی سی ہے جو فعل کے دو اجزا سے مل کر بنتے ہیں اور دونوں زبانوں میں بالکل ایک طرح سے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بھی اُردو اور ہندی کی مشترکہ خصوصیت ہے کہ مرکب افعال جس کثرت سے ان دو زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

فعلیہ محاوروں کے علاوہ ایسے محاوروں کی تعداد بھی ہزاروں تک پہنچے گی جو اسم یا صفت کو ملا کر بنتے ہیں اور دونوں زبانوں میں یکساں طور پر رائج ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر یہاں صرف دو اسموں یعنی آنکھ اور منہ سے بننے والے محاوروں اور روزمرہ کی مثالیں دی جاتی ہیں — منہ رکھنا، منہ بنانا، منہ اترنا، منہ بگاڑنا، منہ پھیرنا، منہ پھلانا، منہ تکنا، منہ چڑھانا، منہ کھلوانا، منہ مارنا، منہ کی کھانا، منہ ٹیڑھا کرنا، منہ آجانا، منہ اٹھ جانا، منہ بند ہونا، منہ پر مہر لگنا، منہ پر مردنی چھانا، منہ بھر آنا، منہ بھرائی دینا، منہ پر تھوک دینا، منہ پر مارنا، منہ پر خاک اڑنا، منہ پر تالا لگنا، منہ لے کر رہ جانا، منہ تک جگر آنا، منہ توڑ جواب دینا، منہ میں پانی بھر آنا، چھوٹا منہ بڑی بات، منہ در منہ کہنا، منہ دکھانے کے قابل نہ رہنا، منہ دھو رکھنا، منہ میں تنکا لینا، منہ دیکھتے رہ جانا، منہ ذرا سا نکل آنا، منہ لال ہو جانا، منہ پر بسنت پھولنا، منہ میں گھنگنیاں بھرنا، منہ سی دینا، منہ سے دودھ کی بو آنا، منہ کالا کرنا، منہ کو خون لگنا، منہ کے بل گرنا، منہ دیکھے کی پریت، منہ سے بولنا سر سے کھیلنا، منہ مانگی موت بھی نہیں ملتی، منہ کا میٹھا پیٹ کا کھوٹا، منہ کھائے آنکھ شرمائے، منہ پھٹ، منہ چور، منہ چٹ، منہ دکھلائی، منہ مانگے دام، منہ بولا بھائی۔

اب آنکھ سے بننے والی ترکیبوں کو بھی ایک نظر دیکھ لیجیے: آنکھ آنا، آنکھ اٹھانا،

آنکھ لڑنا، آنکھ بچانا، آنکھ بدلنا، آنکھ بنوانا، آنکھ پتھرانا، آنکھ پھڑکنا، آنکھ پھوٹنا، آنکھ پھوڑنا، آنکھ پھیرنا، آنکھ جھکنا، آنکھ چرانا، آنکھ ہلنا، آنکھ لجانا، آنکھ لگنا، آنکھ مارنا، آنکھ ملانا، آنکھیں نکالنا، آنکھیں بچھانا، آنکھیں بھر آنا، آنکھیں ٹھنڈی ہونا، آنکھیں روشن ہونا، آنکھیں موند لینا، آنکھوں میں رات کاٹنا، آنکھوں میں سمانا، آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا، آنکھوں میں پھرنا، آنکھوں میں چبھنا، آنکھوں میں چڑھنا، آنکھوں سے لگا لینا، آنکھوں کا پانی ڈھلنا، آنکھوں کے آگے اندھیرا آنا، آنکھوں پر قدم لینا، آنکھوں میں لہو اترنا، آنکھوں سے اوجھل ہونا، آنکھوں سے گر جانا، آنکھیں نیلی پیلی کرنا، آنکھیں کھل جانا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا، آنکھیں چار ہونا، آنکھیں دکھانا، آنکھیں مٹکانا، آنکھوں پر بٹھانا، آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا، آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا، آنکھ اونچی نہ ہونا، آنکھ بند کر کے کچھ دینا، آنکھ بھر کر نہ دیکھنا، آنکھ پر پردہ ڈالنا، آنکھیں ٹھنڈی کرنا، آنکھ سے آنکھ ملانا، آنکھ سے لہو ٹپکنا، آنکھ کا پانی ڈھلنا، آنکھ کا کاجل چرانا، آنکھ کی پُتلی کا پھرنا، آنکھ میلی نہ کرنا، آنکھ نہ جمنا، آنکھ نیچی کرنا، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل، آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا، آنکھ کا تارا، آنکھ مچولی، آنکھوں آنکھوں میں، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، آنکھوں کے ناخن تو لو۔ یہ صرف دولفظوں سے بننے والے محاوروں اور مرکبات کی ایک جھلک ہے۔ مکمل فہرست اس سے کئی گنا بڑی ہوگی۔ اسی سے بعض کثیرالاستعمال الفاظ سے بننے والے ہزاروں دوسرے محاوروں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جو دونوں زبانوں کے مشترک سرمایے کا بیش قیمت حصہ ہیں۔

اُردو نے فارسی عربی الفاظ کو ہندی لفظوں کے ساتھ ملا کر سینکڑوں نئے مرکب بنائے جو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈاک خانہ، راج دربار، بے کل، بدچلن، شرمیلا، رنگیلا، پان دان، عجائب گھر، بے دھڑک، چٹھی رساں، چوہے دان، گلاب جامن، جگت استاد، سبزی منڈی، گھوڑسوار، جیب کترا، دل لگی، سمجھ دار، سدا بہار، گھر داماد، گھڑی ساز، چڑی مار، تھانہ دار، پھول دان، بے گھر، کلاکار، تھڑدِلا، گرہ کٹ، بے ڈھب، گلے باز، لنگوٹیا یار، کمرکس،

جوشیلا، منہ زور، بے ڈول، شور بے چٹ، ڈھل مل یقین، بے سُرا، درشنی جوان، ٹکرگدا، دیوانہ پن، سنسنی خیز، کوڑھ مغز، من مست، بے بس، جیب گھڑی، کفن چور، بے چینی، لم قدا، اٹھتی جوانی، بے ڈھنگاپن، کٹوردان، بے لاگ، سنگار دان، گوند دانی، بے ٹھکانہ، پرسال، ترسال، تماہی، تپائی، تراہا، تسالہ، چوپایہ، چوراہا، چوگرد، چارپائی، چوگوشیہ ٹوپی، مٹرگشت، چومہری، سرچڑھانا، سرڈوب، سَر ڈھکی، سرمنڈا، سرتوڑ، لاپتہ، لاپرواہی، لاچاری، ناملنسار، نوچندی، نوسکھ، امام باڑہ، اٹکل باز، دل لگی باز، اکڑباز، دھوکے باز، دغاباز، بٹیرباز، پتنگ باز، پٹے باز، چوسر بازی، پھکڑباز، گاڑی بان، رتھ بان، بلّم بردار، ہتھیار بندی، بھج بند، لنگوٹ بند، تلوار بندی، لنگوٹیا یار، تک بندی، جکڑ بند، چھپر بندی، کھر بندی، مینڈھ بندی، ناکہ بندی، پاجی پرست، کنبہ پرور، بسنتی پوش، پلنگ پوش، بیاج خور، بل دار، بیل دار، بھڑک دار، پتی دار، پہرے دار، پھل دار، چمکدار، تورے دار، تھوک دار، ٹوپی دار بندوق، ٹھیکے دار، جالی دار، پھولدار، جوڑی دار، جھالردار، دھاری دار، چھلکے داری، ڈیوڑھی دار، لچھے دار، لیس دار، تھوک فروش، پھل کاری، کدوکش، گھیاکش، مٹرگشت، پیچوان، نشیلا، نکیلا، جوشیلا، خرچیلا، شوروغل، باغ باڑی، تارگھر، گولر کباب، بال صفا، پنچ فیصلہ، دھن دولت، کاغذ پتر، شادی بیاہ، عید ملاپ، نقدی چٹھا، موتی محل، موتی مسجد، گل تکیہ، کفن چور، عمرپٹہ، چورمحل، دماغ چٹ، پلنگ توڑ، جیب کترا وغیرہ۔

اردو اور ہندی کی بنیادی لفظیات (Basic Vocabulary) کی جامع فہرست تیار کی جائے تو اس میں فعلی مادوں (آ، جا، سو، دھو، اُٹھ، لکھ وغیرہ) مصادر (کھانا، پینا، جانا، رہنا، سونا، گانا وغیرہ) فعلیہ ترکیبوں (لکھ کر، گرتے پڑتے، کرسکنا، بول چکنا، آگیا ہوگا وغیرہ) اور فعلیہ لاحقوں (ہے، ہو، ہوں، ہیں، تھا، تھے، تھی، تھیں، جیو، جیئے، گا، گے، گی) کے علاوہ جو الفاظ لازمی طور پر جگہ پائیں گے وہ ہیں حروف جار (نے، سے، پر، تک، کا، کے، کی، کو، میں) حروف حصریہ (ہی، بھی، تو) کلمات استفہامیہ (کیوں، کب، کہاں، کیسے، کدھر، کس، کن) کلمات تشبیہہ (ایسے، جیسے، ویسے) کلماتِ اشاریہ (اِدھر، اُدھر، یہاں، وہاں، جہاں) کلماتِ زمانی (اب، جب،

تب، ابھی، جبھی، تبھی، کبھی) شخصی و غیر شخصی ضمائر (میں، ہم، تو، تم، آپ، وہ) اور ان کی تصریفی شکلیں (مجھ، تجھ، اس، میرا، تیرا، ہمارا، تمھارا، انھیں، ہمیں، سبھی)، اعداد بنیادی (Cardinal Numbers) (ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ وغیرہ) اعدادِ توصیفی (Ordinal Numbers) (پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، آٹھواں وغیرہ) اسی طرح سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں، کھربوں تک یہ ہزاروں لفظ ہندی اور اردو میں ایک ہیں۔ ان میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ یہی معاملہ ''واہ واہ'' اور ''ہائے ہائے'' کا ہے۔ سینکڑوں گالیاں جو قدرتی طور پر منہ سے نکلتی ہیں، دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ جسم کے اعضا کے ناموں میں بھی زبردست اشتراک پایا جاتا ہے۔ سر، ماتھا، آنکھیں، ناک، کان، ہونٹ، گردن، منہ، ہاتھ، پاؤں، بانہیں، ٹانگیں، پیٹ، پیٹھ، کمر، چھاتی، گھٹنا، کہنی، ایڑی وغیرہ پر ہندی اور اردو دونوں کا حق ہے۔ غرض بنیادی لفظیات دونوں زبانوں کی سو فی صد نہ سہی، ننانوے فی صد تو یقیناً ایک ہے۔

اس سلسلے میں تلمیحوں اور کہاوتوں کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اگرچہ اردو نے اپنی تلمیحیں زیادہ تر اسلامی روایات سے لی ہیں لیکن بعض تلمیحیں مثلاً کرشن، رادھا، رام، لچھمن، سیتا، راون، ارجن، بھیم، ہیر، رانجھا وغیرہ ہندستانی روایتوں سے بھی آئی ہیں۔ تلمیحوں سے کہیں زیادہ دونوں زبانوں کا اشتراک کہاوتوں میں جھلکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندی اور اردو میں سینکڑوں ایک ہی طرح کی کہاوتیں استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً جیسا دیس ویسا بھیس، لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا، ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھنا، دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا، مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، جاکو راکھے سائیاں مار نہ سا کے کوئے، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، گھر کی مرغی دال برابر، چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات، مُلا کی دوڑ مسجد تک، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، یہ منہ اور مسور کی دال، دو مُلاؤں میں مرغی حرام، ٹیڑھی کھیر، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی، چور کی داڑھی میں تنکا، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، منہ میں رام رام

بغل میں چھری، آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں، ایک انار سو بیمار، آج مَرے کل دوسرا دن، رسّی جل گئی پر بَل نہیں گیا، دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے، جوگی کس کے میت، اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، دور کے ڈھول سہاونے، کہاں راجا بھوج کہاں گنگو تیلی، کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا، بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی، میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی، ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا، بگلا بھگت، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی وغیرہ ان سینکڑوں کہاوتوں میں سے ہیں جو اردو اور ہندی میں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔

سید احمد دہلوی مؤلف ''فرہنگ آصفیہ'' کے اندازے کے مطابق اردو کے پچپن ہزار الفاظ کے سرمائے میں تقریباً چالیس ہزار الفاظ ایسے ہیں جو سنسکرت اور پراکرتوں کے مآخذ سے آئے ہیں یا غیر زبانوں کے الفاظ کو اُردوا کر بنے ہیں۔ اس طرح اُردو کے ایسے الفاظ جو اردو اور ہندی میں مشترک ہیں تقریباً پچھتر فی صد یعنی اردو کے سرمائے کا تین چوتھائی حصہ ہوئے۔ دو زبانوں میں لسانی اشتراک کی یہ غیر معمولی مثال ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ اردو کا امتیاز ان ایک چوتھائی الفاظ سے قائم ہوتا ہے جو عربی فارسی اور ترکی کے سرچشمے سے آئے ہیں۔ اسی طرح اردو کی مخصوص چستی اور کھنک بھی سامی اور ایرانی ماخذ سے آئی ہوئی آوازوں سے پیدا ہوتی ہے، نیز لب و لہجہ اور تذکیر و تانیث کے جزوی اختلافات بھی ہیں، پھر بھی کسی دو زبانوں میں تین چوتھائی الفاظ کا مشترک ہونا، فعلیہ ڈھانچہ کا ایک ہونا، بنیادی لفظیات یعنی اعداد، ضمائر اور حروفِ جار کا ایک ہونا اور عوامی محاوروں اور کہاوتوں کا ایک ہونا لسانی اشتراک کی عجیب و غریب مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندی کی سب سے بڑی طاقت اردو ہے، اور اردو کی سب سے بڑی طاقت ہندی۔

(1973)

اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک -II

اردو اور ہندی کے رشتے کے بارے میں یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی ایک زبان ہیں یا دو زبانیں۔ بعض حضرات انھیں ایک زبان کے دو اسلوب بھی مانتے ہیں اور اسالیب کی اس تفریق کی ذمہ داری نئی بورژواژی کے سر ڈالتے ہیں جس نے دونوں کے بولنے والوں کو الگ الگ اپنی لسانی میراث کا احساس دلایا اور زبانوں کی راہیں الگ کر دیں۔ وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ بعض چیزوں کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ دونوں زبانوں کی ثقافتی ترجیحات کے سرچشمے الگ الگ تھے اور اس کے ذمہ دار خود ہم تھے، البتہ اس صورت حال کا استحصال کیا برطانوی سامراج نے۔ اپنے مفاد اور اقتدار کے پیش نظر غیر ملکی سامراج نے کس طرح ہندستانی تہذیبی منطقوں کی تفریق کو مضبوط کیا اور اس کا کتنا گہرا اثر ہندی اور اردو کی تفریق پر پڑا، اس کا اندازہ آج مشکل نہیں۔ رہے جاگیرداری کے اثرات، تو اردو نے تو آنکھ ہی جاگیرداری عہد میں کھولی تھی۔ لیکن اردو کی نشوونما صرف دربار سے متعلق نہیں رہی، خانقاہ اور بازار سے بھی اسے اتنا ہی ربط رہا ہے۔ اس عہد میں جو مشترک ہندستانی تہذیب کی فضا تیار ہو رہی تھی اور جس میں مذہبی واجبات سے قطع نظر معاشرتی، جمالیاتی اور سماجی سطح پر مل جل کر رہنے کی ایک مشترک تہذیبی فضا تیار ہو رہی تھی، اس میں ترسیلی رابطے کے طور پر زبان سے تو سروکار تھا، اس کے ناموں سے مطلب نہیں تھا۔ اس زمانے میں اردو کا ایک نام ہندی یا ہندوی بھی تھا۔ شمالی ہندوستان کی یہ ریختہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے تاریخی اور تہذیبی سابقے سے وجود میں آئی تھی، صوفیوں، سنتوں، فقیروں اور تاجروں کے ذریعے نہ صرف پورے شمال میں بلکہ جنوب میں گجرات اور دکن تک پھیل گئی

تھی۔ 'ریختہ'، 'ہندی'، 'ہندوی' کے علاوہ 'گجری'، 'دکنی'، 'اردو'، 'اردوے معلیٰ'، 'ہندستانی' سب اسی ایک ہی زبان کے مختلف نام تھے۔ تیرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک چھ صدیوں کے طویل عہد میں ہندستانی زبان کے اس نہایت وسیع لسانی دھارے میں کسی طرح کے تفرقے یا تنازعے کا کوئی جزر و مد نہیں ملتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ سلسلہ اس زمانے سے شروع ہوتا ہے جب انگریزی سامراج اپنے استحکام کے لیے ہندوستان کی تہذیبی زندگی میں دست درازی شروع کرتا ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ عہد وسطیٰ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تہذیبی یگانگت و رواداری اور اتحاد پسندی و موانست کے رشتے نہایت استوار تھے اور اس کا اثر نوزائیدہ زبان کی تشکیل اور ہیئت پر بھی پڑ رہا تھا۔ جدید سیاسی شعور اور قومیت کے احساس کے ساتھ ساتھ تہذیبی منطقوں کا سوال شد و مد سے سامنے آیا، اور اسی کے ساتھ ساتھ رواداری اور اتحاد پسندی کے رشتوں پر کاری ضرب برطانوی سامراج نے لگائی جس کے ایک نہیں سینکڑوں شواہد موجود ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے اپنی حکمت عملی کے نتیجے کے طور پر جب مذہب، ذات، برادری، فرقہ، نسل، علاقہ ہر حربے کو استعمال کیا تو زبان تو سامنے کی چیز تھی اور تہذیبی سماجی شیرازہ بندی کا اہم ترین وسیلہ بھی تھی۔ چنانچہ اس کا زد میں آنا اور جھگڑے فساد کی جڑ بن جانا لازمی بات تھی۔ بہرحال اس کی جتنی ذمہ داری سامراجی حکمت عملی پر ڈالی جاسکتی ہے، اتنی ذمہ داری خود ہم پر بھی عاید ہوتی ہے۔

اردو اور ہندی کے لسانی رشتے کے بارے میں میں بعض بنیادی باتیں اپنے پہلے مضمون مطبوعہ 1973 میں بیان کرچکا ہوں۔ اگر ان میں سے کچھ کی تکرار ہوگی بھی تو محض ضمناً۔ اصل مقصد اس مبحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اردو کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ عام اندازے کے مطابق اردو کے ستر فیصد الفاظ پراکرتوں کے ذریعے سے آئے ہیں یعنی ہندی ہیں۔ باقی تقریباً تیس فیصد الفاظ عربی فارسی ترکی کے ہیں۔ ان مستعار الفاظ کی کل تعداد چودہ پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان لفظوں کو اردو نے کس طرح اپنی خراد پر اتارا اور

کس طرح انھیں اپنایا اس تاریخی عمل کے بارے میں معلومات زیادہ نہیں۔ اس بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ان لفظوں میں جو مخصوص آوازیں ہیں، اردو نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انھیں کس طرح اردوایا اور ہندوستانیایا۔ مثال کے طور پر اردو کے ذخیرۂ مستعار میں ذ، ز، ض، ظ کی آوازیں اصل کی رو سے اپنی اپنی حیثیت رکھتی ہیں یعنی عربی میں ان چار حروف کی چار مختلف آوازیں ہیں۔ اردو میں یہ سب آوازیں ایک ہوگئیں۔ اسی طرح کا سلوک اردو نے س، ث اور ص کے ساتھ بھی کیا ہے اور ان کا باہمی صوتی فرق بھی اردو میں زائل ہوگیا ہے۔ ت اور ط اور ح اور ہ کی آوازوں میں بھی اردو میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ سب کی سب آوازیں اردو نے ہندستانی نہج پر اتاری ہیں۔ عروض میں الف اور ع کے احکامات الگ الگ سہی لیکن عام تلفظ میں اردو کے تمام مصوتے جو الف کے ساتھ لکھے جاتے ہیں وہ ع کے ساتھ بھی وارد ہوتے ہیں اور الف اور ع کا صوتی فرق نہ ہونے کے برابر ہے۔ چھوٹے مصوتوں کا معاملہ اس سے بھی دلچسپ ہے۔ مستعار لفظوں کے چھوٹے مصوتوں میں ایسی ایسی کایا پلٹ ہوئی ہے کہ باید و شاید۔ اصل ترکیب جدوجہد ہے یعنی بالکسرِ اول، عام طور پر جدوجہد یعنی بالفتحِ اول بولا جاتا ہے۔ اصل لفظ رفعت ہے بالکسر رے لوگ رفعت بالفتح رے بولتے ہیں۔ اصل اسلوب ہے بالضمۂ الف، اکثر و بیشتر لوگ اسلوب کہتے ہیں یعنی بالفتح الف۔ یہی معاملہ حضور اور بزرگ کا ہے۔ اصل لفظ تجربہ ہے بسکون جیم و بالکسر رے جبکہ بالضمۂ رے و بالفتح رے بھی سنائی دیتا ہے۔ اصل ورثہ بالکسر واؤ تھا۔ اردو میں بالفتح واؤ بولا جانے لگا۔ اصل عقل اور دخل اکثر بہ حرکت دوم بولے جاتے ہیں، اگرچہ محتاط گفتگو میں نہیں۔ لیکن محتاط سے محتاط اور بڑے سے بڑا پڑھا لکھا بھی غدر یا بدر کو جو اصلاً بسکون دال ہیں بہ حرکت دال پڑھتا ہے یعنی غدَر کی بات یا بدَر صاحب۔ البتہ اصل کا احترام ترکیب میں واجب ہو جاتا ہے یعنی بدرالدین طیب جی۔ غرض اس طرح کی سینکڑوں مثالیں ہیں جن میں مصوتوں کی یا تو نوعیت بدل گئی ہے یا ان کا مقام بدل گیا ہے۔ یہ سب اردوانے کے ہندستانی عمل کا کرشمہ ہے۔ ایسا گرامر میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً ہم امیر،

وزیر، فقیر کی جمع امیروں، وزیروں، فقیروں بھی بولتے ہیں اور ان کی مستعار جمع امرا، وزرا اور فقرا بھی استعمال میں لاتے ہیں۔ لیکن ہر مستعار لفظ پر یہ دہرا قاعدہ لاگو نہیں ہوتا۔ مثلاً صندوق عربی لفظ ہے لیکن اس کی عربی جمع صنادیق ہم کبھی استعمال نہیں کرتے اور ہمیشہ ہندی صندوقوں ہی لکھتے بولتے ہیں۔ اسی طرح شمس عربی میں مؤنث ہے اسے اردو میں ہندی سورج کی وضع پر مذکر بولا جاتا ہے۔ ہندیانے کے اس عمل کا اثر تلفظ اور گرامر کے علاوہ معنی کی تبدیلیوں پر بھی پڑا ہے مثلاً عرصہ جگہ کے معنی میں تھا جیسے عرصہ تنگ ہونا لیکن عام طور پر ہم عرصہ کو وقت اور مدت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح امیر کے اصل معنی حاکم یا سردار کے تھے اور غریب کے معنی اجنبی کے۔ ہم ان لفظوں کو روپے پیسے والے اور مفلس کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ گلاب گل کے عرق کے معنی میں تھا خاص پھول کے لیے گل تھا۔ ہم نے اسے پھول کی پتیوں سے نچوڑے ہوئے عرق سے ہٹا کر پھول کے معنی عطا کر دیے۔ اب گلاب پھولوں کا بادشاہ ہے۔ اسی طرح مرغ کوئی بھی پرندہ تھا ہم نے اسے خاص پرندے سے منسوب کر دیا اور اس سے مرغا اور مرغی بھی بنا لیے۔

اصل لفظ مصالح تھا، اس سے مصالحہ بنا، صلح سے جو امن اور اچھائی کے معنی میں تھا۔ اردو میں ''مصالحہ'' کھانوں میں کام آنے والے ''مسالا'' کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اسی طرح ''تکلیف'' کو ایرانی فرض اور ذمہ داری کے معنی میں بولتے ہیں، ہم زحمت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ''خفا'' کے معنی ''گلا'' گھونٹنا ہیں، ہم ناراض ہونا کے لیے بولتے ہیں۔ ''ناخوشی'' ہم ناراضی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن اہل ایران نے ''ناخوشی'' کو بیماری کے معنی دے دیے ہیں۔ اسی طرح ''تیغ'' ہمارے یہاں تلوار ہے اور ایران میں استرے کے معنی میں رہ گیا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ہندستانی کانفرنس لکھنؤ کے خطبۂ صدارت میں ایک دلچسپ بات کہی تھی:

''ان فارسی الفاظ سے جنھیں ہم فارسی سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، اہلِ ایران اُن پر چونکتے ہیں اور ہماری ہنسی اڑاتے ہیں یعنی وہ الفاظ فارسی نہیں

رہے۔ ہم نے اردو میں ان کو دوسرے معنی دے دیے ہیں، اور اب وہ لفظ بالکل ہمارے ہوگئے ہیں۔ آپ ان کو اپنی زبان سے نکال دیجیے۔ آپ کے یہاں سے نکل کر وہ لفظ بالکل نکھرے ہوجائیں گے، کیونکہ فارسی یا عربی ان معنوں میں انھیں قبول نہ کرے گی''۔

اس بارے میں انھوں نے اپنے ذاتی تجربے سے ایک پرلطف مثال ''ظریف ومتین'' کی پیش کی۔ ظریف ہم اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کی طبیعت میں مذاق ہو یا جو خوش طبع ہو۔ متین ہم سنجیدہ آدمی کو کہتے ہیں۔ لیکن ایک ترکی اخبار میں انھوں نے ایک جوتا بیچنے والے کے اشتہارات دیکھے جو کہتا تھا کہ اس کے جوتے ''ظریف ومتین'' ہیں۔ یعنی کیا یہ جوتے بیک وقت مذاق بھی کریں گے اور نہایت متانت سے بھی پیش آئیں گے۔ لیکن اشتہار دینے والے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ وہ تو یہ اعلان کررہا تھا کہ اس کے جوتے ''ظریف'' یعنی آرام دہ بھی ہیں اور ''متین'' یعنی مضبوط بھی۔

معنوی تبدیلیوں کا یہ عمل قدم قدم پر ملتا ہے۔ اردو کا کمال یہ ہے کہ اس نے مستعار اور دیسی عناصر میں ایسا توازن پیدا کیا ہے کہ اس کی نظیر دوسری زبانوں میں آسانی سے نہیں ملتی۔ مثلاً روزمرہ ہی کو لیجیے۔ چشم بمعنی آنکھ اردو شاعری کی لفظیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

یہ جو چشمِ پُر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

چشم نرگس، چشم فسوں گر یا کیفیت چشم عام ترکیبیں ہیں لیکن اگر اردو میں کہنا ہو ''اس کی آنکھیں دُکھنے آئی ہیں'' تو یہاں آنکھیں کی جگہ چشم استعمال نہیں ہوتا۔ اردو اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ روزمرہ کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ غلط ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر کے نحوی ڈھانچے میں چشم کے استعمال کا محل نہیں۔

دل کا کوئی قصور نہیں ہے آنکھیں اس سے لڑ پڑیاں
مار رکھا سو ان نے ہم کو کس ظالم سے جا لڑیاں

آتش آگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن ''چولھے میں آتش جلادو'' اردو میں کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اردو روزمرہ کی رو سے یہ غلط محض ہے۔ اردو میں ہمیشہ ''چولھے میں آگ جلا دو'' ہی کہا جائے گا۔ اگر دیسی لفظ کا محل ہے تو دیسی لفظ ہی استعمال ہوگا مستعار اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ اردو کے لسانی تمول اور پختگی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ ذیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ پہلے میں آگ کا لفظ استعمال ہوا ہے دوسرے میں آتش کا۔ ایک کی جگہ پر دوسرے کا استعمال (قطع نظر ضرورت وزن) نحوی طور پر ممکن ہی نہیں۔ یہ سلیقے، روزمرہ اور مذاق سلیم کے خلاف ہوگا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

ظاہر ہے اردو مستعار اور دیسی لفظوں سے لامحالہ برابر کا سلوک کرتی ہے اور جہاں جس کا محل ہوتا ہے اسے استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس ہندی میں تدبھو کو چھوڑ کر تت سم کی طرف پلٹنے کا جو رجحان پایا جاتا ہے یا پراکرتوں کی سادگی کو تج کر سنسکرت کی اجنبیت کی طرف رجوع کی جو کوشش ہے یا عربی فارسی کے رچے بسے لفظوں کو کھدیڑ کر جس طرح چن چن کر مترادفات سجائے جاتے ہیں ان کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ زبان بوجھل بن جاتی ہے اور اپنی فطری سادگی اور روانی سے محروم ہوکر تصنع کا شکار ہوجاتی ہے۔

اب ایک نظر رسم الخط پر بھی ڈال لی جائے جس پر منگولوں کے ذریعے لادے جانے یا بدیسی ہونے یا تفرقے کی بنیاد ہونے کے کیسے کیسے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ اردو رسم الخط میں 36 حروف ہیں۔ ان میں سے 14 حروف کی آوازوں کی جو کایا پلٹ اردو نے کی ہے اس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔ اب ذرا آوازوں اور حروف کے اضافوں پر بھی نظر ڈالیے۔ ہکار آوازیں عربی میں نہیں ہیں۔ بندشی

آوازوں میں پورے ہکار سیٹ یعنی بھ پھ تھ دھ جھ چھ کھ گھ کا اضافہ اردو میں پراکرتوں کی دین ہے۔ اسی طرح معکوسی آوازیں ٹ ڈ ڑ اور ان کے ہکار روپ ٹھ ڈھ ڑھ بھی ہندی اثرات کے تحت اضافہ ہوئے۔ یہ کل 14 آوازیں ہیں۔ یعنی اردو رسم الخط میں ایک تہائی سے بھی زیادہ انڈک آوازوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اردو بولتے لکھتے ہوئے ان آوازوں سے مفر نہیں۔ لب و لہجہ، لفظوں کے بل اور سر لہروں کا اضافہ اس پر مستزاد۔ غرض اس رسم الخط کی، جو ہم نے صدیوں پہلے اردو کے لیے لیا تھا، اردوانے کے عمل کے دوران اتنی کایا پلٹ ہو چکی ہے کہ نہ صرف اس کی اصل آوازوں میں سے بہت سی آوازوں کو ہم نے بدل دیا ہے بلکہ اس میں ایسی ایسی آوازوں اور علامتوں کے اضافے بھی کیے ہیں جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کا ایک صفحہ تو کیا ایک پیرا بھی ان آوازوں کے بغیر لکھا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر کسی اردو کتاب یا اخبار کا ایک صفحہ بھی اگر کسی ایرانی یا عرب کے سامنے رکھا جائے تو وہ اسے صحیح نہیں پڑھ سکے گا۔ ایسے رسم الخط کو جو قبولے جانے کے دوران تنسیخ و توسیع کے زبردست نامیاتی عمل سے گزر چکا ہے اور نصف سے بھی زیادہ بدل چکا ہے، اس کو اب غیر ملکی کہنا اور اس کی بنا پر ہندی اور اردو کی خلیج کو وسیع کرنا کہاں کی انصاف پسندی اور دانشمندی ہے۔

یہ تو اردو کے مستعار سرمائے کی بحث تھی۔ اب ذرا ہندی کے مستعار سرمائے یعنی ان فارسی عربی لفظوں یا ان کے اجزا پر نظر ڈالی جائے جو ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہندی میں استعمال ہونے والے عربی فارسی کے الفاظ قدرتی طور پر وہ ہیں جو اردو میں کثیرالاستعمال ہیں اور کثرت استعمال ہی کی وجہ سے ہندی کے لیے ناگزیر ہو گئے ہیں۔ ہندی کی بنیادی لفظیات پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ Basic Vocabulary of Hindi کے نام سے کیلاش چندر بھاٹیہ نے علی گڑھ سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند نے بھی دو ہزار لفظوں کی Basic Hindi Vocabulary شائع کی ہے اور اس طرح کا کام سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ہندی سے بھی منظرعام پر آ چکا ہے۔ ان تمام مطبوعات میں ہمارے نقطۂ نظر سے

سیتارام شاستری کا ہندی میں استعمال ہونے والے عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا وہ سروے جو رسالہ गवेषणा میں شائع ہوا ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ایسے دو ہزار تین سو عربی فارسی ترکی الفاظ کا اندراج ہے جو ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں ہر عربی فارسی لفظ کے سامنے اس کا سنسکرت مترادف بھی دے دیا گیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ہندی میں صرف چار سو پچاس عربی فارسی کے بنیادی لفظ ایسے ہیں جن کے متبادل فراہم نہیں کیے جاسکتے، باقی سب لفظوں کو بدلا جاسکتا ہے۔ جن لفظوں کے متبادل فراہم کیے گئے ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہیں مثلاً 'حضور' کے معنی 'شریمان' یا 'حویلی' کے معنی 'بھون' درج کیے گئے ہیں۔ یہ غور کیے بغیر کہ ان لفظوں کے کچھ ثقافتی و سماجی مفاہیم بھی ہوسکتے ہیں جو مترادفات کی زد میں نہیں آسکتے اس لیے کہ معنیاتی فضا بدل جاتی ہے۔ اس فہرست میں مترادفات درج کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا گیا کہ لفظی طور پر جو مترادف دیا گیا ہے کیا وہ فعلی اور ترکیبی شکلوں میں استعمال ہوسکتا ہے۔ مثلاً ہوا کے آگے وایو تو رکھ دیا گیا ہے لیکن یہ غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ کیا ہوادار، ہواباز یا ہوائی چھوڑنا، ہوا باندھنا، ہوا خراب ہونا، ہوا ہو جانا کا مسئلہ لفظ ''وایو'' سے حل ہوسکتا ہے؟

ہندی اور اردو الفاظ کے اشتراک کے ذیل میں افعال، امدادی افعال اور مرکب افعال کی تفصیل پہلے پیش کی جاچکی ہے۔ اسی طرح جسم کے حصوں کے نام یا رشتے داریاں (ماں، باپ، بھائی بہن، بیٹا بیٹی، دادا دادی، نانا نانی، چچا، ماما وغیرہ) یا گنتیاں یا موسموں کے نام یا ضمیریں یا الفاظ تمیز یا حروف جار سب ایک ہیں۔ نیز دو عنصری الفاظ (راج دربار، عجائب گھر، ڈاک گھر، چٹھی رساں) دونوں زبانوں کی گنگا جمنی خصوصیت پر دال ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ لسانی بوجھ ان سابقوں اور لاحقوں پر پڑتا ہے جو سینکڑوں ترکیبوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً بے (بے کل، بے گھر)، دان (پاندان، پھول دان)، بان (گاڑی بان، رتھ بان)، دار (تھانیدار، سمجھدار)، باز (دھوکے باز، بٹیر باز) یا ہندی لاحقے جو عربی فارسی لفظوں کے ساتھ لگتے ہیں مثلاً لا (جوشیلا، نشیلا)، پن (دیوانہ پن)۔ اسی طرح اشتراک کی یہ فضا کھانے، مٹھائیوں

اور پھلوں پھولوں کے ناموں میں بھی ملتی ہے۔ (حلوہ، گلاب جامن، برفی، فالودہ، قلاقند، سیب، شریفہ، اخروٹ، پستہ، بادام، انار، انگور یا روغنی روٹی، رومالی روٹی، حبشی حلوہ، موتی پلاؤ، نرگسی پلاؤ، نرگسی کوفتہ)۔ دونوں زبانوں کا باہمی اشتراک و ارتباط ناقابل شکست حد تک ضرب الامثال اور کہاوتوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً چولی دامن کا ساتھ، گوشت کا ناخن سے جدا نہ ہونا، چہرہ فق ہونا، پاؤں تلے سے زمین نکلنا، باغ باغ ہونا، کشتی کنارے آلگنا، گھی کے چراغ جلانا، خون سفید ہونا وغیرہ سے ظاہر ہے کہ اگر ایسے محاوروں یا کہاوتوں میں عربی فارسی کے لفظ شامل نہ ہوں تو محاورہ یا کہاوت بن ہی نہیں سکتی۔ یہ وہ سرمایہ ہے جسے ہندی والے بھی اپنا سمجھ کے برتتے ہیں۔ ہندی اردو کی کچھ کہاوتیں ایسی بھی ہیں جو واضح طور پر مذہبی اثرات لیے ہوئے ہیں یعنی مفت کی مرغی قاضی کو بھی حلال، میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی، دو ملاؤں میں مرغی حرام، نماز بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑے، سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ یہ کہاوتیں جیسی اردو میں استعمال ہوتی ہیں ویسی ہندی میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔

فرض کیجیے عام لفظوں کو تو مترادفات کے ذریعے بدل بھی لیا جائے لیکن ناموں کا کیا کیجیے گا۔ بعض ناموں میں تو زبانوں کا سنجوگ عجیب وغریب شکلیں اختیار کرتا ہے۔ مثلاً بدھ یعنی گوتم بدھ کے مجسموں کی رعایت سے فارسی نے بدھ سے ''بت'' بنا لیا۔ گورو تیغ بہادر کا نام کس نے نہیں سنا۔ نیپال کبھی مسلمانوں کے زیرنگیں نہیں رہا، لیکن شمشیر جنگ رانا اور ببر جنگ رانا زبانوں کی آمیزش کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ اسی طرح چودھری، کنور اور راجا کے القاب مسلمانوں کے ناموں کے ساتھ عام استعمال ہوتے ہیں۔ صاحب اور سردار ہندوؤں اور سکھوں کے ناموں کے جزو ہیں۔ اور تو اور صاحب رام، مالک رام، حاکم رائے، نوبت رائے، خوشی چند، شادی لال، چمن لال، حضور سنگھ، گوربخش سنگھ، ذیل سنگھ، ہوشیار سنگھ، عجائب سنگھ، بختاور سنگھ جیسے نام ہندوؤں سکھوں میں عام طور پر سنائی دیتے ہیں جن میں عربی فارسی لفظوں کی بھرمار ہے۔

ان عناصر کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو رسم الخط اور اس کی

لفظیات بدیسی ہے اور یہ تمام اثرات بھی بدیسی ہیں، تو انھیں کیسے قبول کرلیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ایسے تمام اثرات کو رد کردیا جائے تو ہندوستان گیر حیثیت سے ہندی کا تصور کرنا بھی مشکل ہوگا۔

اس بحث سے چند نتیجے آسانی سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اول یہ کہ اردو اور ہندی اپنی بنیاد اور جڑ سے ایک ہیں۔ ان کی نشوونما اس طور پر ہوئی کہ اب یہ دو آزاد، مستقل بالذات اور الگ الگ زبانیں ہیں۔ البتہ کئی سطحوں پر یہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہوسکتیں۔ اس باہمی اشتراک کی وجہ سے موجودہ لسانی صورت حال کچھ اس طرح کی ہے کہ اگر ہندی اور اردو کو دو دائروں کی شکل میں ظاہر کیا جائے تو دونوں دائرے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آئیں گے اور دونوں دائروں کا نصف سے زیادہ حصہ ایک دوسرے پر منطبق ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اردو میں تقریباً تین چوتھائی الفاظ دیسی ہیں یعنی یہ وہی ہیں جو ہندی میں استعمال ہوتے ہیں۔ عربی فارسی سے مستعار سرمایہ صرف دس پندرہ ہزار لفظوں کا ہے اور یہ بھی سب کا سب استعمال نہیں ہوتا۔ گمان ہے کہ اردو شاعروں اور ادیبوں کے یہاں اس سرمائے کا بھی زیادہ سے زیادہ نصف حصہ یعنی چھ سات ہزار لفظ استعمال ہوتے ہیں اور یہ سرمایہ بھی اردوانے اور ہندیانے کے نامیاتی عمل سے گزرا ہے اور اس میں صوتی صرفی نحوی اور معنوی تبدیلیاں ہوئی ہیں تب کہیں جاکر یہ اردو کا جزو بدن ہوسکا ہے۔ دوسری طرف ہندی میں عربی فارسی سے مستعار اردو کے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی تعداد دو ڈھائی ہزار کے لگ بھگ ہے، اور یہ وہ لفظ ہیں جو کثیرالاستعمال ہیں اور جن کے بغیر ہندی میں طرح طرح کی دقتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ہندی کے ساتھ اردو کے بقائے باہم کے لیے اس بات کے عرفان کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ بنیادی طور پر اردو ہندآریائی زبان ہے۔ نیز اپنے ذخیرۂ الفاظ اور رسم الخط کے معاملے میں وہ اتنی غیرملکی نہیں جتنی قرار دی جاتی ہے۔ جب اردو اتنی روادار ہوسکتی ہے کہ اپنی کل لفظیات میں تین چوتھائی کی حد تک

یعنی چالیس پینتالیس ہزار الفاظ ہندی کے برت سکتی ہے اور پراکرتوں کے تدبھو کی بہترین امین بھی ہے تو کیوں نہ ہندی بھی اردو کے دو ڈھائی ہزار لفظوں کے بارے میں فیاضی کا ثبوت دے اور انھیں اپنی بنیادی لفظیات کے طور پر تسلیم کرے اور ان کے استعمال کو ذہنی تحفظات اور تعصّبات کا شکار نہ ہونے دے۔ اس سے دونوں زبانوں میں باہمی اشتراک اور لسانی بھائی چارے کی فضا مضبوط ہوگی اور علاحدگی پسند (الگاؤ وادی) سیاست دانوں کی تنگ نظرانہ تاویلیں اور غلط بیانیاں اس رشتے کو نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

(1978)

قصہ اردو زبان کا

اردو زبان کی پیدائش کا قصہ اس لحاظ سے ہندستانی زبانوں میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ ہے کہ یہ ریختہ زبان بازاروں، درباروں اور خانقاہوں میں سر راہگذر پڑے پڑے ایک دن اس مرتبے کو پہنچی کہ اس کے حسن اور تمول پر دوسری زبانیں رشک کرنے لگیں۔ دکن میں تو خیر اسے سازگار ماحول ملا تھا، اور شاہجہاں آباد کے اردو بولنے والوں نے اردو کو اردوئے معلّیٰ کا درجہ تو دے دیا اور اس کی اداؤں اور گھاتوں پر جان بھی دینے لگے، مگر فارسی کا اثر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ لوگ اردو میں شعر کہتے ہوئے کتراتے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ بڑ یا پیپل کے پیڑ کے نیچے گھاس بھی نہیں اگتی۔ فارسی کے سائے میں یہی حال اس نوزائیدہ زبان کا تھا۔ یہ ولی کے دیوان کا فیض تھا کہ لوگ فارسی چھوڑ چھوڑ کر اردو کی طرف متوجہ ہوگئے۔ گویا مدتوں سے زبان تیار تھی، بس ایک ہلکے سے نفسیاتی سہارے کی ضرورت تھی، وہ سہارا ولی کے اشعار کی مقبولیت نے فراہم کردیا۔ کم وبیش اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے کربل کتھا لکھی۔ اگر اس کی نثر کا مقابلہ اس زمانے کی شاعری کی زبان سے کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ شعر کی زبان تو کسی حد تک منجھ گئی تھی لیکن نثر کی راہ سے کانٹے ابھی نہیں نکلے تھے۔ عام اصول ہے کہ نثر پہلے بڑھتی ہے، شاعری بعد میں ترقی کرتی ہے۔ یہاں معاملہ برعکس تھا۔ زبان تو تیار تھی ہی، بندھ ٹوٹا تو سب سے پہلے طبیعتوں کو شاعری بہا لے گئی، نثر کنارے پر کھڑی دیکھتی رہی۔ فضلی کربل کتھا کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''سببِ تالیف اس مجموعۂ محمودہ کا اور باعثِ تصنیف اس نسخۂ مسعودہ کا کہ ہر حرف اس کا ایک گلدستہ بوستانِ ولایت کا ہے۔ غلام بے مقدمہ خلص

روزۃ الشہدا کا کہ ... واقعہ شہادتِ شاہِ کربلا کا اس میں لکھا ہے، سونا تا تھا لیکن معانی اوس کے نساء و عورات کی سمجھ میں نہ آتے تھے ... اکثر اوقات بعد کتاب خوانی کے سب یہ مذکور کرتے کہ صد حیف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارتِ فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھاوے اور ہم سے بے سمجھوں کو سمجھا کر رولاوے''۔

اس نثر میں اردو کے ابتدائی دور کی معصومیت اور سادگی تو ہے لیکن جملے فارسی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف شعر کی زبان میں دکنیت یعنی بولیوں کے ابتدائی اثرات تھے۔ میر نے تو اپنے محبت آمیز لہجے میں محض اتنا کہا تھا ع
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا، لیکن قائم نے جب دعویٰ کیا:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

تو وہ دراصل اس احساس کا اظہار کر رہے تھے جس کا ایک ایسے تاریخی دور میں پیدا ہو جانا قدرتی تھا، جب زبان کے بننے، سنوارنے اور گڑھنے کا عمل جاری تھا۔ یہ مبارک کام کسی فردِ واحد یا اکیلے کسی ایک شاعر کا نہیں تھا، بلکہ اس میں مظہر، حاتم، میر، سودا اور قائم و یقین کے دور کے سبھی اردو بولنے اور لکھنے والے شریک تھے۔ اس زمانے میں زبان کو بے انتہا وسعت دی گئی، اور ہزاروں نئے لفظ، نئے مصدر، نئے محاورے، نئی تشبیہیں، نئے استعارے زبان میں داخل ہوئے اور زبان کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس دور میں ایک طرف اگر کئی ٹھیٹھ ہندی لفظ ہمیشہ کے لیے اردو میں کھپ گئے تو اس کے ساتھ ساتھ کئی فارسی محاوروں اور فقروں کے ترجمے اردو میں رچ بس گئے: مثلاً پیمانہ بھرنا (پیمانہ پر کردن)، جامے سے باہر نکلنا (از جامہ بیرون شدن)، دل ہاتھ سے جانا (دل از دست رفتن)، خوش آنا (خوش آمدن)، جگر کرنا (جگر کردن)۔ اس دور کی شاعری میں سپاہیوں، پہلوانوں، پٹے بازوں، مہاوتوں، آتش بازوں، طوائفوں، بنیوں، طبیبوں، باورچیوں، شکاریوں وغیرہ کے بے شمار الفاظ

استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ رزم و بزم اور شادی بیاہ، موسموں، پھلوں، پھولوں، پرندوں، جانوروں، زیوروں، کپڑوں، کھانوں وغیرہ کے سینکڑوں نام اور ان کے بارے میں خاص خاص الفاظ اس دور میں اردو کے سرمائے میں داخل ہوئے، اور اردو لفظیات میں زبردست اضافہ ہوا۔ فارسی لفظوں سے جو مصدر بنائے گئے، انھیں سے کچھ اندازہ ہوگا کہ اردو میں اخذ و تصرف کا کیسا مہتم بالشان سلسلہ جاری رہا۔ لرز سے لرزنا، داغ سے داغنا، فرمان سے فرمانا، خرید سے خریدنا، خرچ سے خرچنا، بخش سے بخشنا، نواز سے نوازنا، بدل سے بدلنا، اسی طرح گزر کرنا، عمل کرنا، زحمت کرنا، خراب کرنا، قدر کرنا، تلاش کرنا، شمار کرنا، منت کھینچنا، فرض کرنا، طومار باندھنا، حامی بھرنا، سروکار نہ رکھنا۔ یہ اور ایسے سینکڑوں دوسرے ماخوذ افعال ہیں جو اس کثرت سے استعمال ہوئے ہیں کہ اردو کے اپنے ہوگئے ہیں۔

فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ کا میل بھی اسی دور میں عروج کو پہنچا۔ دوراہا، بے تکا، گاڑی بان، بے ڈھب، بے گھر، نیک چلن، شرمیلا پن، منہ زور، چور محل، جیب کترا، امام باڑہ، بے فکرا، نو دولتا، چوراہا، چھماہا، پچ رنگا، بے صبرا، تھکا ماندا، بے کل، بدچلن، شرمیلا، پان دان، بے دھڑک، سمجھ دار، سدابہار، دیوانہ پن، بے لاگ، دغاباز، بسنتی پوش، بیل دار، پھول دار، جامۂ چھینٹ، موتی محل، موتی مسجد — میر نے جب کہا تھا:

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا
کرتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

یا

جہاں سے کھولیے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

تو شعری جمال و جلال کے یہ دعوے زبان کی لسانی قوت، وسعت، لوچ اور تمول کے بغیر ناممکن تھے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں جب دہلی کی شعری فضائیں میر و سودا کے معاصرین اور ان کے شاگردوں کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی تھیں، لکھنؤ

میں اردو شاعری کی تخم ریزی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ دوسری طرف قرآن شریف کے اردو تراجم کی طرف بھی توجہ ہو چلی تھی اور مرکزی علاقوں سے دور اردو یا ہندستانی کے اثر سے مرشد آباد اور کلکتے کی لسانی فضاؤں میں بھی تموج پیدا ہونے لگا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ولیم جونز نے سنسکرت، پہلوی، یونانی، جرمنی اور اطالوی زبانوں کے مشترک جدامجد کا سراغ کھوج نکالا اور تاریخی لسانیات اور بالخصوص انڈو یورپین خاندان کی گم شدہ تاریخی کڑیاں ملائی جانے لگیں۔ اسی زمانے میں سامراج کے آلۂ کار کے طور پر گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں اردو پر توجہ کی۔ گلکرسٹ نے لغت، قواعد اور زبان پر بیسیوں کتابیں لکھیں اور لکھوائیں اور فورٹ ولیم کالج میں ہندستانی یعنی اردو کے منشی جمع کیے۔ اس تاریخی کام کا ایک پہلو یہ ہے کہ اگر یہاں نثر کی کتابیں سادہ زبان میں نہ لکھی جاتیں تو اردو شاید ایک مدت تک عطا حسین تحسین کی نوطرزِ مرصع کی ترصیع اور سجع سازی کی بھول بھلیوں میں گم رہتی۔ یوں تو فورٹ ولیم کالج میں حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، کاظم علی جواں، مظہر علی ولا، بہادر علی حسینی، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہاں اور کئی دوسرے ادیب تھے جنھوں نے اردو زبان کی علمی حدود کو وسیع کیا لیکن اس دور کی کتابوں میں جو مرتبہ میر امن کی باغ و بہار نے پایا وہ نثر کی کسی کتاب کو نصیب نہ ہوا۔ اردو اگر پراکرتی اور عربی فارسی عناصر کے درمیان ایک لسانی توازن کا نام ہے تو میر امن نے اپنی زبردست لسانی جینیس اور انتہائی منجھے اور رچے ہوئے ذوق و شعور کی بدولت اس لسانی توازن کے حسن کا راز پا لیا تھا۔ باغ و بہار کی اردو صرف کوثر و تسنیم ہی میں دھلی ہوئی نہیں یہ گنگا اور جمنا کے آئینے میں بھی اپنا چہرہ دیکھے ہوئے ہے:

> ''اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں، جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے۔ تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ لاچار بے حیائی کا برقعہ منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا، بہن کے پاس چلیے۔ لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا، نہ خالی خط لکھا ... وہ ماجائی، میرا یہ حال دیکھ کر، بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ

پر سے صدقے کیے ... ایک دن وہ بہن کہنے لگی، اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماباپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا۔ لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوص اس شہر کے لوگ۔ چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمھاری ہنسائی اور ماباپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال کر رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے، خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو—''

اس نثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان نے اپنے لڑکپن کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اب اس میں ادائے مطلب کی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد اردو نثر جوان ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کی روشنی کی کرنیں کلکتے سے پھوٹنے لگی تھیں، لیکن ادھر اودھ کی تہذیب اپنے حصار میں بند تھی۔ اور یہ حصار بھی ایسا تھا جس کی اپنی ایک دنیا تھی، اپنی زمین اور اپنا آسمان۔ اس کے سورج، چاند اور ستارے آتش، ناسخ بحر، سحر، نسیم، وزیر، رند، صبا، قلق اور رجب علی بیگ سرور تھے۔ طلسم ہوش ربا، امیر حمزہ اور بیسیوں دوسری داستانوں کے سلسلے تھے۔ دربار تو ایک تھا، لیکن اس کے سائے میں چھوٹے بڑے درباریوں کے کئی دائرے تھے جن کے اثر سے مشاعرے، شعری ہنرمندی، فن پر قدرت اور زباں دانی کی مہارت کے سب سے بڑے اکھاڑے تھے۔ دولت کی فراوانی اور سرپرستوں کی کثرت نے شاعری کو جتنا بے روح کیا، زبان کو اتنی ہی ترقی اور توسیع بھی دی کیونکہ ساری توجہ اب لفظ اور زبان پر صرف ہونے لگی تھی، ہندی کی چندی کی گئی۔ متروکات کے دفتر تیار کیے گئے، لیکن زبان کا پود اودھ کی فضاؤں میں پروان چڑھتا رہا، جہاں زمین بھی زرخیز تھی اور مٹی بھی نم تھی۔ اس دور میں اردو پر اودھی کے لوچ،

نرمی اور گھلاوٹ کی ایسی چھوٹ پڑی جس پر اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ اس دور کی زبان میں لطافت، رس اور طبیعت کو بہا لے جانے والی کیفیت دیکھنی ہو تو غزل میں نہیں مثنوی اور مرثیے میں دیکھنی چاہیے۔ اس دور کی اردو میں دونوں انتہائیں ملتی ہیں۔ ایک طرف ناسخ کی روایات، رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب اور دیاشنکر نسیم کی گلزارِ نسیم ہے تو دوسری طرف میر حسن، میر انیس اور مرزا شوق کی بول چال کی چاندنی میں ڈھلی ہوئی زبان ہے جس کی سلاست، گھلاوٹ اور روانی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ اردو زبان نظم اور نثر دونوں میں اب اس نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی کہ منتظر تھی، کوئی ایسا باکمال آئے کہ اس کے دونوں ساعد سیمیں تھام لے اور زبان اس کی محبت کے بدلے اس کے سر پر لسانی زر و جواہر سے جگمگاتا ہوا عظمت کا ایسا تاج رکھ دے جس کی چمک رہتی دنیا تک آنکھوں کو خیرہ کرتی رہے۔ ایسے باکمال عظیم فن کار مرزا غالب تھے۔ انھوں نے جب یہ کہا تھا:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مِرے اشعار میں آوے

تو بالواسطہ طور ہی پر سہی وہ اس امر کا اظہار کر رہے تھے کہ اردو لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے اس سطح تک اٹھ آئی ہے کہ نازک سے نازک معنی اور زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ رشتوں کے احساسات کے اظہار پر قادر ہوسکتی ہے۔ نثر میں گفتگو کو اور شاعری میں سحر کو سمونے کی مرزا میں ایسی بے پناہ صلاحیت تھی کہ ان کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے لسانی ارتقا کا وہ دائرہ منطقی طور پر مکمل ہوگیا جو امیر خسرو کے دور میں بننا شروع ہوا تھا۔ غالب کے بعد ادائے معنی کی ایک ایسی شاہراہ کھل گئی جس پر اردو آج تک چل رہی ہے۔ غالب کی اس تحریر کو دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ آج کی اردو کی معیار بندی کس زبان کی بنا پر کی جاتی ہے:

> ''پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی

بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو ''چنا جان'' نہ سہی، ''منا جان'' سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے، اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہوجائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشمِ بد دور، وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ''۔

(1975)

اردو رسم الخط — ایک تاریخی بحث

(نوٹ : کچھ عرصہ ہوا 'دوست' میں خواجہ احمد عباس کا ایک مضمون ('دھرم یگ') ہندی سے ترجمہ کرکے شائع کیا گیا تھا۔ اُس میں خواجہ صاحب نے اردو والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا رسم الخط دیوناگری کرلیں۔ 'دوست' کی جانب سے اس کا جواب دیا گیا، اس کے بعد کافی دیر تک یہ بحث دلچسپ طریقہ پر چلتی رہی۔ ہمیں مسرت ہے کہ اردو کے ایک اہم محقق اور نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس سلسلے میں ہماری دعوت قبول کرکے یہ مضمون اس موضوع کے متعلق لکھا۔ ہم اسے شکریے کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔ ایڈیٹر 'دوست')

پچھلے کچھ دنوں سے اردو رسم الخط کا مسئلہ بُری طرح بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے۔ ایک سے ایک کی رائے مختلف ہے۔ کسی کا منہ اِدھر ہے تو کسی کا اُدھر۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کان پر قلم رکھے بیٹھے ہیں۔ رسم الخط کا نام سنا نہیں کہ انھوں نے اس کا بخیہ اُدھیڑا نہیں۔ ہندوستان میں اردو کے علاوہ دوسری زبانیں بھی ہیں۔ قومی وحدت کے مسائل کا سامنا انھیں بھی ہے۔ لیکن رسم الخط کا ہوّا جیسا اردو کے بعض کرم فرماؤں کو ستا رہا ہے، دوسروں کو نہیں۔ لیڈر قسم کے لوگوں کی بات دوسری ہے۔ اِن کا تو دھندا یہی ہے کہ جتنی بے پَر کی اُڑا سکیں اُڑائیں۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض صفِ اول کے ادیب بھی رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ شاید ان کی نظر سیاسی پہلو پر تو ہے، لسانی پہلو پر نہیں۔

لُطف کی بات یہ ہے کہ رسم الخط کی بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ وہی لوگ لیتے ہیں جنھیں معلوم نہیں کہ زبان کی نوعیت کیا ہے۔ جتنا اہم یہ موضوع ہے اور جس قدر

سنجیدگی کا یہ مطالبہ کرتا ہے اسی قدر غیر سنجیدگی سے اسے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رسم الخط کو کوئی لباس کہتا ہے تو کوئی پاجامہ۔ یعنی ایک اُتارا دوسرا پہن لیا۔

یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ جو لوگ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ اُردو اصوات تو کُجا، اردو اعراب سے بھی پورے طور پر واقف نہیں ہوں گے۔

جناب خواجہ احمد عباس نے اپنے مضمون (مطبوعہ دھرم یگ (ہندی) دوست (اردو) میں جو باتیں کہی ہیں اِن سب کا احاطہ کرنا تو سردست ممکن نہیں، رسم الخط کے مسئلے پر سیر حاصل بحث کرنے کا بھی یہ موقع نہیں۔ البتہ بعض بنیادی باتوں کو صاف کر دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔

اردو اور ہندی ایک زبان نہیں

رسم الخط کی بات کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہندی اور اردو ایک زبان ہیں۔ یہ بات جتنی صحیح ہے اتنی صحیح نہیں بھی ہے یعنی بنیاد کے اعتبار سے بیشک ہندی اور اُردو دونوں زبانیں ایک ہیں لیکن اپنے ارتقا کے دوران بوجوہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں اور دہلی کے گرد و نواح کی کھڑی بولی پر قائم ہیں۔ اردو اور ہندی کو اب دو ملتی جلتی لیکن آزاد اور مستقل زبانیں سمجھنا چاہیے۔

بنیاد کو ایک تسلیم کرنے سے یہ قطعاً لازم نہیں آتا کہ دونوں کا رسم الخط ایک ہو۔ اگر یہ بات ضروری ہوتی تو آج اڑیا، بنگالی اور آسامی زبانوں کا رسم الخط ایک ہی ہوتا۔ کیونکہ یہ تینوں ماگدھی پراکرت کی جانشین ہیں لیکن اس کے باوصف اِن کا رسمِ خط ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس مثال کو سنسکرت تک لے جایئے تو معلوم ہوگا کہ سنسکرت تمام ہند آریائی زبانوں کی بنیاد ہے یعنی بنگالی، اڑیا، آسامی، اودھی، مگھی، میتھلی، بھوج پوری، برج، کھڑی، ہریانی، گجراتی، راجستھانی، پنجابی وغیرہ سبھی زبانوں کا سلسلہ سنسکرت تک پہنچتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان سب کا رسم الخط ایک

نہیں ہے۔ یہی ہندی اور اردو کا معاملہ ہے۔ دونوں آریائی ہیں لیکن اپنے ارتقائی سفر میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط کا تجویز کرنا دونوں کے حق میں مُضر ہوگا۔

زبان اور رسم الخط کا تعلق

یہ کہنا کہ ''لپی اور بھاشا کا ایک ہونا ضروری نہیں ہے'' مناسب نہیں ہے۔ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اس کا رسم الخط رائج ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسم الخط میں کبھی تبدیلیاں رونما نہ ہوتیں اور وہی رسم الخط جو ویدوں کے زمانے میں تھا آج تک جاری رہتا۔ کھر دشٹی سے دیوناگری تک شمالی ہندوستان کے رسم الخط میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ بادشاہوں یا اعلیٰ طبقے کے افراد نے نہیں کیں بلکہ زبانوں کے فطری ارتقا کا ساتھ دینے کے لیے ہوئی ہیں۔ ارتقائی سفر کے دوران زبان کی پُرانی آوازوں میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ہر تاریخی موڑ پر نئی آوازیں داخل ہوتی ہیں۔ رسم الخط آوازوں کو علامتوں کے ذریعہ ظاہر کرنے کے کام آتا ہے۔ چنانچہ پُرانی علامتیں منسوخ ہوجاتی ہیں اور نئی آوازوں کے لیے نئی علامتوں کے اختیار کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ گویا اصل چیز بولی جانے والی زبان ہے۔ رسم الخط جس کا تعلق تحریری زبان سے ہے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ زبان کی تحریری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ یعنی رسم الخط تابع ہے زبان کے۔ اس کے برعکس جو لوگ رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دیتے ہیں وہ رسم الخط کو قائم بالذات سمجھتے ہیں جو صریحاً غلط ہے۔ زبان اور رسم الخط میں نہایت گہرا رشتہ ہے۔ زبان کو اگر جسم قرار دیں تو رسم الخط کھال ہے۔ رسم الخط تبدیل کرنے کا مطلب گویا جسم کو نئی کھال میں داخل کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات کس حد تک قابلِ عمل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں زبان نے اپنا رسم الخط تبدیل کرلیا ہے اور ترقی پذیر ہے۔ ہمیں اس بات کے قبول کرنے میں تامل نہیں۔ اگر کسی زبان کا رسم الخط انتہائی ناقص ہے یا رسم الخط کی تبدیلی سینکڑوں برسوں کی لسانی اور تہذیبی تحریکوں کے زیراثر

ہو جائے تو وہ تبدیلی نامناسب نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ترکی اور ازبکی کی مثال دی گئی ہے۔ دونوں زبانوں کے رسم الخط میں تبدیلی ان ملکوں کے تاریخی اور سماجی حالات کے تقاضے کے تحت ہوئی ہے۔ حکومتوں کے اقدام کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ سرکاری طور پر اس تبدیلی کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ ایسی کوئی تبدیلی عمرانیاتی طور پر ازخود اگر اردو رسم الخط میں رونما ہو تو یقیناً وہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہوگی۔ ورنہ رسم الخط کو خواہ مخواہ تبدیل کرنا زبان کے تہذیبی تقاضوں کو نظرانداز کرنا ہے۔ ہندی اور اردو میں لسانی اور صرفی ونحوی مطابقت ہے لیکن اس کے باوصف دونوں میں کچھ نہ کچھ فرق بھی ہے۔ اردو میں ہندی کی گیارہ ہکار (Aspirated) آوازیں اور تین معکوسی (Retroflex) آوازیں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کے لیے اور دو مصوتوں کے لیے اردو والوں نے فارسی رسم الخط میں سولہ علامتوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس کے برعکس ہندی والے اردو کی پانچ صفیری (Spirant) آوازوں یعنی ف، ز، ژ، خ، غ اور بندشی ق وغیرہ کو نہیں اپنا سکے۔ علامتوں میں اس نوعیت کی بنیادی تبدیلی کرنے سے جو ہندی داں حضرات کے مزاج کا ساتھ نہیں دیتی یہ بہتر ہے کہ رسم الخط تبدیل کرنے کے مشوروں کو فی الحال محفوظ رکھا جائے۔ اردو نے اپنا موجودہ رسم الخط پچھلی کئی صدیوں کے تاریخی اور تہذیبی تقاضوں کے تحت اختیار کیا ہے۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس نے ہندوستان اور عرب و ایران سب سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کا رسم الخط بھی اشتراک اور ارتباط کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ ہمیں فارسی رسم الخط سے 34 علامتیں ملیں۔ ان میں دو حروف علت اور چودہ حروف صحیح بھ، پھ، تھ، دھ، جھ، چھ، کھ، گھ، ٹ، ڈ، ڑ، ٹھ، ڈھ، ڑھ یعنی کل سولہ علامتوں کا اضافہ کر کے ہم نے ایک نیا ملا جلا رسم الخط بنایا ہے جو اب تک اردو کے فطری تقاضوں کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ غور فرمایئے سولہ علامتوں کا اضافہ کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ جس رسم الخط میں ایک تہائی علامتوں کا اضافہ تاریخی اور تہذیبی ضرورتوں کی بنا پر ہوا ہو وہ رسم الخط ہمارا اپنا ہے یا اب بھی ہم اسے غیر ملکی کہتے رہیں گے۔ جو لوگ اردو رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دیتے ہیں وہ بنیادی طور پر اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ

اردو رسم الخط غیر ملکی ہے، تبھی تو وہ گجراتی یا مرہٹی کا رسم الخط تبدیل کرنا اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا اردو کا۔ حالانکہ گجراتی اور مرہٹی کے رسم الخط دیوناگری سے نہایت قریب ہیں اور بڑی آسانی سے تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کی بنیاد میں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی جذبہ کارفرما ہے کہ ہمارا رسم الخط غیر ملکی ہے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا درست نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو نے اپنا رسم الخط عرب و ایران سے لیا اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کا ساتھ دینے کے لیے یہ موزوں بھی ہے۔ لیکن ہندآریائی صوتیاتی نظام کو پورا کرنے کے لیے ہم نے اس میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور اس طرح سے اپنا بنا لیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس توسیع شدہ صورت میں عرب اور ایرانی اسے اپنا کہنے کے لیے تیار نہیں۔ یونیورسٹی کے کام میں اردو کے عرب اور ایرانی طلبا سے اکثر سابقہ رہتا ہے۔ یہ بات تجربے پر مبنی ہے کہ اردو کی معکوسی اور ہکار آوازوں اور ان کی علامتوں پر عبور حاصل کرنے اور بے تکلفانہ استعمال کرنے کے لیے انھیں کم سے کم کئی ماہ کی مسلسل مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔

تہذیبی روابط

ہمارے رسم الخط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہماری ضرورتوں کا ساتھ دینے کے علاوہ یہ پاکستان، ایران، افغانستان، شام، ایران، عراق، مصر، سعودی عرب وغیرہ بیسیوں ایشیائی ملکوں سے ہمارے تہذیبی روابط کی بنیاد مضبوط کرنے کا کام دیتا ہے۔ لکھنے میں دوسرے خطوں کی نسبت ایک تہائی جگہ کم لیتا ہے اور اس میں وقت بھی نسبتاً کم صرف ہوتا ہے۔

دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کی ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ ''ایسا کرنے سے اردو کے ساہتیک خزانے اِن سب کے لیے کھل جاتے ہیں جو فارسی لپی نہ جاننے کے کارن آج اردو کی لطافت اور مٹھاس سے لطف نہیں اٹھا سکتے''۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ جو زبان اپنے علمی خزانوں کو دوسروں پر کھول دینے کی خواہاں ہو وہ دوسروں کا رسم الخط اختیار کرے۔ یہ دلیل غلط ہے۔ اس دلیل کے حامی

اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ انگریزی یا روسی زبانوں نے اپنے علمی خزانوں کو عام کرنے کے لیے اپنے رسم الخط تبدیل نہیں کیے بلکہ اس کے برعکس دوسری زبانوں کے ترجموں سے خود کو مزید مالا مال کیا ہے اور جن زبانوں کو انگریزی یا روسی کے علمی خزانوں سے استفادہ کرنا مقصود تھا خود انھوں نے انگریزی اور روسی کے ادبی وعلمی شاہکاروں کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ ہندی اور اردو میں بھی ربط بڑھانے کے لیے ترجموں کا اور دونوں رسم الخط میں کتاب کو ایک ساتھ شائع کرنے کا عمل پہلے سے جاری ہے، اسے بڑھایا جاسکتا ہے۔ ایسا سماجی تہذیبی ضرورت سے از خود ہورہا ہے، اس کے لیے کسی سرکاری فیصلے کی ضرورت نہیں۔

لسانی رنگارنگی

اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دینے والے کبھی کبھی اردو والوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ ''بھارت کی سب بھاشاؤں کو ایک لپی اختیار کرنی چاہیے''۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ایک تکثیری ملک ہے، اس کا جینیس اس کی رنگارنگی میں ہے۔ ہندوستان میں سینکڑوں بولیاں اور بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سب کا اپنا اپنا مزاج اور اپنا اپنا رسم الخط ہے۔ ہندوستان میں اس وقت چار بڑے لسانی خاندان ہیں۔ آسٹری، تبّتی برمی، دراوڑی اور ہندآریائی۔ ہند آریائی خاندان کی زبانوں کا فروغ آریوں کے داخلہ ہند کے بعد شروع ہوا۔ اس سے پہلے آسٹری اور دراوڑی خاندان کی زبانیں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ شمالی ہندوستان پر جب ہندآریائی تسلط ہوا تو میل جول اور اخذ و قبول کے عمل سے لسانی سطح پر حیرت انگیز رنگارنگی پیدا ہوگئی۔ یہاں آج بھی ہر بیس تیس میل پر بولی بدل جاتی ہے اور اس سے رسم الخط بھی متاثر ہوتا ہے۔ ہندستانی زبانوں کے رسم الخط میں جو بوقلمونی اور کثرت نظر آتی ہے، وہ ہمارے جغرافیائی تاریخی، تہذیبی اور سماجی حالات کی پیدا کردہ ہے۔ اس صورتِ حال میں سب زبانوں کے لیے ایک ہی رسم الخط تجویز کرنا اپنے بنیادی تہذیبی تقاضوں سے بے نیاز ہونا ہے۔ ہندوستان نے

حال ہی میں پُرانی زنجیروں کو توڑا ہے۔ ملکی اور قومی سطح پر فرد کی اہمیت اور جمہوری آزادی کا خواب دیکھا گیا ہے۔ ایسے نظام میں جہاں سب کو برابر کے مواقع حاصل ہوں اور اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی اجازت ہو، ایک رسم الخط کی بات کرنا گویا لسانی آزادی کے امکانات کو محدود کرنے کا اعلان کرنا ہے۔ روس جیسے ملک میں بھی جہاں حکومت کی بنیاد کلیت پسندی پر ہے اور انفرادی آزادی کے معنی اجتماعی آزادی کے ہیں، تمام صوبائی زبانوں کے رسم الخط رد نہیں کیے گئے۔ صرف انھیں صوبائی زبانوں کے لیے روسی رسم الخط اختیار کیا گیا ہے جن کا پہلے سے کوئی باقاعدہ رسم الخط نہ تھا یا جن کا رسم الخط ناقص تھا۔ ورنہ دوسری زبانوں کے وہی رسم الخط جو نئے نظام سے پہلے رائج تھے، اب بھی مقبول ہیں۔ مثال کے طور پر آذربائی جان اور جارجیا کی زبانوں کے رسم الخط اب بھی روسی رسم الخط سے مختلف ہیں۔

قومی یکجہتی

قومی یکجہتی یا جذباتی ہم آہنگی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ سب زبانوں کی لپی ایک ہو۔ ایک رسم الخط کو دوسرے پر ترجیح دینے سے نفرت بڑھے گی، کم نہیں ہوگی۔ تنگ نظری یا تعصب کی دیوار رسم الخط پر قائم نہیں۔ اس کی بہت سی دوسری وجوہ ہیں۔ رسم الخط خواہ مخواہ زد میں آگیا۔ قومی یکجہتی کا پرچم لہرانا بہت خوب ہے لیکن اس کے لیے لسانی آزادی سے منہ موڑنا ضروری نہیں۔ ہندوستان ایک وسیع اور عریض ملک ہے۔ یہاں مختلف زبانوں، نظریوں، فرقوں اور نسلوں کے لوگ ملیں گے۔ رسم و رواج، اخلاق و آداب اور طور طریقوں میں بھی بڑا فرق نظر آئے گا لیکن ہندستانی مزاج اس رنگارنگی اور کثرت کی مذمت نہیں کرتا۔ اسے یہ جلوہ صد رنگ پسند ہے اور ہماری زندگی دراصل عبارت ہے اسی وسعت اور تکثیریت سے۔ ہندوستان کی بقا اسی رنگارنگی میں ہے۔ ہماری ترقی کا دار و مدار اسی پر ہے کہ ہر پھول کو اپنے طور پر کھلنے اور مہکنے کی اجازت دی جائے۔ تمام علاقائی زبانوں کا درجہ برابر ہے اور سب کو اپنے رسم الخط کے ساتھ ترقی کرنے کی اجازت ہے۔ قومی یکجہتی کے نام پر ایک رسم الخط کی

تجویز پیش کرنا ایسا ہے جیسے گیہوں کی قلت سے متاثر ہوکر ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گیہوں کی کاشت کا حکم دیا جائے اور مٹی اور آب و ہوا کے فرق اور باشندوں کی مقامی ضرورتوں اور عادتوں کو یکسر نظرانداز کردیا جائے۔ قومی یکجہتی کے تصور کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ہندوستان میں مختلف اور متضاد عناصر ہیں، ان میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ یعنی ضرورت ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہے رنگارنگ عناصر کو مٹانے کی نہیں۔ کیونکہ اگر عناصر ہی مٹ گئے تو رہ بھی کیا جائے گا۔ رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ گویا عناصر کو مٹانے کی کوشش ہے اور اسی لیے ہم اس کی موافقت کرنے سے قاصر ہیں۔

(ہفت روزہ دوست، دہلی ستمبر 1961)

اردو رسم الخط

تہذیبی و لسانیاتی مطالعہ

زبان کی طرح رسم الخط بھی عوامی چیز ہے اور ہر شخص کو اس پر اظہار خیال کا حق پہنچتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر لکھنے والوں میں عالم اور عامی سبھی شامل ہیں، لیکن زیادہ تر تحریریں جذباتیت سے مغلوب ہو کر لکھی گئی ہیں، جن کا مقصد اتنا روشنی پھیلانا نہیں جتنا گرمی بڑھانا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو رسم الخط کے مسئلہ پر معروضی علمی انداز سے نظر ڈالی جائے اور تبدیلی کا مشورہ دینے والوں کے محرکات کا پتہ چلایا جائے۔ نیز موجودہ رسم الخط کو زندہ رکھنے کے تہذیبی اور لسانیاتی پہلوؤں پر غور کیا جائے۔

آزاد ہندوستان کا ایک المیہ یہ ہے کہ زبان کے مسائل کو سیاست کی نظر سے اور سیاست کے مسائل کو مذہب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ اندازِ نظر سامراجی ایجنڈے کا اور ہماری اس میراث کا جزو ہے جو ہم نے بیسویں صدی میں پچھلی نسلوں سے حاصل کی ہے۔ فرقہ واریت، منافرت، تعصب اور تنگ نظری نے ہماری حالیہ تاریخ کے اوراق کو بری طرح داغ دار کر دیا ہے۔ اردو کے حقوق کا مسئلہ دراصل محض اردو کے حقوق کا مسئلہ نہیں ہے، یہ اکثریت کے ردعمل کا مسئلہ بھی ہے۔ پنڈت آنند نرائن مُلا نے اپنے خطبۂ صدارت جے پور اردو کانفرنس میں کہا تھا:

"تقسیم ہند کی وجہ سے اکثریت کے دلوں میں جو غبار آ گیا ہے، وہ کسی طرح مٹنے کا نام نہیں لیتا اور پاکستان کے خلاف جو غصہ ہے، وہ غریب اردو پر اتارا جا رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اردو کو اس ملک کی زبان ماننے سے انکار ہے''۔ آزاد ہندوستان میں اردو کے حقوق کی اور اس کے رسم الخط کو زندہ رکھنے کی کوئی بھی بحث فرقہ وارانہ سیاست کے منفی اثرات، ہندو مسلمان علاحدگی پسندی کے رجحانات اور تقسیم کے پس منظر کو فراموش کر کے کی ہی نہیں جاسکتی۔ یہ وہ حقائق ہیں، جن کا سامنا کرنے اور انھیں سمجھنے کے بجائے اکثر و بیشتر ہم ان سے آنکھیں چراتے ہیں۔ ان باتوں کا ذکر کر کے منھ کا ذائقہ تو خراب ہوتا ہی ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب بھی ہم اردو کے مسئلہ پر غور کریں گے، شعوری یا تحت الشعوری طور پر یہ بیانات ہمارے ذہن میں حاضر ہوں گے کہ فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والا ایک طبقہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ''اردو پاکستان کی زبان ہے'' یا ''اردو کا رسم الخط غیر ملکی ہے'' یا ''اردو کو اس کے رسم الخط میں زندہ رکھنے کی کوشش فرقہ وارانہ ہے اور مشترک تہذیب کی راہ میں سنگ گراں''۔ خصوصاً جب خود اردو میں ایسے کرم فرماؤں کی کمی نہیں جو مابعدالطبیعیات اور لسانیات میں خلط مبحث کرتے ہیں۔ کسی رسم الخط کا مابعدالطبیعیاتی مطالعہ[1] پیش کرنے میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اگر کھینچ تان کر ایسے نتائج اخذ کیے جائیں جن کا مقصد اردو کو لسانی طور پر محدود کرنا یا اس کی مشترکہ سماجی اور تہذیبی حیثیت کو نقصان پہنچانا ہو تو موجودہ حالات میں اسے اردو کی خدمت نہیں کہا جاسکتا۔ فرقہ وارانہ سیاست نے لسانی اور تہذیبی سطح پر جو زہر پھیلایا ہے وہ رگ و پے میں بری طرح سرایت کر گیا ہے، اور جب تک اس کا اثر باقی ہے، زبان کے مسئلے پر سوچتے ہوئے اس زہر کے عمل اور ردعمل سے صرفِ نظر کرنا خود کو دھوکا دینا ہے۔

اس پس منظر میں اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں کی باتوں پر غور کیجیے جو اردو کے ادیب ہوتے ہوئے اردو رسم الخط کو بدل کر دیوناگری کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں، تو معلوم ہوگا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اپنی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کتنی بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں۔ آج سے دس برس قبل جب بمبئی کے اردو حلقوں سے دیوناگری کی حمایت میں سب سے پہلی آواز اٹھی تھی تو ہم نے اس سے

1 ''اردو کا رسم الخط: ایک مابعدالطبیعیاتی مطالعہ''، محمد حسن عسکری، شب خون، اکتوبر 1970

اختلاف کیا تھا۔ ہم اس مشورے کے اب بھی خلاف ہیں، لیکن اس کی تہہ میں بے تعصبی، بلند نظری اور وسیع تر ملکی اور لسانی مفاد کا احساس اور قربانی و ایثار کا جو جذبہ ملتا ہے، اُس کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ ایسا مشورہ دینے والے اُن لوگوں سے مختلف ہیں جو اصلاً ہندی کے حامی ہیں، اور اردو کو ہندی میں ضم کرنے کے لیے اردو والوں سے اپنا رسم الخط چھوڑ دینے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ مطالبہ تو غیروں کا ہے، لیکن جس مشورے کا ہم ذکر کررہے ہیں، وہ ''اپنوں'' کا ہے۔ ایسا مشورہ دینے والے اردو ادیب مارکسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے نظریۂ زبان کی رو سے عوامی زبان یا پرولتاری زبان ہی اصل زبان ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ بالعموم کسی بھی زبان کی جڑیں اس کی بولیوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ اردو بھی بولیوں کے بطن سے آئی ہے، لیکن اس کے مخصوص تہذیبی اور سماجی کردار کی وجہ سے اس کا رشتہ بولیوں سے وہ نہیں رہا جو اس کے مقابلے میں ہندی کا ہے۔ چنانچہ یہ نظریۂ زبان اردو کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرسکتا۔ اس کی رو سے لازم آتا ہے کہ بنیادی اہمیت بولیوں کی ہے، یعنی برج، راجستھانی، ہریانی، کھڑی، قنوجی، بندیلی، اودھی، مگھی، میتھلی، بھوج پوری، پہاڑی وغیرہ۔ ہندی میں یہ سب بولیاں بشمول کھڑی کے موجود ہیں جبکہ اردو صرف کھڑی کا ارتقائی روپ ہے، اور ارتقائی روپ بھی وہ جس کی نشو ونما مخصوص شہری تمدن میں متوسط اور اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے ان حضرات کے نزدیک اردو وہ زبان ہے جسے طبقۂ اشرافیہ نے پروان چڑھایا اور جو محض اپنے رسم الخط کی وجہ سے ہندی سے مختلف ہوگئی۔ گویا اس نظریے کے تسلیم کرنے والوں کی نظر میں اردو ایک طرح کی مصنوعی زبان ہے جو پڑھے لکھے طبقے اور شہری آبادی تک محدود ہے اور جاگیردارانہ ماحول کی پروردہ ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی وسیع تر فطری زبان ہے جس کا دامن ہزاروں میلوں میں پھیلی ہوئی بولیوں سے بندھا ہوا ہے۔ اس نظریہ سے یہ منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے چونکہ موجودہ جمہوری دور میں اشرافیہ کی زبان پر عوامی زبانیں غالب آجائیں گی، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اردو والے خود ہی اپنے رسم الخط سے دستبردار ہوجائیں، اور دیوناگری

کو اپنالیں۔

یہ نظریہ جہاں تک مذہب، نسل، فرقہ اور زبان کی چھوٹی وفاداریوں سے بلند ہونے کا حوصلہ عطا کرتا ہے یا عوام کی لسانی طاقت پر زور دیتا ہے یا زبان کے بولنے والوں کو لسانی وحدت کے طور پر پیش کرتا ہے، وہاں تک تو یقیناً قابل قدر ہے لیکن اردو اور ہندی میں جو انتہائی پیچیدہ اور مخصوص تہذیبی اور لسانی رشتہ ہے، یعنی جس طرح دونوں کی بنیاد کھڑی بولی پر ہے، لیکن تاریخی حالات کے زیراثر دونوں کا ارتقا پچھلی کچھ صدیوں کے سفر میں جس طرح الگ الگ ہوا ہے جس سے یہ دو منفرد زبانیں بن گئی ہیں، یا ہندو اور اسلامی تہذیب میں اخذ وقبول اور ارتباط و اختلاط کا جو عمل صدیوں تک جاری رہا، اردو جس طرح اس سے متاثر ہوئی ہے، اور مشترک تہذیبی قدروں کے فروغ میں، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان لسانی مفاہمہ کی حیثیت سے اردو نے جو بیش بہا خدمت انجام دی ہے، اور اس میں اور ہندی میں جو بنیادی لسانی اشتراک اور بنیادی تہذیبی اختلاف ہے، ان سب پیچیدگیوں کو سمجھنے میں یہ نظریۂ زبان زیادہ دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ صدیوں کی تاریخی ضرورتوں، رواج اور چلن اور معیار بندی نے اردو کو جو خاص لسانی، سماجی اور تہذیبی منصب اور مقام عطا کیا ہے، اس کو بھی یہ نظریہ تسلیم نہیں کرتا، اور یہیں سے اس کی کوتاہی واضح ہوجاتی ہے۔ چنانچہ باوصف اس کے کہ ہم اس نظریہ کے حامیوں کی نیت پر شبہ نہیں کرتے، ہم اس نظریہ کی تائید سے قاصر ہیں۔

تبدیلی کا مشورہ دینے والے اردو ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے اردو کے حقوق کا مسئلہ ختم ہوجائے گا اور قومی یکجہتی کے لیے فضا سازگار ہوجائے گی۔ آزادی کے چند برس بعد جب بعض سیاستدانوں نے اس پر زور دینا شروع کیا تھا کہ قومی وحدت کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام زبانوں کا رسم الخط ایک کردیا جائے تو بعض صوبائی حکومتوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ بعد میں جب قومی یکجہتی کونسل نے بھی تمام زبانوں کے لیے دیوناگری اختیار کرنے کا مشورہ دیا تو جنوبی ہندوستان میں اس کے خلاف شدید احتجاج ہوا تھا اور بالآخر پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریس کے

مدورائی اجلاس میں یہ یقین دلانا پڑا تھا کہ کسی بھی زبان کا رسم الخط اس کے بولنے والوں کی مرضی کے خلاف تبدیل نہیں کیا جائے گا، اور اس سلسلہ میں آئینِ ہند کی دفعہ (1) 29 کا حوالہ دیا گیا تھا جس کی رو سے ہندوستان کی لسانی اقلیتوں کو اپنی زبان اور اس کے رسم الخط کے تحفظ اور استعمال کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

ہمارے رسم الخط کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہماری ضرورتوں کا ساتھ دینے کے علاوہ یہ پاکستان، ایران، افغانستان، شام، اردن، عراق، مصر، سعودی عرب، انڈونیشیا، ملیشیا وغیرہ بیسیوں ایشیائی ملکوں سے ہمارے تہذیبی روابط کو استوار کرنے کا کام دیتا ہے۔ لکھنے میں دوسرے خطوں کی بہ نسبت یہ ایک تہائی جگہ کم لیتا ہے، اور اسی اعتبار سے اس میں وقت بھی کم صرف ہوتا ہے۔

لسانی اور تہذیبی کثرت اور بوقلمونی کے اعتبار سے ہندوستان دنیا کے زرخیز ترین خطوں میں سے ہے۔ ہندوستان میں اس وقت چار بڑے لسانی خاندان ہیں: آسٹری، تبتی برمی، دراوڑی اور ہندآریائی۔ ہند آریائی خاندان کی زبانوں کے فروغ سے پہلے ہندوستان بھر میں آسٹری اور دراوڑی خاندان کی زبانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ شمالی ہندوستان پر جب ہندآریائی کا تسلط ہوا تو میل جول اور اخذ و قبول کے عمل سے لسانی سطح پر حیرت انگیز رنگارنگی پیدا ہوگئی جس سے یہاں بقول شخصے ہر بیس تیس میل پر بولی بدل جاتی ہے، اور اس کی رعایت سے رسم الخط بھی متاثر ہوتا ہے۔ ہندستانی زبانوں کے رسم الخط میں جو رنگارنگی اور اختلافات نظر آتے ہیں، وہ ہمارے جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی اور سماجی حالات کے پیدا کردہ ہیں۔ ہمارے آئین کی بنیاد سیکولر تصور پر رکھی گئی ہے۔ ایسے نظام میں جہاں سب کو برابر کے مواقع حاصل ہیں اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت ہے، قومی یکجہتی کے نام پر رسم الخط کو تبدیل کرنا گویا لسانی آزادی کے امکانات کو ختم کرنا ہے۔ ایک رسم الخط کو دوسرے پر ترجیح دینے سے نفرت بڑھے گی، کم نہیں ہوگی۔ تنگ نظری اور تعصب کی دیوار رسم الخط پر قائم نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے، اس کی دوسری بہت سی وجہیں ہیں۔ ہندوستان میں مختلف زبانوں، مذہبوں، عقیدوں، فرقوں

اور نسلوں کے لوگ بستے ہیں جن کے رسم و رواج، اخلاق و آداب اور طور طریقوں میں بڑا فرق ہے۔ ہندستانی مزاج اس رنگارنگی اور کثرت کی مذمت نہیں کرتا، بلکہ اس کے جلوۂ صدرنگ پر اصرار کرتا ہے۔ جب ہماری زندگی عبارت ہی وسعت اور کثرت سے ہے اور ہندوستان کی بقا ہی رنگارنگی میں ہے تو رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ قومی یکجہتی کے تصور کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ہندوستان میں مختلف اور متضاد عناصر ہیں، ان میں ہم آہنگی ہونی چاہیے، یعنی ضرورت ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہے، عناصر کو مٹانے کی نہیں۔ رسم الخط کے تبدیل کرنے کا مشورہ چونکہ عناصر کو مٹانے کی کوشش ہے، اس لیے تہذیبی نقطۂ نظر سے قابل عمل نہیں۔

2

مسئلہ کے تہذیبی پہلو پر غور کرلینے کے بعد اب اس کے لسانیاتی پہلو کو لینا چاہیے لیکن اس سے پہلے دو مفروضوں کی تردید ضروری ہے: اول یہ کہ اردو رسم الخط کے بغیر اردو زبان کا تصور نہیں کیا جاسکتا، دوسرے یہ کہ اردو کا رسم الخط غیر ملکی ہے۔ پہلے سوال پر بحث کرتے ہوئے زبان اور رسم الخط کا رشتہ بھی زیر بحث آئے گا۔ رسم الخط بعض لوگوں کے نزدیک لباس کا درجہ رکھتا ہے، یعنی ایک اتارا اور دوسرا پہن لیا اور بعض کے نزدیک کھال کا یعنی جس طرح ایک جسم کو دوسری کھال میں داخل نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ایک زبان کے لیے دوسرا رسم الخط اپنانا بھی ناممکن ہے۔ لسانیات کی رو سے اصل اور بنیادی چیز بولی جانے والی زبان ہے، رسم الخط ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے زبان اور اس کا چلن وجود میں آتا ہے، تحریر کی ضرورت بعد میں پیش آتی ہے۔ رسم الخط زبان کا تابع ہے، زبان رسم الخط کے تابع نہیں۔ رسم الخط زبان کی آوازوں کو علامتوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے اور اس کا کام زبان کو ضبط تحریر میں لاکر ترسیل میں مدد دینا ہے۔ زبان میں تبدیلی ہوگی تو رسم الخط بھی اس سے متاثر ہوگا۔ اگرچہ کسی بھی دو زبانوں کی آوازیں ایک سی نہیں ہوتیں لیکن اتنی بات

طے ہے کہ کسی بھی زبان کو کسی دوسرے رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کرنا ہوتا ہے کہ نئی آوازوں کے لیے نئی علامتیں وضع کرنی پڑتی ہیں۔ غرض جہاں تک اصول کا تعلق ہے، اردو کے لیے رومن اور دیوناگری دونوں رسم الخط مناسب اضافوں کے ساتھ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں مدتوں تک ہندستانی فوج میں اردو رومن حروف کے ذریعہ سکھائی جاتی تھی، اور اس میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جدید دور میں اردو کتابیں آئے دن دیوناگری میں شائع ہو رہی ہیں، اور ان کے پڑھنے والوں کو کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ نیز جدید لسانیات میں تجرباتی کام کے لیے خواہ وہ کسی بھی زبان سے متعلق ہو، International Phonetic Alphabets یعنی بین الاقوامی صوتیاتی علامتوں کا استعمال ہوتا ہے جو رومن کی توسیعی شکل ہیں، اور ان کے ذریعہ تلفظ کے نازک سے نازک فرق کو بھی سائنسی صحت سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ دنیا میں اردو جہاں جہاں جدید لسانیاتی Aural - Oral طریقہ سے پڑھائی جاتی ہے، وہاں اول اول اردو آوازوں کی صوتی مشق رومن کے ذریعہ کرائی جاتی ہے اور اردو رسم الخط اس کے بعد سکھایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اصولی طور پر اردو دوسرے رسم الخط کے ذریعہ لکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض عالمی زبانوں کی مثال لیجیے: ترکی کے لیے رومن کو اختیار کرلیا گیا ہے، نیز روس کی کئی علاقائی زبانوں کے لیے روسی رسم الخط استعمال کیا جاتا رہا ہے، لیکن وہ زبانیں زندہ ہیں، اور ان کی نشوونما جاری ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی زبان کو دوسرے رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے، اور اس میں وہ زبان زندہ رہ سکتی ہے۔ اس سے لازم آیا کہ اردو زبان کا تصور اردو رسم الخط کے بغیر ممکن ہے، اور اردو کو دوسرے رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے، اور اس میں وہ زبان زندہ رہ سکتی ہے۔ لیکن جتنا یہ لسانی اصول صحیح ہے کہ کسی بھی زبان کو کسی دوسرے رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے، اتنی ہی یہ حقیقت بھی اہم ہے کہ اردو اور ہندی میں جو قریبی لسانی رشتہ ہے، اس کی نظیر دنیا کی کسی دو بڑی زبانوں میں جن کا رسم الخط تبدیل کیا گیا ہو، نہیں ملے گی۔ اول تو اردو اور ہندی میں جو فرق ہے وہ صرفی ونحوی سطح پر ضمنی نوعیت کا ہے،

اصل فرق صوتیات، لفظیات اور معنیات کا ہے جس کی حد بندی رسم الخط اور صرف رسم الخط سے ہوتی ہے۔ چنانچہ رسم الخط میں تبدیلی کے مشورے کو ماننے کا مطلب ہوگا کہ ہم اردو کی انفرادیت سے ہاتھ اٹھانے کو تیار ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہندی کو جو کل ہند حیثیت حاصل ہے، اور اس کی پشت پر جو ہمہ گیر لسانی طاقت ہے، جس کا سکہ پنجاب اور راجستھان سے بہار تک چلتا ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ یہ سارا علاقہ ہندی کے تصرف میں ہو، اتفاق سے اردو کا علاقہ بھی اسی علاقہ کا حصہ ہے؛ چنانچہ رسم الخط بدل دینے سے اردو کی حیثیت ایک اسلوب کی ہوجائے گی، علاقائی اسلوب کی بھی نہیں، محض سماجی اسلوب کی۔ ظاہر ہے کہ اردو زبان جس کی پشت پر صدیوں کی تاریخ ہے اور جس کا عظیم الشان علمی و ادبی سرمایہ ہے، محض ایک سماجی اسلوب کی حیثیت پر قانع نہیں ہوسکتی۔ غرض اردو رسم الخط تبدیل کرنے کا مشورہ اصولی طور پر قابل عمل ہوتے ہوئے بھی لسانیاتی اور تہذیبی دونوں نقطۂ نظر سے ناقابل عمل ہے۔ نیز سوال صرف دیوناگری کو اپنانے کا نہیں، اپنے رسم الخط کو چھوڑنے کا بھی ہے، یعنی یہ کہ وہ رسم الخط جس سے ہم صدیوں سے مانوس رہے ہیں، اور جس کی حیثیت ہمارے صدیوں کے علمی و ادبی سرمائے کی کنجی کی ہے، اس میں ایسی کیا کمزوری یا خرابی ہے کہ ہم خواہ مخواہ اس سے دست بردار ہوجائیں؟

دوسرا مفروضہ جس کی تردید ضروری ہے یہ کہ اردو رسم الخط غیر ملکی ہے۔ ہندوستان کی بیس سے زائد زبانوں میں سے جن دو زبانوں کا رسم الخط خاص طور پر بدلنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، وہ اردو اور سندھی ہیں، اور اس مشورے کی تہہ میں شعوری یا لاشعوری طور پر یہی جذبہ کارفرما ہے کہ ان زبانوں کا رسم الخط غیر ملکی ہے، اس لیے قومی یکجہتی کی راہ میں سنگ گراں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا رسم الخط سامی الاصل ہے، عربی سے اسے فارسی نے لیا اور فارسی سے اردو نے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارا رسم الخط کلیتہً عربی فارسی رسم الخط کی نقل ہے بلکہ علامہ کیفی کی اصطلاح میں صدیوں کے استعمال سے اس کی تارید یا تہنید ہوچکی ہے۔ یہ رسم الخط اب اردو اور صرف اردو کا رسم الخط ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یہ جاننا ضروری

ہے کہ مصمتوں میں ز، ذ، ض اور ظ کا تلفظ عربی میں الگ الگ ہے جبکہ اردو میں ان چاروں علامتوں کو ایک ہی صوت یعنی ز کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح کئی دوسری علامتوں کی بھی تہنید ہوچکی ہے اور انھیں ان کی مقابل ہندآریائی آوازوں میں ضم کردیا گیا ہے، مثلاً ث اور ص کو ہم نے س کی آواز میں، ح کو ہ کی آواز میں، اور ط کو ت کی آواز میں ملاکر عربی الاصل آوازوں کی انفرادیت ختم کردی ہے۔ عربی میں ہمزہ مصمتہ ہے اور اس کے بغیر کسی مصوتہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا لیکن اردو میں اس کی ایسی کایاکلپ ہوئی ہے کہ یہ حرفِ بے صوت ہوکر رہ گیا ہے اور اس کا استعمال ہم محض دو مصوتوں کے لفظ میں ایک ساتھ آنے کے لیے کرتے ہیں۔ تارید کے اس عمل کا دوسرا رخ ان اضافوں سے متعلق ہے جو ہم نے اردو رسم الخط میں کیے ہیں۔ ہمارے مصوتے دس کے دس وہی ہیں، جو دیوناگری کے ہیں، ان میں سے چار یعنی یاے مجہول (لینا، دینا)، واوَ مجہول (بولنا، تولنا)، یاے لین (پَیر، بَیر)، واوَ لین (پَودا، سَودا) کا تصور عربی یا فارسی سے نہیں بلکہ اردو سے مخصوص ہے۔ اردو رسم الخط میں زیادہ اضافے معکوسی اور ہکار علامتوں میں ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر عربی یا فارسی میں ٹ، ڈ اور ڑ کا تصور نہیں، یہ معکوسی آوازیں اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ اور ڑھ ہندوستان سے مخصوص ہیں، اور اردو والوں نے اس کے لیے نئی علامتیں وضع کی ہیں۔ یہی معاملہ آٹھ بندشی ہکار آوازوں یعنی بھ، پھ، تھ، دھ، چھ، جھ اور کھ، گھ کا ہے۔ ہم نے بندشی حروف اور ہاے دوچشمی دوسروں سے لیے، لیکن ب، پ کو ہاے دوچشمی سے ملاکر ہکار آوازوں کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت اردو ہی میں پیش آئی۔ یہ آٹھ ہکار بندشی اور چھ معکوسی یعنی چودہ آوازیں اردو کی اردوئیت کا لازمی عنصر ہیں۔ اردو کے صوتی توازن کی یہ دلچسپ مثال ہے کہ جس طرح ف، ز، خ، غ اور ق غیرملکی آوازوں کے بغیر اردو کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مذکورہ بالا چودہ دیسی آوازوں کے بغیر بھی اردو کا تصور ناممکن ہے۔ 36 حروف کے رسم الخط میں چودہ حروف صحیح اور چار حروف علت کی آوازوں کے تصور کا اضافہ اردو میں تہنید کے عمل کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ ان اضافوں سے ہم نے ایک نیا

ملاجلا رسم الخط بنایا ہے جو اردو کے فطری تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے۔ بلاشبہ ہم نے اسے عربی فارسی سے لیا ہے، لیکن ہند آریائی صوتیاتی نظام کا ساتھ دینے کے لیے چودہ آوازوں کے تصور کا اضافہ کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ اتنی تبدیلیوں کے بعد یہ رسم الخط اس حد تک ہمارا اپنا بن گیا ہے کہ تبدیل شدہ صورت میں عرب اور ایرانی اسے اپنا کہنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ ان حالات میں اسے عربی فارسی رسم الخط کہنا غلط ہے، اور ہمیں اس کو اردو رسم الخط کہنے پر اصرار کرنا چاہیے۔ جس طرح اردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے، اسی طرح اردو رسم الخط بھی ایک آزاد اور مستقل رسم الخط ہے۔ جہاں تک دوسروں سے کچھ لینے کا سوال ہے تو اخذ و قبول کا عمل ہندستانی زندگی کے کس شعبے میں نہیں ملتا۔ ویدک زمانے میں تہذیبی لین دین دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کے درمیان ہوا، عہدِ وسطیٰ میں اختلاط و ارتباط کا یہی عمل ہندی اور اسلامی تہذیبوں کے درمیان جاری رہا، اور اس کی کارفرمائی ہمارے سماج کے ہر شعبہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آج کس کو فکر ہے کہ حلوا، برفی، فالودہ، قلاقند، قورمہ، کوفتہ اور بریانی کی وطنیت کیا ہے یا قمیص، پائجامہ، شلوار اور شیروانی کہاں سے آئے تھے، یا شریفہ، انگور، سنگترہ، سردہ اور سیب ملکی ہیں یا غیر ملکی؟ جب ان سب چیزوں کو ہم اپنا سمجھتے ہیں اور انھیں ہندستانی تصور کرتے ہیں تو اس رسم الخط کو جسے ہم نے صدیوں پہلے اپنا لیا تھا، اور جس کے چلن کی حیثیت ہماری تہذیب کے جسم میں خون کی روانی کی سی ہے، ہم اسے غیر ملکی کیوں سمجھتے ہیں اور اُسے ہندستانی کیوں نہیں کہتے؟

3

اس مقام پر ایک نظر اردو رسم الخط کے صوتیاتی تجزیے پر ڈال لینی چاہیے۔ اردو رسم الخط کو اگر مصمتوں کا نگارخانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہمارے ہاں جتنی علامتیں ہیں، ان کے مقابل اتنی آوازیں نہیں۔ سائنسی رسم الخط میں آواز اور علامت میں ایک اور ایک کی نسبت ہوتی ہے۔ بندشی آوازوں میں ہمارے ہاں سوائے ایک کے کوئی علامت فاضل نہیں، یعنی پ، ب، ت، د، ٹ، ڈ، چ، ج، ک، گ اور ق۔

ان گیارہ علامتوں میں ایک اور ایک کی نسبت ہے، صرف ت کے لیے ط کی صورت میں دوسری علامت موجود ہے۔ (ق کا چلن پاکستان میں نسبتاً کم ہے اور حیدرآباد دکن میں یہ آواز قریبی صفیری آواز خ میں بدل جاتی ہے، لیکن شمالی ہندوستان کے اردو علاقوں میں اب بھی اس کی انفرادیت برقرار ہے)۔ دس بندشی ہکار آوازیں یعنی پھ بھ، تھ دھ، ٹھ ڈھ، چھ جھ اور کھ گھ خالص ہند آریائی آوازیں ہیں اور ان کا ایک سٹ کی حیثیت سے اردو میں موجود ہونا اس کے ہندآریائی زبان ہونے کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ دیوناگری میں ہکار آوازوں کے لیے الگ الگ علامتیں ہیں، اردو میں ایسا نہیں۔ لیکن چونکہ ان آوازوں میں ہکاریت مشترک عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اردو میں الگ الگ علامتوں کی کمی کو ہائے دوچشمی سے ملا کر لکھنے سے پورا کرلیا گیا ہے۔ ایسا کرنے سے ہماری ضرورت بھی پوری ہوگئی ہے اور ایک طرح کی کفایت بھی ہوگئی ہے کیونکہ دس علامتوں کا کام ہم ایک علامت سے لیتے ہیں۔

اردو میں فاضل علامتوں کی بڑی تعداد صفیری آوازوں میں ملتی ہے، یعنی ز کے لیے ہمارے پاس ذ، ض اور ظ فاضل ہیں، س کے لیے ث اور ص فاضل ہیں، اور ہ کے لیے دوسری علامت ح ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی وہ مخصوص آوازیں بھی جو کسی دوسری ہندآریائی زبان میں اس کثرت سے نہیں ملتیں، اس کے صفیری سٹ سے تعلق رکھتی ہیں، یعنی ف، ز، ژ، خ اور غ۔ بشمول ق کے یہ وہ چھ علامتیں ہیں جن سے اردو اور ہندی کی صوتیاتی حد بندی ہوتی ہے، اور یہی وہ آوازیں ہیں جن سے اردو صوتیات کی معیار بندی ہوتی ہے۔ اردو لب و لہجہ میں جو مخصوص توانائی، شستگی اور چستی ملتی ہے، اس میں بڑا ہاتھ ان ہی صفیری آوازوں کا ہے، اس کے برعکس ہندآریائی میں ف کی آواز ''پھ'' میں، ز اور ژ ''ج'' میں، خ ''کھ'' میں اور غ ''گ'' میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس طرح اگر ایک طرف اردو آوازوں کا بندشی سٹ سرتاسر ہندآریائی یعنی دیسی ہے تو دوسری طرف صفیری سٹ ہندایرانی یعنی فارسی سے ماخوذ ہے، اور یہ دونوں مل کر اردو کی ملی جلی یعنی گنگاجمنی صوتیات کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔ پس واضح رہے کہ اردو رسم الخط کی آوازیں سب کی سب خالص

ہندستانی نہیں، بلکہ اردو کی صوتیات ملی جلی ہند ایرانی ہے، جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا۔

اردو کے باقی مصمتوں یعنی پہلوی آوازوں میں ل، غنائی آوازوں میں م اور ن، اور تھپک دار آوازوں میں ر اور ڑ میں کوئی علامت فاضل نہیں، اور حرف و صوت میں ایک اور ایک کی نسبت ہے۔

اردو رسم الخط کو جس چیز نے کفایتِ حرفی کا شاہکار بنادیا ہے، وہ حروف علت کی حیرت انگیز کمی ہے۔ یہی خوبی بعض سطحوں پر پیچیدگیاں بھی پیدا کرتی ہے۔ اردو میں حروفِ علت یوں تو چار ہیں، الف، واؤ، یائے معروف اور یائے مجہول، لیکن صحیح معنوں میں حرفِ علت صرف ایک ہے یعنی الف، کیونکہ واؤ اور یائے بہ طور نیم مصوتہ یا نیم حرفِ صحیح بھی استعمال ہوتے ہیں۔ (وہاں، گواہ؛ یہاں، گویا)۔ غور فرمایئے، اردو میں مصوتوں کے لیے بنیادی حرف تو صرف ایک ہے لیکن مصوتے دس ہیں۔ حروفِ علت کی یہ کمی دوسرے حروف کے ضمنی استعمال اور اعراب کے استعمال سے پوری کی جاتی ہے۔ دس مصوتوں کی آوازیں یوں ہیں :

مِل، میل (فاصلہ کے معنی میں)، میل (میل جول)، مَیل، مَل، مال، مول (مول تول) مُول (درخت کا مُولنا) مُل اور مُول (بمعنی جڑ یا بنیاد)

گویا صرف مال میں حرف علت کا فرق الف کی مدد سے ظاہر کیا گیا ہے، مِل، مَل اور مُل میں یہ فرق اعراب یعنی زبر، زیر، پیش کی مدد سے ظاہر ہوا ہے، لیکن جہاں تک باقی چھ مصوتوں یعنی میل، میل، مَیل یا مؤل، مَول اور مول کا تعلق ہے تو عام تحریر میں ان کے فرق کو ظاہر کیا ہی نہیں جاتا۔

ع کی حیثیت عربی میں حرف صحیح کی ہے، لیکن اردو کے عام لہجہ میں اس کا تلفظ حرفِ علت کا سا ہے اور یہ اردو کے دس مصوتوں میں سے کسی کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں :

عِبرت	(مِل)	عید	(مِیل)
شعر	(میل)	عَیش	(مَیل)
عَدل	(مَل)	عام	(مال)

بُعد	(مول)	عَور	(مَول)
عُمر	(مُل)	شعوٗر	(مؤل)

ہمزہ کا حال ع سے بھی عجیب ہے، یعنی اردو میں اس کی کوئی آواز ہی نہیں۔ مثال کے طور پر جاؤں، آؤں میں اوں کی آواز کے لیے واؤ اور نون غنہ موجود ہے، یہ ہمزہ کی آواز نہیں۔ اسی طرح کئی، گئی، کوئی یا سوئی کا معاملہ ہے۔ ان میں ای کی آواز یائے معروف کی آواز ہے۔ غائب صائب میں بھی ہمزہ بے آواز ہے، کیونکہ خفیف ای کی آواز دراصل کسرہ کی آواز ہے، ہمزہ کی نہیں۔ ہمزہ اردو میں علامتِ بے صوت ہے، اور اس کا کام دو مصوتوں کے ایک ساتھ آنے کا املائی اعلان کرنا ہے اور بس۔

اس صوتیاتی تجزیہ سے ظاہر ہے کہ قطع نظر بعض فاضل علامتوں کے اِسراف کے اردو رسم الخط کفایتِ حرفی کی اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نیم شکلوں اور جوڑوں کی کثرت کی وجہ سے اردو رسم الخط سیکھنے میں نسبتاً زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، لیکن لکھنے اور پڑھنے میں یہ اتنا ہی آسان بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی رسم الخط کا سیکھنا فرد کی زندگی میں ایک محدود عمل ہے جو عمر کی ایک خاص منزل پر انجام پا جاتا ہے، جبکہ اس کا استعمال نسبتاً لامحدود عمل ہے جو ساری عمر جاری رہتا ہے۔ اس لیے اردو رسم الخط کی آسانیاں اور اس کا فائدہ سامنے کی بات ہے۔ بنیادی طور پر اردو کی کفایتِ حرفی کا تعلق حروف علت کی کمی سے ہے۔ کسی بھی زبان میں لفظ تو لفظ، صوتی رکن بھی بغیر مصوتہ کے ادا نہیں ہوسکتا۔ گویا مصوتے، مصمتوں سے کئی گنا زیادہ استعمال ہوتے ہیں، اور اردو میں یہی مصوتے اکثر و بیشتر بغیر علامت کے لکھے جاسکتے ہیں۔ یوں تو مصوتوں کے لیے اعراب موجود ہیں، لیکن ان کو لگاتا کون ہے؟ ہم بجائے اعراب کے عموماً اعراب کے صفریہ تصور (Zero Concept) سے کام لیتے ہیں، اور عام طور پر چلن کی بنا پر ہمیں لفظ کے صحیح تلفظ میں دقت نہیں ہوتی۔ یہی وہ خوبی ہے جو اردو رسم الخط کو مختصر نویسی کے قریب لے آتی ہے اور اس کے استعمال میں آسانیاں پیدا کرتی ہے۔

4

البتہ توسیع شدہ اور ملا جلا رسم الخط ہونے کی وجہ سے اردو رسم الخط میں بعض پیچیدگیاں بھی ہیں جو الجھن کا سبب بنتی ہیں۔ اس میں کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جن کی تہذیب نہیں ہوسکی۔ قدما کے بعد اردو میں تارید وتہذیب کا عمل بہت کچھ رک سا گیا تھا جس کے خلاف حالی نے اور ان کے بعد مولوی عبدالحق اور علامہ کیفی نے آواز اٹھائی تھی۔ تہذیب کے سلسلے میں آج تک بحث ہمیشہ لفظیات کی کی گئی ہے۔ ضروری ہے کہ اب یہ سوال حرف وصوت کے بارے میں بھی اٹھایا جائے اور اردو کی طباعتی اور تدریسی ضرورتوں کو بھی سامنے رکھا جائے۔ اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل امور پر غور کیا جاسکتا ہے:

اردو رسم الخط کا سب سے بڑا مسئلہ دوہری اور تہری علامتوں کا ہے یعنی ز کی آواز چار طرح سے لکھی جاتی ہے (ز، ذ، ض اور ظ سے) س کی آواز کے لیے تین علامتیں ہیں (س، ث اور ص) اور ت کے لیے ط، اور ہ کے لیے ح بھی موجود ہے۔ نیز ع کی تاک جھانک مصوتوں کے ساتھ برابر جاری رہتی ہے۔ گویا اردو رسم الخط میں آٹھ علامتیں (ذ، ض، ظ، ث، ص، ط، ح، ع) فاضل ہیں۔ رسم الخط کے سائنسی ہونے کے لیے آواز اور علامتوں میں ایک اور ایک کا رشتہ ہونا ضروری ہے۔ اس لیے بعض حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر اردو رسم الخط سے ان آٹھ فاضل علامتوں کو نکال دیا جائے تو نہ صرف یہ سائنٹفک ہوجائے گا بلکہ اس کی علامتوں میں ایک چوتھائی کی کمی بھی ہوجائے گی جس سے اس کی کفایت حرفی کی صلاحیت اور لکھنے پڑھنے کی آسانیوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ ان فاضل علامتوں کے نکال دینے سے اردو الفاظ کے تلفظ میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا، مثال کے طور پر خط کو ط سے لکھیے یا ت سے یا حالت کو ح سے لکھیے یا ہ سے، تلفظ وہی کا وہی رہے گا:

مجوزہ طریقہ	موجودہ طریقہ
فیسلہ	فیصلہ

ثابت	سابت
ظالم	زالم
ذکا	زکا
ضمیر	زمیر
طومار	تومار
صبر	سبر
حادی	ہادی

اس میں شک نہیں کہ صوتی اعتبار سے یہ تجویز ناقابل عمل نہیں، لیکن تہذیبی اور سماجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس پر عمل کرنے سے اتنا فائدہ نہیں جتنا نقصان ہوگا۔ رسم الخط صرف آوازوں کے اظہار کا نام نہیں، یہ وسیع تر لسانی روایت کا جزو بھی ہے۔ رسم الخط بنیادی طور پر آواز کو ظاہر کرتا ہے لیکن بالواسطہ طور پر آوازوں کے ذریعہ لفظوں کو اور لفظوں کے ذریعہ جملوں اور عبارتوں اور اس طرح پوری زبان کی ترسیل و تفہیم کا آلۂ کار ہے۔ اس سارے سلسلہ میں لفظ کی خاصی اہمیت ہے۔ یہ بات پہلے کہی جاچکی ہے کہ اردو کی اردوئیت جہاں اس کی مخصوص صوتیات سے قائم ہوتی ہے، وہاں مخصوص لفظیات سے بھی اس کا تعین ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جتنا اہم اس کا دیسی جزو ہے، اتنا ہی اہم اس کا عربی فارسی جزو بھی ہے۔ اس جزو میں مذکورہ بالا آٹھ فاضل علامتیں بطور خاص الخاص اصوات کے استعمال ہوتی ہیں۔
ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ الفاظ جو تلفظ میں یکساں ہیں، ان میں معنی کا فرق املا کی وجہ سے ان ہی حروف کی بدولت قائم ہوتا ہے، مثلاً عام اور آم، لعل اور لال، جعل اور جال، صدا اور سدا، عرضی اور ارضی، صورت اور سورت، کسرت اور کثرت، نظیر اور نذیر، بعض اور باز، زن اور ظن وغیرہ۔ ان فاضل علامتوں کو رسم الخط سے خارج کرنے کا مطلب ہوگا کہ اول تو یکساں تلفظ والے الفاظ کے معنی میں تمیز کرنا دشوار ہوجائے گا، دوسرے اس سارے ذخیرۂ الفاظ کو جس کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے بجائے بارہ کے صرف چار علامتوں سے لکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس سرمایے

کی صورت مسخ ہوکر رہ جائے گی۔ لکھنے پڑھنے میں اگر ایک طرف کچھ آسانی پیدا ہوگی تو دوسری طرف کئی دقتیں بھی سامنے آئیں گی کیونکہ ہزاروں الفاظ کی صورت علامتوں کی اس تبدیلی سے پہچانی نہ جاسکے گی اور اردو کے قدیم علمی سرمائے سے استفادہ کرنا بھی مشکل ہوجائے گا، نیز اردو لغات کی تمام کتابوں کو دوبارہ تیار کرانا ہوگا۔ اس کے علاوہ جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے بیسیوں ملکوں سے رسم الخط کی بنا پر ہمارا جو تہذیبی رشتہ ہے، وہ بھی مجروح ہوگا۔ غرض یہ کہ صوتیاتی طور پر اردو میں یہ علامتیں مردہ سہی، لیکن تہذیبی نقطۂ نظر سے ان کی زندگی میں کلام نہیں، پھر کئی صدیوں سے یہ اردو میں رائج ہیں، اور ان کے استعمال کی ہمیں عادت سی ہوگئی ہے۔ زبان میں عادت اور چلن کی بڑی اہمیت ہے اور کسی چلن کو اس وقت تک ترک نہیں کیا جاسکتا جب تک اس سے کسی بڑے فائدہ کی توقع نہ ہو۔ کم از کم اس معاملے میں ہمیں زبان کی عملی آسانی کو صوتیاتی صحت پر مقدم رکھنا چاہیے۔ انگریزی رسم الخط اردو سے کچھ کم غیر سائنسی نہیں، اس کی اصلاح کی کوششیں برابر ہوتی آئی ہیں۔ جارج برنارڈ شا نے پورے خلوص نیت سے اس کام کے لیے اپنے وصیت نامے میں جو گراں قدر رقم وقف کی تھی، اس کا جو انجام ہوا ہے، ہم سب پر واضح ہے۔ لہٰذا یہ مشورہ کہ اردو کی فاضل علامتوں کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اگرچہ غیر سائنسی ہے، لیکن تہذیبی اعتبار سے بے معنی نہیں۔

البتہ اگر کسی تبدیلی سے اردو رسم الخط کا پورا تہذیبی ڈھانچہ متاثر نہ ہوتا ہو اور اس کی نوعیت جزوی ہو تو اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ اصلاحات کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اردو لکھنے اور پڑھنے میں آسانی ہو اور کتابیں جلد اور صحت کے ساتھ شائع ہوسکیں۔ ایسی چند اصلاحیں یہ ہوسکتی ہیں:

(1) عربی کا الف مقصورہ اردو میں چونکہ کھپ نہیں سکا، اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے اکثر استعمال ہونے والے الفاظ اردو کے قاعدے سے لکھے جائیں، مثلاً علیحدہ کو علاحدہ، زکوٰۃ کو زکات، رحمٰن کو رحمان، فتویٰ کو فتوا، استغفیٰ کو استعفا، اسمٰعیل کو اسماعیل، ادنیٰ کو ادنا، اعلیٰ کو اعلا اور اولیٰ کو اولا لکھنا مناسب ہوگا۔

البتہ اگر ایسا کوئی لفظ کسی عربی فارسی مثال یا ترکیب یا مصرع میں آئے جس کی حیثیت اقتباس یا مقولہ کی ہو تو اس کو عربی فارسی کے قاعدے سے لکھنا مناسب ہوگا۔

(2) وصل کے الف لام کو جوں کا توں لکھنا چاہیے۔ عبدالستار، فخرالدین، بالترتیب، فی الحال، بالکل۔

(3) واوٗ معدولہ کے سلسلے میں یہ تجویز کہ خورشید کو خرشید لکھنا چاہیے، قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ واوٗ بعض حالتوں میں پیش کے قائم مقام کے طور پر استعمال ہوتی ہے، مثلاً ہُوا (ہونا کی ماضی) ہوئی، ہوئے، دوکان، سوراخ؛ اس کے علاوہ یہ بعض فارسی الفاظ میں خ کے فوراً بعد آتی ہے اور الف سے ملا کر بولی جاتی ہے، مثلاً خواب،خواہش، خواجہ، خواہر، خواہ، خوابیدہ، خود، خوش۔ اس واوٗ کو ظاہر کرنے کے لیے اس کو نیچے لکیر لگا کر لکھنا مناسب ہوگا (خوِاب، خوِاہش، خوِاجہ)

(4) نون اور نون غنہ کا فرق درمیانی حالت میں ضروری ہے۔ ابتدائی کتابوں میں پانچ، سانپ، جھانسی، سونگھنا، پہنچ، مانگ، تانتا وغیرہ الفاظ میں نون غنہ کا اظہار اگر ہلال کے نشان سے کیا جائے تو پڑھنے میں سہولت ہوگی۔ نون غنہ کو منفصل (پھانس کو پھاں س) لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کنوا، کنواں اور کواں میں سے کنوا کو بہتر قرار دیا ہے اور کنوا اور دھنوا لکھنے پر زور دیا ہے۔[1] میرا خیال ہے کہ ان لفظوں میں آخری مصوتہ یقیناً غنیت کا اثر رکھتا ہے۔ [dhũvã̄] [kũvã̄] لیکن اس سے پہلے چونکہ نیم مصوتہ واوٗ ہے، اس کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ یا ذرا پہلے ہوا ناک سے بھی نکلتی ہے جس کی وجہ سے واوٗ سے پہلے کے مصوتے میں بھی غنیت آگئی ہے۔ اس لیے ایسے لفظوں کو لکھنے کا صحیح طریقہ کنواں، دھنواں ہے نہ کہ کنوا اور دھنوا۔

(5) سِن اور سنہ میں فرق کرنا چاہیے۔ سِن عمر کے معنی میں ہے جبکہ سنہ سال کے

1 ''اردو املا'' مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بمبئی 1971، ص 62

لیے ہے۔

(6) اس بات کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اردو مصوتوں میں درمیانی حالت میں یائے معروف، یائے مجہول اور یائے لین لکھنے کے لیے ہمارے پاس ایک ہی علامت ہے مثلاً میل، میل اور میل ایک ہی طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح واوَ معروف، واوَ مجہول اور واوَلین کے لیے بھی ایک ہی علامت ہے یعنی مول، مول اور مول بھی ایک ہی طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ ان کی الگ الگ پہچان کے لیے جو تجویزیں اب تک پیش کی جاتی رہی ہیں، ان میں سب سے بہتر یہ ہیں :

یائے معروف کے لیے	کھڑا زیر	(مِیل، دِہن، مِیرا)
یائے لین کے لیے	ماقبل زبر	(مَیل، بَیل، سَیر)
یائے مجہول کے لیے	صفریہ تصور	(میل، سیر، میرا)
	یعنی اسے خالی رہنے دیا جائے	

اسی طرح

واوَ معروف کے لیے	الٹا پیش	(مُول، چُور، دُور)
واوَلین کے لیے	ماقبل زبر	(مَول، چَوڑا، دَور)
واوَ مجہول کے لیے	صفریہ تصور	(مول، جور، دوست)
	یعنی اسے خالی رہنے دیا جائے	

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مشورہ کہ ''بڑی یے کا استعمال بالکل ترک کردیا جائے'' اردو میں الجھنیں پیدا کرے گا۔ مندرجہَ بالا تجویز کو مان لینے سے نہ صرف بڑی یے کا استعمال صحیح طور پر ہوسکتا ہے بلکہ میزکو مے ز یا میر کو می ر لکھنے کے مضحکہ خیز مشورے سے بھی بچا جاسکتا ہے۔

(7) اردو میں لفظ کے آخر میں الف اور ہائے مختفی کے استعمال کے اصولوں کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے کئی لفظ دونوں طرح سے لکھے جاتے ہیں، جیسے راجہ : راجا، بھروسہ : بھروسا، بٹوارہ : بٹوارا وغیرہ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے متذکرہَ

صدر مضمون میں اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور صحیح مشورہ دیا ہے کہ مختفی ہ فارسی کی چیز ہے، اور صرف ان لفظوں میں لکھی جائے جو فارسی سے آئے ہیں۔ لیکن ان کا یہ بیان ''جہاں تک تلفظ سے بحث ہے، اردو میں مختفی ہ کا وجود نہیں[1]'' محل نظر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ اردو میں خفیف مصوتے لفظ کے آخر میں نہیں آتے لیکن چند لفظ ایسے ضرور ہیں جو الف سے نسبتاً چھوٹی آواز سے ادا ہوتے ہیں، اور ان کو ہائے مختفی ہی سے لکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر پتا اور پتہ، آنا (فعل) اور آنہ (سکّہ) یا جانا کے ''نا'' اور کلمہ نہی ''نہ'' کی آخری آواز کے تلفظ میں فرق ہے۔ آنا، جانا، لینا، دینا وغیرہ کے آخر میں طویل مصوتہ ہے جو الف سے لکھا جاتا ہے، جبکہ پتہ، آنہ، نہ یا آگرہ، پونہ، پٹنہ، کلکتہ کے آخر میں خفیف مصوتہ [ə] ہے جسے ہائے مختفی سے لکھنے کا رواج ہے۔ نیز اردو میں ہائے مختفی [a] کی چھوٹی آواز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، مثال کے طور پر ''بہ'' بمقابلہ ''با'' اور ''کہ'' بمقابلہ ''کے''۔ اس لیے یہ کہنا کہ ہائے مختفی کے تلفظ کا اردو میں سرے سے وجود ہی نہیں، صحیح نہیں ہے۔ البتہ املا کی معیار بندی کے سلسلے میں اس کا تعین کرنا ہوگا کہ بعض ایسے دیسی الفاظ جن کے آخر میں الف آتا ہے، اور جو خواہ مخواہ ہائے مختفی سے لکھے جاتے ہیں، مثلاً ٹھیکہ، باڑہ، بٹوارہ، کھلونہ، راجہ، باجہ، اڈہ، بٹوہ، پٹاخہ، دریہ، گینڈہ۔ ایسے تمام الفاظ کو ہ سے لکھنا نامناسب اور الف سے لکھنا مناسب ہے، یعنی ٹھیکا، باڑا، بٹوارا، کھلونا، راجا، باجا، اڈا، بٹوا، پٹاخا، دریا، گینڈا وغیرہ۔

تصریفی صورت میں افسانہ میں کو افسانے میں...، قصہ کا کو قصے کا... لکھنا چاہیے۔

(8) اردو رسم الخط میں اصلاح کے بعض حامی ہمزہ کی گردن زدنی کے قائل ہیں۔ میں اپنے مضمون ''ہمزہ کیوں'' میں دکھا چکا ہوں کہ ہمزہ کی پوری تہنید ہوچکی ہے اور اس کے بغیر اردو رسم الخط مکمل ہی نہیں۔ اگرچہ اردو میں ہمزہ کی اپنی

1 مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص 54

کوئی آواز نہیں، لیکن ایک املائی تصور کی حیثیت سے ہمزہ کو اردو میں قبول کیا جاچکا ہے۔ یہ صرف مستعار الفاظ میں نہیں بلکہ دیسی مادوں اور اردو افعال کی تصریفی صورتوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل الفاظ ہمزہ کے بغیر صحیح طور پر لکھے ہی نہیں جاسکتے:

کئی، گئے، فرمایئے، آیئے، نئے، بھائی، نائی،
جائیں، آئیں، جاؤ، پاؤ، کیکئی۔

البتہ ہمزہ کے استعمال میں خاصی بے راہ روی ہے، اور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کے ہاں بھی اس کے غلط استعمال کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ چنانچہ ہمزہ کے استعمال کے اصول طے ہونے چاہئیں، اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔ ایسے چند اصول یہ ہیں:

(9) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ''اردو املا'' پر اپنے مضمون میں ہمزہ کے استعمال کے سلسلے میں یہ اصول پیش کیا ہے: ''جب دو حروف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو ان کے بیچ میں ہمزہ آسکتا ہے[1]''۔ یہ اصول آؤ، جاؤ، کھائے، جائے کے لیے تو صحیح ہے، لیکن نئے، گئے، کئی کے لیے صحیح نہیں جن میں صرف ایک حرف علت ہے اور ہمزہ لگایا جاتا ہے؛ نیز دیے، لیے میں اگرچہ دو حروف علت ہیں لیکن ان کا صحیح املا ہمزہ کے بغیر ہی ہے۔ میرے نزدیک ہمزہ کے استعمال کے معاملہ میں بنیادی چیز تلفظ ہے، چنانچہ میرا اصول ہے کہ اگر کسی لفظ میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں تو اسے ہمزہ سے لکھنا چاہیے، ورنہ نہیں (نائب، غائب، فائدہ، کھائے، آؤ، گئے، اٹھایئے، جایئے)۔ ہونا کی ماضی ہوا کو اگرچہ بعض حضرات ہؤا لکھتے ہیں، لیکن اس کو اس کلیے سے مستثنا سمجھنا چاہیے۔ نیز دو مصوتوں کا جوڑ جہاں عین سے آتا ہے، وہاں ہمزہ استعمال نہیں ہوتا۔

(10) جن الفاظ میں مصوتہ اور نیم مصوتہ ی کا جوڑ ہے، وہ ہمزہ سے نہیں لکھنا چاہیے

1 اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص 63

(لیے، لیجیے، دیے، پیجیے، دیکھیے، سنیے، چاہیے، کیے، کیجیے، دیجیے)۔
(11) ذیل کے لفظوں میں دو مصوتے آتے ہیں، اس لیے ہمزہ لکھنا چاہیے:
فرمائیے، آئیے، جائیے، کھوئیے، سوئیے۔
(12) اضافت کے لیے ہمزہ صرف ان الفاظ پر لگتا ہے جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں۔ (جذبۂ دل، نالۂ درد) جہاں ہ تلفظ میں ادا ہوتی ہو، وہاں اضافت کسرہ سے لکھی جاتی ہے (آہِ سرد، تہِ دل، وجہِ جواز، ماہِ نو)۔
(13) اضافت کے لیے الف یا واؤ کے بعد ہمزہ لکھنا مناسب ہے کیونکہ دو مصوتے ساتھ ساتھ آتے ہیں: اردوئے معلّیٰ، نوائے ادب، آرزوئے دل، روئے زیبا، صدائے دل خراش۔
(14) باقی تمام حالتوں میں اضافت کسرہ سے ظاہر کی جائے گی: دردِ دل، جانِ عالم، دستِ دعا، شمعِ روشن، زندگیِ بے ثبات، رائے عالی، رعنائیِ خیال، والیِ ریاست، عہدِ قدیم، نگاہِ کرم۔
(15) عربی الفاظ طلباء، انشاء، منشاء، امراء، وزراء، فقراء اردو میں صرف آخری الف سے بولے جاتے ہیں، یعنی ان میں دو مصوتوں کا جوڑ نہیں، اس لیے انھیں ہمزہ سے لکھنا مناسب نہ ہوگا۔ البتہ اگر پوری ترکیب عربی کی ہے تو وہاں ہمزہ کو برقرار رکھنا چاہیے، مثلاً انشاء اللہ، منشاء الرحمٰن، ذکاء اللہ؛ یہی حال سوءِ اتفاق، سوءِ ظن وغیرہ ترکیبوں کا ہے۔
(16) بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہمزہ صرف وہاں لکھنا چاہیے جہاں آواز ٹوٹ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصولی طور پر آواز ہر صوتی رکن کے بعد ٹوٹتی ہے، مثلاً وسوسہ، گرداب، زندگی، اشتہار، انتظار، اضطراب، لیکن کہیں بھی ہمزہ کے استعمال کا محل نہیں۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ جہاں دو مصوتے ایک ساتھ آئیں تو ہمزہ لکھنا چاہیے، مناسب ہے۔ مثلاً زیبائی، رعنائی، بے وفائی، جائے، کھائے، آئیں، جائیں، جاؤں، لاؤ، آؤ؛ یا اگر ایک طرف حرف علت ہو اور دوسری طرف زیر، زبر یا پیش ہو تو بھی ہمزہ لکھنا چاہیے، مثلاً نئے، گئے، کئی

وغیرہ۔

(17) جاؤ، کھاؤ، آؤ کے مقابلے میں ناو، بناو کو ہمزہ کے بغیر لکھنا صحیح ہے، کیونکہ ان لفظوں میں آخری آواز مصوتہ نہیں بلکہ نیم مصوتہ واؤ ہے۔

(18) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا یہ مشورہ کہ گائے، چائے، رائے، ہائے میں بھی ہمزہ نہ چاہیے[1]، قابل قبول نہیں۔ اس لیے کہ اردو تلفظ میں ان لفظوں میں آواز نیم مصوتہ ی پر نہیں بلکہ مصوتہ الف پر ختم ہوتی ہے۔ ان لفظوں کو گائے، چائے، رائے، ہائے لکھنا مناسب ہے۔

(19) اردو میں ہائے دوچشمی کو ہکار آوازوں کے لیے مخصوص کردینا چاہیے، یعنی بھاری، پتھر، ہاتھ، کبھی، بھیج، بھی، جھوٹ، مجھے، بجھ، کچھ وغیرہ کو بہاری، پتہر، ہاتہہ، کبہی، بہیج، بہی، جہوٹ، مجہے، بجہہ، کچہہ لکھنا مناسب نہ ہوگا۔ ہائے دوچشمی کو صرف مخلوط آوازوں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ ذیل کے لفظوں کو ہائے دوچشمی سے لکھنا مناسب ہے: تمھارا، انھیں، تمھیں، جنھیں، ننھا، تمھارا، ننھیال۔

(20) اردو رسم الخط میں یوں بھی حروف ملاکر لکھے جاتے ہیں۔ لفظوں کو ملانے سے اور بھی پیچیدگی پیدا ہوگی۔ چڑھیگا، کرینگے، اٹھنگے، سنیگی، پڑھینگی میں علامت مستقبل گا، گے، گی کو ملاکر لکھنے کی جو لوگ حمایت کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ علامتِ مستقبل آزادانہ استعمال نہیں ہوتی، اس لیے اسے فعل سے ملاکر لکھنا چاہیے۔ اس اصول کو اگر تسلیم کرلیا جائے تو پھر کو، نے، سے، پر، تک، میں وغیرہ حروف جار بھی آزادانہ استعمال نہیں ہوتے، ان کو بھی اسم سے ملاکر لکھنا لازم آئے گا۔ دیوناگری میں ان کو ملاکر لکھنے کا رواج ہے، لیکن ہمارے رسم الخط کا مزاج دوسرا ہے، اس میں لفظوں کو الگ الگ لکھنا ہی مناسب ہے۔

(21) سابقوں اور لاحقوں کو ملاکر لکھنا چاہیے۔

(22) اردو رسم الخط کا ایک مسئلہ حروف کی کرسی اور ان کے جوڑوں کا ہے۔ نستعلیق

1 اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص 63

میں جوڑوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نستعلیق کا اطمینان بخش ٹائپ یا ٹائپ رائٹر آج تک تیار نہیں ہوسکا۔ اردو میں اکثر و بیشتر حروف کی چار شکلیں ہیں، ابتدائی، درمیانی، آخری اور آخری غیر مخلوط۔ مثلاً عادت، بعد، نفع اور دفاع میں ع کی شکل ہر جگہ بدلی ہوئی ہے۔ اصلاح کی ایک تجویز یہ رکھی گئی ہے کہ ''ہر حرف کی زیادہ سے زیادہ دو شکلیں رکھی جائیں، ایک لفظ کے شروع یا درمیان کے لیے اور ایک آخر کے لیے۔ اس طرح ہر حرف کی پوری یا آدھی شکل نمایاں، واضح اور قطعی رہے گی[1]''۔ اس تجویز کے تسلیم کرنے میں چند قباحتیں ہیں۔ اول یہ کہ جب نستعلیق پڑھنے لکھنے کی مشق ہوجاتی ہے تو جوڑوں کی کثرت سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور اردو لکھنے والے انھیں آسانی سے لکھ لیتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ حروف جو بعد میں آنے والے حروف کے ساتھ ملائے نہیں جاسکتے، ان کی پہلے ہی صرف دو شکلیں ہیں، مثلاً درد اور دید میں د، یا رب اور سرد میں ر۔ رہی ٹائپ کی بات، تو اگر نستعلیق سے جوڑوں کی تعداد کو کم کیا جائے تو اس میں اور نسخ میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ نستعلیق کا سارا حسن ہی اس کے شوشوں، قوسوں اور دائروں میں ہے۔ تو پھر جوڑوں کی تعداد گھٹا کر نستعلیق کو مسخ کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

5

اس مضمون کی بحث سے جو نتائج نکلتے ہیں، مختصراً وہ یوں ہیں :

(1) اردو کے جو ادیب رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ دیتے ہیں، ان کے خلوص پر شبہہ کرنا یا انھیں اردو دشمن قرار دینا غلط ہے۔ یہ لوگ اکثریت کے ردعمل سے مجبور ہوکر اس طرح کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کے مشورے کی پشت پر شہری اور عوامی زبان کا جو لسانی نظریہ ہے، وہ اردو اور ہندی کے مخصوص تہذیبی اور لسانی رشتے کو سمجھنے میں معاون ثابت نہیں ہوتا، اس لیے اس سے غلط نتائج نکلتے

1 ہماری زبان، 15 فروری 1971، ص 12

ہیں۔ اردو رسم الخط میں تبدیلی کا مشورہ نا قابلِ عمل ہے۔

(2) قومی یکجہتی کے نام پر بھی رسم الخط میں تبدیلی مناسب نہ ہوگی۔ اس سے قومی یکجہتی کو اتنا فائدہ نہیں جتنا نقصان پہنچے گا۔ اگر پورے ملک کی لسانی یکسانیت کے لیے سب زبانوں کے رسم الخط میں تبدیلی کا سوال ہو تو بات دوسری ہے، ورنہ صرف اردو کے لیے ایسی تجویز پیش کرنا خود قومی یکجہتی کے منافی ہے۔ کیونکہ ایک لسانی اقلیت ہمیشہ کے لیے اپنے رسم الخط سے محروم ہو جائے گی جس کا نتیجہ مستقل بدگمانی اور بے اطمینانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ نیز پاکستان اور جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے جن بیسیوں ملکوں سے رسم الخط کی وجہ سے ہمارا تہذیبی رشتہ استوار ہوتا ہے، اس تبدیلی سے وہ بھی متاثر ہوگا۔ ہندستانی تہذیب کی بنیاد رنگارنگی اور کثرت پر ہے۔ سوال عناصر میں ہم آہنگی کا ہے، عناصر کو مٹانے کا نہیں۔ چنانچہ اس ملک میں جہاں متعدد دوسرے رسم الخط ہیں، اور انھیں زندہ رہنے کا حق ہے تو اردو رسم الخط کو بھی زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیے۔

(3) یہ بات صحیح نہیں کہ اگر رسم الخط نہ رہے تو زبان ختم ہو جائے گی۔ زبان رسم الخط کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے، لیکن اردو اور ہندی میں جو مخصوص لسانی رشتہ ہے، اور جس طرح دونوں کی بنیاد ایک ہی عوامی بولی پر ہے، اس کے پیشِ نظر رسم الخط کی تبدیلی سے اردو کی انفرادیت کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے۔

(4) اردو کا رسم الخط غیر ملکی نہیں۔ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے عربی فارسی ہے، لیکن یہ اس حد تک 'اردوایا' جا چکا ہے کہ یہ اردو کا اپنا رسم الخط بن چکا ہے۔ اس میں اتنی علامتوں اور آوازوں کا اضافہ ہوا ہے کہ موجودہ صورت میں اسے عربی یا فارسی والے من وعن اپنا رسم الخط نہیں کہہ سکتے۔ اردو زبان کی طرح اردو رسم الخط کی بھی اپنی آزادانہ اور مستقل حیثیت ہے۔ اس رسم الخط کو اردو رسم الخط کہنے پر اصرار کرنا چاہیے۔

(5) اردو رسم الخط کی سب سے بڑی خوبی مصوتوں کے لیے علامتوں کی حیرت انگیز

کمی ہے۔ اس سلسلے میں اعراب کے صفریہ تصور سے کام لینے کا رواج ہے جس سے یہ رسم الخط کفایت حرفی کی بہترین مثال پیش کرتا ہے اور مختصر نویسی کے قریب آ گیا ہے۔

(6) اردو رسم الخط میں مصمتوں کے لیے کئی دوہری اور تہری فاضل علامتیں ہیں، لیکن ان کو نکالنے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ ایسا کرنے سے اردو کے عربی فارسی ذخیرۂ الفاظ کی صورت مسخ ہوجائے گی اور قدیم علمی سرمایے سے استفادہ مشکل ہوجائے گا۔

(7) اردو ایک آزاد اور خود مختار زبان ہے۔ اس کا رسم الخط اس کا اپنا رسم الخط بن چکا ہے۔ البتہ تہذید کا عمل رک جانے سے جو ضمنی اصلاحیں اب تک نافذ نہیں ہوسکیں، ان کو نافذ کرنا چاہیے۔ 1944 کی ناگپور کانفرنس سے ان اصلاحوں پر غور ہورہا ہے، لیکن اب تک کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ہماری بے حسی ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ وقت ہمارا انتظار نہیں کرے گا، ہمیں اپنے باعمل ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔

(رسالہ جامعہ، دہلی، فروری مارچ 1972)

اردو املا اور لسانیات

(روایت اور اجتہاد کی روشنی میں)

خدا بخشے مولانا انور صابری بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، ڈیل ڈول اور وضع قطع سے بھی خاصے دلچسپ معلوم ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے ایک بار بستی حضرت نظام الدین اولیا میں مشاعرہ ہورہا تھا۔ جب انھیں دعوت کلام دی گئی اور وہ مائیک پر تشریف لائے تو ایک فوٹو گرافر نے کھٹ سے اُن کی تصویر کھینچ لی۔ مولانا از رہِ انکسار فرمانے لگے ''بھئی میری تصویر کس لیے لے رہے ہو''۔ جناب صدر نے برجستہ کہا: ''مولانا یہ بچوں کو ڈرانے کے کام آئے گی''۔ کچھ حضرات اردو رسم الخط اور املا کے مسائل پر لکھتے ہوئے لسانیات کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا لسانیات سے سادہ لوح لوگوں کو ڈرانے کا کام لے رہے ہوں۔ ان مباحث میں لسانیات کو خواہ مخواہ ایک ہوّا بنا کے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اس خوش فہمی کی بنا پر بھی ہوتا ہے کہ اردو میں صوتیات اور لسانیات کے بارے میں معلومات عام نہیں ہیں، سو کیوں نہ لسانیات کو بُرا بھلا کہہ کر عام پڑھنے والوں کو گمراہ کیا جائے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں۔ اس نیک کام کا آغاز رشید حسن خاں نے کیا لیکن بس ایک دو جملوں کی حد تک۔ اس سے زیادہ وہ نہیں چلے، کیونکہ ایک تو وہ اپنی کتاب ''اردو املا'' میں صوتیات سے مدد لے چکے تھے، دوسرے وہ ایک ایسی فضا میں رہتے ہیں جہاں وہ آسانی سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان کی مخالفت یا عدم مخالفت سے کچھ ہونے والا نہیں۔ لسانیات ایک نہایت مضبوط سائنسی علم ہے جس کی تشکیل میں صدیاں صرف ہو چکی ہیں، اور جس کے اصول وضوابط کو دنیا کے بعض بہترین فلسفہ

دانوں نے استحکام بخشا ہے۔ لسانیات نہ صرف زبان بلکہ بہت سے دوسرے علوم کو بھی متاثر کرچکی ہے، جن میں سماجی علوم بھی ہیں اور ریاضی و فلسفہ بھی۔ لسانیات کی افادیت یا عدم افادیت اب دنیا میں کہیں کوئی مسئلہ نہیں رہا لیکن اردو میں اب بھی کچھ ایسے حضرات ہیں جو اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ انھیں شاید یاد دلانا پڑے کہ نہ صرف علم کی مخالفت علم دشمنی ہے بلکہ کسی علمی چیز کو رد کرنے سے پہلے اس علم کی مبادیات کا جاننا ضروری ہے۔ ڈاکٹر ابومحمد سحر کا معاملہ یہ ہے کہ شاید وہ ہر ذمہ داری سے فراغت پاچکے ہیں، اور اگرچہ اُن کا قلم اکثر و بیشتر رشید حسن خاں کے رَد میں اٹھتا ہے، لیکن اُن کے اصول چونکہ صرف اُن کے ہی اصول ہیں، اور علم کی رفتار و ترقی، یا زبان کی ترویج و توسیع کی ضرورتوں سے انھوں نے چونکہ آنکھیں بند کررکھی ہیں، اکثر و بیشتر وہ انتہاپسندی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ میں خود روایت کا آدمی ہوں اور قدیم علمی روایت کے احترام کو واجب جانتا ہوں، لیکن اگر روایت سے غور و فکر یا علمی اجتہاد کی راہوں کو مسدود کرنے کا کام لیا جائے تو مصنف کی حیثیت ایک فیلِ بدمست کی سی ہوجاتی ہے جو جگہ جگہ خوش فعلیاں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہمارے ڈاکٹر ابومحمد سحر کا ہے، اور اس نوع کا منظرنامہ ان کی لسانی تحریروں میں بار بار سامنے آتا ہے۔ ان کی بہت سی باتوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے لیکن لسانیات دشمنی چونکہ گمرہی کا سبب بن سکتی ہے، اس لیے اِس کا زیرِبحث لانا راقم الحروف کے لیے ضروری ہوگیا ہے۔ خاکسار ایک مدت سے ''اردو املا اور لسانیات'' کے موضوع پر لکھنا چاہتا تھا، ڈاکٹر ابومحمد سحر کا شکریہ واجب ہے کہ انھوں نے یہ تحریک فراہم کردی۔

ڈاکٹر ابومحمد سحر کی لسانیات دشمنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جا و بیجا وہ اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اُن کا مضمون ''اردو کے قاعدے'' نیا دور لکھنؤ کے جون جولائی 1985 کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس کا آغاز ہی انھوں نے لسانیات اور صوتیات پر حملے سے کیا ہے۔ حالانکہ جن پندرہ قاعدوں کا انھوں نے تجزیہ کیا ہے، ان میں سے کسی کے مصنف کی لسانیات سے صاحب سلامت بھی نہیں ہے۔ تعصب

جب علمی سطح پر برتا جاتا ہے تو خاصی دلچسپ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اردو زبان اس وقت بہت سے مغربی اور مشرقی ممالک میں پڑھائی جاتی ہے اور چونکہ زبان کی تدریس میں صوتیات و لسانیات سے مدد لینا ایک مسلمہ حقیقت ہے، اس لیے باہر کے ملکوں میں تیار ہونے والی ابتدائی کتابوں میں یقیناً لسانیات سے روشنی حاصل کی گئی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کتاب کو دیکھنے کی توفیق ڈاکٹر صاحب موصوف کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس پر بھی آپ اپنا مضمون ''اردو کے قاعدے'' لسانیات پر کرم فرماتے ہوئے ان جملوں سے شروع کرتے ہیں :

> ''اردو میں جدید لسانیات اور صوتیات کی باریابی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا، لیکن ان علوم کی بنا پر اردو رسم الخط اور درس و تدریس کے روایتی طریقوں کی تنقید میں جو غیر متوازن اور غیر دانشمندانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے، اس سے اردو کی ابتدائی تعلیم میں نئی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔ بعض اہل لسانیات نے اپنے خیالات کے ذریعے اردو رسم الخط، حروفِ تہجی اور نظامِ املا وغیرہ کی بنیادیں اس طرح ہلا دی ہیں کہ ان کو سنبھالنا آسان نہیں''۔

(نیا دور لکھنؤ، جون جولائی 1985، ص 4)

معلوم نہیں ابو محمد سحر کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ کیا وہ حیات اللہ انصاری یا رشید حسن خاں کا شمار اہل لسانیات میں کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ ان کی فیاضی ہے۔ یا اگر ہر معقول و نامعقول تبدیلی یا تجویز کو وہ لسانیات کے سر مڑھتے ہیں، تو یہ ان کی کھلی ہوئی زیادتی ہے۔

غور فرمائیے موصوف کو معلوم ہی نہیں کہ لسانیات اور صوتیات کی مبادیات کیا ہیں، اور ان کے اثرات کے تحت کیا نیا کام ہوا ہے اور کیا نئی کتابیں لکھی گئی ہیں، پھر بھی کس تیقّن کے ساتھ آپ فیصلہ صادر فرما رہے ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے جن اردو قاعدوں سے بحث کی ہے وہ وہی ہیں جو آسانی سے دستیاب ہیں، یعنی مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی سے لے کر حیات اللہ انصاری تک کے قاعدے — بلاشبہہ اِن میں سے ہر شخص نے اپنے اپنے طور پر کوئی نہ کوئی اصلاحی نقطۂ نظر پیش

کیا ہے، لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ ان میں سے کوئی قاعدہ لسانیات اور صوتیات کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا۔ اگر کسی نے ایسا دعویٰ کیا ہے تو ڈاکٹر ابو محمد سحر محقق ہیں، ان کو چاہیے تھا کہ تحقیق فرمالیں کہ ایسا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ بھلا یہ کس طرح کی تحقیق ہے جو حقائق سے چشم پوشی کرتی ہے، اور دوسرے علوم کے تئیں جارحیت کا رویہ اپناتی ہے۔ اگر ایسا ہے، جو یہ واقعی ہے، تو خاکسار کے نزدیک یہ نہ صرف تحقیق کا خون کرنا ہے (اگرچہ اس سے تحقیق کا کچھ بگڑتا نہیں) بلکہ علمی دیانت داری کی راہ میں کانٹے بچھانا بھی ہے جس سے ہر ذمہ دار آدمی کو گریز کرنا چاہیے۔

اس بارے میں خاکسار کا مسلک بہت واضح ہے۔ اگر آپ رسم الخط اور املا کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ ضرور سوچیے کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ آخر یہ موضوع آپ کی توجہ کا محتاج کیوں ہے اور آپ اس پر کرم کیوں فرمانا چاہتے ہیں؟ اردو کا بُرا بھلا نظامِ املا موجود ہے۔ اگر اس میں کسی اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت ہے تو کیوں ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر آپ اصلاح چاہتے ہیں یا اب تک جو تجاویز پیش کی گئی ہیں ان پر محاکمہ کرنا چاہتے ہیں تو ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ اس بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ ایک نقطۂ نظر تو یہ ہوسکتا ہے کہ آپ قدیم روایت کے علمبردار ہیں اور ہر طرح کی تبدیلی کے خلاف ہیں، یعنی آپ کا ذہن بالکل بند ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ان کے معاصرین نے لسانی مسائل پر جو کچھ لکھا تھا، اور اصلاح کی جو تجویزیں پیش کی تھیں، وہ بھی آپ کے لیے قابلِ قبول نہیں، لیکن ان بزرگوں کا اتنا احترام آپ کرتے ہیں کہ ان کی نیت پر شبہ نہیں کرتے۔ اس روش سے ہٹ کر دوسرا نقطۂ نظر ان لوگوں کا ہے جو لسانی مسائل کو صوتیات اور لسانیات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ لسانیات سماجی سائنس ہے۔ صوتیات کے پاس حقائق کی پرکھ کا ایسا نظام ہے جس کو کوئی دوسرا علم جھٹلا نہیں سکتا۔ اس کے پاس عقیدے کی آنکھ نہیں۔ جو چیز جیسی ہے صوتیات اس کو ویسا بتا دیتی ہے اور بس۔ سائنس کی بہت سی دریافتوں نے قدیم عقائد اور قدیم علمی مقدمات پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے۔ گلیلیو

کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ تم اپنے اصولوں سے کفر و زندقہ پھیلا رہے ہو، اگر ان کے اعلان سے باز آجاؤ تو تختۂ دار سے بچ جاؤ گے۔ چنانچہ پادریوں کے سامنے کچھ الٹا سیدھا بول کر اس نے اپنی جان بچالی۔ جب اس کے حق پرست شاگردوں نے لعن طعن کیا تو اس نے کہا کہ میرے کچھ کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، زمین تو پھر بھی سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ غرض ہمارے علما مانیں یا نہ مانیں، ڈاکٹر ابو محمد سحر جیسے حضرات، لسانیات کے تئیں لاکھ پادریوں والا کردار ادا کریں اور اُسے تختۂ دار پر بھی کیوں نہ کھنچوادیں، صوتیات کی صداقت اور اس کی افادیت پر تو حرف آنے سے رہا، نیز اردو صوتیات یا اردو نظام اصوات سے اردو حروف کا جو رشتہ ہے، اور اس رشتے کی جو پیچیدہ نوعیت ہے، وہ بھی بدلنے سے رہی۔ بہرحال بات ہو رہی تھی نقطۂ نظر کی یعنی ایک مسلک تو قدیمی علمی روایت کا ہے، دوسرا جدید لسانیات وصوتیات کا۔ لیکن ان دونوں سے ہٹ ایک تیسرا مسلک بھی ہے، جس پر خاکسار کاربند رہا ہے اور جس کے بارے میں کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ یہ مسلک عبارت ہے قدیم علمی روایت اور جدید لسانیات دونوں سے آگہی حاصل کرنے سے، اور اس آگہی کی روشنی میں اردو کے مخصوص لسانی کردار اور ثقافتی مزاج کے پیش نظر املا کے مسائل کو حل کرنے سے۔ یہ بات عام طور پر معلوم نہیں کہ لسانیات کی ایک شاخ Socio-Linguistics ہے۔ صوتیات تو صرف ہم عصر زمانی سطح (Synchronic Level) پر سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید دکھا سکتی ہے۔ لیکن سماجی لسانیات میں لسانی مسئلوں کے حل میں زبان کی تاریخ، سماجی کردار اور ثقافتی مزاج سب سے مدد لینے کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ایسا نہیں کیا جائے گا تو جو نتائج اخذ کیے جائیں گے بعض معاملوں میں وہ حقیقت سے دور جا پڑیں گے، اور گمراہ کُن ہوں گے۔ سو سماجی لسانیات کا دائرۂ کار نہایت وسیع ہے یعنی اس میں صوتیاتی حقائق سے مدد لیتے ہوئے تاریخی مزاج اور چلن اور ثقافتی اثرات کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ راقم الحروف شروع سے اسی مسلک کا پابند رہا ہے۔ علم کوئی جامد چیز نہیں ہے، خاکسار کی فکر میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ بعض مسائل کے بارے میں، میں

نے اپنی رائے پر نظرثانی بھی کی ہے، لیکن میرا مسلک یہی ہے کہ صوتیات سے مدد لیتے ہوئے ثقافتی اثرات کو ہرگز ہرگز نظرانداز نہیں کرسکتے۔

آیئے اب ایک نظر اس بات پر ڈالیں کہ اردو املا کی معیار بندی کی آخر ضرورت کیوں ہے اور وقتاً فوقتاً اصلاح کی تجویزیں کیوں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر ابومحمد سحر، اگر اردو میں سب خیریت ہی خیریت ہے تو پھر مغز کھپانے اور وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں اس مسئلے پر جتنا سوچتا رہا ہوں، میرا یہ یقین پختہ تر ہوتا گیا ہے کہ بہت سے لسانی مسائل کے تئیں ہمارے بزرگ ہم سے زیادہ ترقی پسند تھے، محض سیاسی ترقی پسند نہیں، بلکہ ایسے ترقی پسند جو صحیح معنوں میں آزاد خیال یا روشن خیال تھے اور جی جان سے اپنی زبان کی ترقی چاہتے تھے۔ دور کیوں جایئے، اسی بات کو لیجیے کہ اس حقیقت کا عرفان لسانیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی میں عام ہوا کہ اردو ایک خودمختار زبان ہے، لیکن اردو کے صدیوں پر پھیلے ہوئے لسانی ارتقا کو سامنے رکھیں تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارے بزرگ اس بات کا گہرا احساس رکھتے تھے کہ اردو، عربی اور فارسی سے الگ اپنا لسانی نظام رکھتی ہے اور اس کی بعض ضرورتیں جُداگانہ نوعیت کی ہیں۔ قدیم زمانے میں نہ انجمن ترقی اردو تھی، نہ ترقی اردو بورڈ، نہ مقتدرہ قومی زبان، نہ یونیورسٹیوں کے شعبے جو سیمنار کراتے ہیں یا کمیٹیاں بناتے ہیں یا سفارشیں شائع کراتے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں تھا پھر بھی بزرگوں کی لسانی حِس اور لسانی سوجھ بوجھ نے بہت سی گتھیوں کو سلجھا دیا اور ان کے لسانی حل، رواج اور چلن کا درجہ اختیار کرگئے۔ امیر خسرو اور صوفیا سے لے کر بہمنی اور دکنی دور تک اور ولی دکنی و سراج سے شعرائے دہلی اور شعرائے لکھنؤ، بالخصوص انشاء اللہ خاں انشا تک صدیوں کا سفر ہے، لیکن کیا مجال جو کہیں لسانی عصبیت کا کوئی نشان نظر آجائے۔ دریائے لطافت میں انشا کا وہ مشہور بیان تو سب کو معلوم ہے جسے خاکسار اردو کی لسانی آزادی کا میگنا کارٹا (Magna Charta) قرار دیتا ہے۔ یعنی:

''واضح رہے کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہوگیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق ہو تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے، تو بھی صحیح ہے۔''

(دریائے لطافت، اردو ترجمہ، ص 241)

پس معلوم ہے کہ اردو ایک آزاد آریائی زبان ہے اور اس کا نظام دوسری زبانوں سے کسی حد تک جُداگانہ ہے، اور اگرچہ اس کا رسمِ خط عربی فارسی کی روایت سے لیا گیا ہے لیکن آریائی مزاج کا ساتھ دینے کے لیے اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ لسانی تبدیلیاں ایک دن میں رونما نہیں ہوجاتیں، اُن کی پشت پر صدیوں کا ہاتھ ہوتا ہے، ہندآریائی زبانوں کے بعض صوتی امتیازات دوسری زبانوں سے بالکل الگ ہیں۔ ہمارے بزرگوں کی لسانی بصیرت لائقِ داد ہے کہ بغیر کوئی فرمان جاری کیے یا حکم لگائے انھوں نے اُسی رسم خط میں معمولی رد و بدل کرکے گنجائشیں پیدا کرلیں۔ یہاں تفصیل میں جانا مقصود نہیں، لیکن اتنی بات معلوم ہے کہ ہائیت (Aspiration) معکوسیت (Retroflexion) اور غنّیت (Nasalisation) ہندآریائی کے امتیازی اوصاف ہیں۔ یعنی جس طرح بھ پھ تھ دھ جھ چھ کھ گھ یہ آٹھ آوازیں بندشی آوازوں کے ساتھ پورے سِٹ کے طور پر اردو میں موجود ہیں، اُسی طرح معکوسی آوازوں میں ٹ، ڈ، ڑ اور ان کے ہکار روپ ٹھ، ڈھ، ڑھ یعنی ان چودہ آوازوں سے عام اردو کا کوئی صفحہ خالی نہیں۔ یہی معاملہ غنّیت کا ہے۔ اردو میں غنّیت نہ صرف لفظ کی سطح پر کارگر ہے بلکہ زبان کے کُلی معنیاتی نظام میں دس کے دس بنیادی مصوتوں کی غُنّیت کے روپ میں، زبردست صرفی ونحوی کردار بھی ادا کرتی ہے یعنی // جاؤ/ جاؤں// گئی/ گئیں// جائے/ جائیں// آئے/ آئیں/ آئیں// غور طلب امر یہ ہے کہ جدید صوتی تصورات کو جانے بغیر ہمارے قُدما، متوسّطین اور متاخرین میں ہائیت کا احساس کیسے پیدا ہوگیا یا معکوسی آوازوں کے حروف ٹ، ڈ، ڑ کس نے وضع کیے۔ یا دوچشمی ھ ہائیت کے لیے کس طرح رفتہ رفتہ مخصوص ہوتی چلی گئی یا نون غنہ کا

امتیاز کس طرح راسخ ہوتا چلا گیا۔ گویا اس کا کچھ نہ کچھ احساس تھا کہ جب زبان ایک خطے سے تعلق رکھتی ہو اور اس کا رسم الخط کسی دوسرے خطے کی زبان سے لیا جائے تو لامحالہ کچھ آوازیں رد ہو جائیں گی اور بعض دوسری آوازیں جو مستعار رسمِ خط میں نہیں تھیں، ان کے لیے نظامِ حروف میں لچک پیدا کرنی پڑے گی۔ یوں اردو رسمِ خط میں ہند آریائی کے مخصوص لسانی مزاج کی وجہ سے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور یہ لسانی عمل کلی تاریخی و سماجی عمل کا ناگزیر حصہ بن گیا۔ واضح رہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ علم کی حدود میں وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نئے علوم نئی روشنی لے کر آتے ہیں نیز چلن میں زبان کے ارتقائی سفر کے دوران بھی بہت سے الجھاوے پیدا ہو جاتے ہیں، یعنی ایک ہی لفظ کوئی طرح سے لکھا جانے لگتا ہے یا ایک صوتیاتی حقیقت کو بعض لوگ ایک طرح سے ظاہر کرتے ہیں، بعض لوگ دوسری طرح سے لکھتے ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف کے نزدیک املا کے مسائل میں اصلاحی کوششوں کا جواز یہی رہا ہے کہ تضادات اور عدم مطابقت (inconsistencies) کو رد کیا جائے، اصولوں کو واضح کیا جائے اور چلن کی معیاربندی کی جائے۔ یعنی ضرورت انقلابی تبدیلیاں کرنے یا انتشار میں اضافہ کرنے کی نہیں، بلکہ وہی چیزیں جو چلن میں ہیں یا بزرگوں کی روایت سے ہم تک پہنچی ہیں، صوتیاتی اور ثقافتی دونوں تقاضوں کو سامنے رکھ کرکے، ان کے تضادات کو دور کرکے ان کو سادہ اور سہل بنایا جائے اور ایک آسان نظام کے تحت لاکر انھیں قاعدہ بند (systematise) کیا جائے۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کام اُن لوگوں کے بس کا نہیں جو لسانی عصبیت کا شکار ہیں۔ اور اگر کوئی محض جدت طرازی کے نام پر صوتیاتی عصبیت کا شکار ہے تو یہ کام اُس کے بس کا بھی نہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو لسانیات کی روشنی پر بندھ باندھنا چاہتے ہیں اور مختلف مسائل میں بدترین عصبیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، جب تجاویز پیش کرنے پر آتے ہیں یعنی تخیل کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے بعد جب تھک ہار کر زمین پر اترتے ہیں تو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جن کا اگر کوئی جواز ہو سکتا ہے تو

وہ لسانیات کی ہی رو سے ہوسکتا ہے۔ اردو کے حروف تہجی سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر ابو محمد سحر نے لکھا ہے:

> ''مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے تک ''لام الف'' کو شامل کرکے حروف باترتیب میں انتالیس (39) حروف درج کیے جاتے تھے۔ دوچشمی ہے کے بعد ایک اور اندراج ہائے مدورہ اور دوچشمی ہے کی مختلف ملواں شکلوں کا ہوتا تھا۔ اور ایک ہمزہ کی دوسری شکل (ء) کا۔ اس طرح اکتالیس (41) اندراج ہوتے تھے۔ موخرالذکر دونوں اندراج حروف باترتیب میں زائد بھی تھے اور غیر فطری بھی۔ کیونکہ یہ علیٰحدہ حروف تہجی نہ تھے بلکہ ہائے مدورہ اور ہمزہ کی مختلف شکلوں پر مشتمل تھے۔ اردو حروف تہجی میں ''لام الف'' کی شمولیت محض عربی کی تقلید تھی''۔ (صفحہ 4، نیا دور، لکھنؤ، جون جولائی 1985)

آگے چل کر فرماتے ہیں:

> ''اردو حروف تہجی کُل اڑتیس (38) ہیں۔ ان کی تعداد، ترتیب اور ناموں میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا''۔ (ص 15)

حروف کی ترتیب اور ناموں کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن جب خود آپ اسمٰعیل میرٹھی کی تعداد یعنی اکتالیس (41) حروف تہجی کے اندراج میں تبدیلی کرسکتے ہیں یعنی اکتالیس (41) کو اڑتیس (38) کرسکتے ہیں تو کوئی دوسرا آپ کی اڑتیس (38) کی تعداد کو انتالیس (39) یا سینتیس (37) کیوں نہیں کرسکتا؟ اگر اسمٰعیل میرٹھی کی مقررہ تعداد کوئی تقدس نہیں رکھتی تو آپ کی مقررہ تعداد کیا تقدس رکھتی ہے۔ یعنی اگر آپ اسمٰعیل میرٹھی کی تعداد کو بدل سکتے ہیں اور ان کے لکھے پر نظرِ ثانی فرما سکتے ہیں تو کوئی دوسرا آپ کی تعداد کو کیوں نہیں بدل سکتا اور آپ کے فرمودات پر نظرِ ثانی کیوں نہیں کرسکتا؟ ابو محمد سحر کے جملے سے اُن کا تحکمانہ انداز صاف ظاہر ہے کہ ''تعداد ... میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا''۔ غور فرمایئے جس منطق کی رو سے ''لام الف'' کا زائل ہوجانا سحر صاحب مناسب سمجھتے ہیں، اُسی منطق کی رو سے اور بہت سی تبدیلیاں بھی لازم آتی ہیں۔ مثلاً ہائیہ آوازوں کا اضافہ یا غُنّیت کا اضافہ۔ ہائیت کے اضافے کو تو

وہ مان لیتے ہیں لیکن غنیت کا اضافہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ان کا رویہ سائنٹفک ہوتا تو وہ اس طرح کی تضاد بیانی کا شکار نہ ہوتے۔ ایک قاعدہ نویس بے چارے نے جس کا نام لینا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا، یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اردو میں ''عورت''، ''عینک'' اور ''عیسیٰ'' جیسے الفاظ میں ع کی آواز الف کی طرح ہے۔ اِسے ابومحمد سحر نے قابلِ اعتراض قرار دیا ہے۔ حالانکہ قاعدہ نویس نے حرف ع کے شمول یا عدم شمول سے بحث نہیں کی تھی۔ اس نے تو صرف آواز کی بات کی تھی۔ اسی طرح ایک قاعدے میں کسی نے دیوناگری کا ذکر کردیا۔ اس پر بھی وہ بے طرح بَرسے ہیں۔ ایک صاحب نے اپنے قاعدے میں رومن رسمِ خط سے تقابل کا اشارہ کیا ہے تو وہ بھی ان کے عتاب کا نشانہ بنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ روسی، جرمن، جاپانی اور فرانسیسی لوگوں کو اردو سکھانے کے لیے جو ابتدائی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب نہ سہی، صرف انگریزی میں لکھی جانے والی اردو کی ابتدائی کتابوں کو اگر سحر صاحب ملاحظہ فرمالیتے تو انھیں اپنی لسانی بصیرت کے اظہار کے لیے خاصا نیا مواد مل جاتا۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر زبان کے مزاج کے تئیں ذہن صاف نہیں اور اصلاح کے جواز کا صحیح اندازہ نہیں، نیز ذہن نئے علوم سے روشنی حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں، تو مضحکہ خیز صورت حال کیوں کر نہ پیدا ہوگی۔ ان کا یہ دلچسپ بیان ملاحظہ فرمایئے :

> ''ان میں (اردو حروف میں) بعض حروف ہم صوت ہونے کی وجہ سے صوتیے (Phonemes) نہیں ہیں۔ یا بعض آوازیں صوتیے ہیں، لیکن حروف تہجی میں شامل نہیں ہیں۔ تو ان وجوہ سے بھی ترمیم و اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ مقررہ حروف تہجی کا تعلق عملی رسم الخط سے ہے اور اس باب میں اردو کوئی محیرالعقول نمونہ نہیں پیش کرسکتی''۔ (ایضاً، ص 8)

یہ تقاضا کس نے کیا ہے کہ اردو کوئی محیرالعقول نمونہ پیش کرے لیکن جب لسانیاتی علم ہی کی بنا پر (جس کو وہ خود اس سے پہلے رَد کرچکے ہیں) وہ یہ کہتے ہیں کہ اردو میں بعض حروف ''ہم صوت'' ہیں اور بعض آوازیں ایسی ہیں جو فونیم ہیں،

یعنی زبان کے صوتیاتی عمل میں ناگزیر طور پر آزادانہ حیثیت رکھتی ہیں، تو پھر ابتدائی کتابوں میں ان کو پڑھانے اور بتانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو اپنانا ہی ہوگا۔ یقیناً حروفِ تہجی کی روایتی ترتیب کو بدلنا ضروری نہیں۔ انگریزی اور ہندی کی مثالیں موجود ہیں۔ انگریزی حروف اور انگریزی اصوات کی عدم مطابقت سامنے کی بات ہے، لیکن کیا اس کمی کو ابتدائی کتابوں میں Phonics کی مدد سے یعنی لسانیات کی مدد سے پورا نہیں کیا جاتا؟ ہندی والوں کے مسائل جزوی ہیں، کیا انھوں نے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لیے اصلاحی کوششیں نہیں کیں، اور کیا انھوں نے دیوناگری کے ضابطوں کو قاعدہ بند نہیں کیا؟ اگر ایسا ہے اور ہونا چاہیے تو پھر اردو میں جن لوگوں نے اصلاح کی کوششیں کی ہیں، اُن پر لعن طعن کس لیے۔

میرا خیال ہے ابومحمد سحر اردو میں اس طبقے کے لیے لکھتے ہیں جو زبان کے معاملے میں سکّہ بند تصورات رکھتا ہے۔ ان میں سے اگر کچھ لوگ سائنسی عقلی رویہ اپنانا چاہتے ہیں تو ابومحمد سحر ان کو نہایت خوبی سے گمراہ کرتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر روایتی ہی نہیں، جامد بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ روایت کے فیصلے چلن کی بنا پر ہوئے، اور چلن اور استعمالِ عام میں جو فیصلے ہوئے ہیں، وہ آوازوں ہی کی حیثیت کے پیش نظر ہوئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ٹ، ڈ اور ڑ الگ حروف کیوں قرار پاتے۔ یعنی معکوسیت کا وجود اگر اردو میں تسلیم کیا گیا تو اسی وجہ سے کہ یہ آوازیں دوسری تمام آوازوں سے مختلف تھیں۔ اسی طرح ہائیت ایک امتیازی عنصر ہے۔ مثلاً بال/ بھال // پل/ پھل // تال/ تھال // ٹاٹ/ ٹھاٹ // ڈول/ ڈھول // پڑ/ پڑھ // وغیرہ الفاظ میں معانی کا فرق صرف ہائیت کی وجہ سے ہوا ہے، باقی آوازیں مساوی ہیں۔ اردو میں ان کو کبھی ہائے ہوز سے لکھا جاتا تھا، کبھی ہائے دوچشمی سے، چونکہ عربی فارسی میں ہائیت ایک امتیازی صوتی عنصر کی حیثیت سے، سرے سے ہے ہی نہیں، جبکہ یہ آوازیں اردو میں باقاعدہ فونیم ہیں اور اردو کے معنوی نظام کا ان کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن چونکہ یہ ہمارے روایتی نظامِ تہجی کا حصہ نہیں، ہمارے بزرگوں نے ٹ، ڈ اور ڑ کی طرح ان کے لیے الگ حروف تو وضع نہیں کیے،

تاہم ان کی آزادانہ صوتی حیثیت کو تسلیم کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ ہائے دوچشمی کو ان کے لیے مختص کردیا۔ یہ طریقہ لسانیات کے Distinctive Feature Analysis کے عین مطابق ہے جہاں ایک نشان پوری زبان کے صوتی فیچر (Feature) کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے زبان کے لسانی نظام میں اس صوتی فیچر کی بنیادی حیثیت بھی برقرار رہتی ہے، اور حرف کے ذریعے اس کی ادائیگی کا حق بھی ادا ہوجاتا ہے۔ یہ کفایت اور سادگی کا کرشمہ ہے، جو کسی بھی سائنسی علم کا سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ابومحمد سحر اردو کے حروف تہجی میں دوچشمی ہائے کے اضافے کی وکالت کرتے ہیں اور ٹھیک کرتے ہیں، لیکن چونکہ ان کو معلوم نہیں کہ یہ وکالت، اس لسانیات کی بنا پر ہے جس کو وہ رَد کرتے ہیں، اس لیے جس سانس میں وہ ہائیت کی وکالت کرتے ہیں اُسی سانس میں وہ غُنّیت کی مخالفت بھی کرتے ہیں، بغیر جانے ہوئے کہ جس طرح ہائیت اردو کا امتیازی صوتی وصف ہے، اسی طرح غُنّیت بھی اردو کا امتیازی صوتی وصف ہے اور جس طرح ہائے دوچشمی، ہائے ہوز کی ایک شکل ہے، اُسی طرح نون غنہ بھی نون ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن وہ حروف تہجی میں ہائے دوچشمی کے اضافے کو جائز اور نون غنہ کے اضافے کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ان کے ذہنی تضاد کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہے یعنی جب آپ لسانیات سے روشنی ہی حاصل کرنا نہیں چاہتے اور وہ دروازہ ہی آپ نے بند کررکھا ہے تو پھر ہائے دوچشمی کے صوتی امتیازی وجود کو آپ نے کیسے تسلیم کرلیا جس کا روایتی حروف تہجی میں کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ لسانیات سے مدد لینے کا اقرار کریں یا نہ کریں، لسانیات سے آپ کی واقفیت مکمل ہو یا واجبی، لیکن اگر آپ املا کی قاعدہ بندی کی راہ میں قدم اٹھا رہے ہیں یا اصلاح کی کوشش کررہے ہیں تو لسانیات سے مدد لینا ہی ہوگی۔ پس ظاہر ہے کہ وہ لوگ بھی لسانیات کی مدد لینے کے لیے مجبور ہیں جو بظاہر اپنی عصبیت کی بنا پر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ لسانیات سے اردو املا کے بعض بنیادی مسائل میں کیا مدد ملتی ہے یا مل سکتی ہے۔

لسانیات اور زائد حروف

لسانیات کے خلاف محاذ آرائی میں ایک غلط فہمی یہ پیدا کی جاتی ہے کہ اردو میں جو زائد حروف ہیں، لسانیات ان کی گردن مارنا چاہتی ہے۔ مثلاً ز کے ساتھ ذ، ظ اور ض، زائد ہیں، یا س کے ساتھ ث اور ص زائد ہیں، یا ح کے ساتھ ہ زائد ہے، یا ع کی مختلف آوازوں کے ساتھ الف کی مختلف آوازوں کا متوازی سِٹ موجود ہے۔ صوتیات ہمیں صرف یہ بتاتی ہے کہ اردو میں ان میں سے ہر سٹ کی آواز صرف ایک ہے، یعنی ز، ذ، ظ اور ض لکھنے میں چار حروف سہی لیکن اردو میں ان کی آواز ایک ہے۔ حروف چار کیوں ہیں، یا حروف چار ہونا چاہئیں یا ایک، یہ صوتیات کا کام نہیں ہے۔ صوتیات کا کام حقیقت سے آگاہ کرنا ہے اور بس۔ اس کی بنا پر سماجی فیصلے کرنا صوتیات کا کام نہیں۔ چار حروف کا چلن تاریخ کا حصہ ہے لیکن تاریخ صوتیات کا حصہ نہیں۔ یہ ویسی مثال ہے جیسے علم کیمیا، سونے، چاندی اور پیتل کا فرق تو بتا سکتا ہے یعنی ان میں کیا کیا کیمیاوی اجزا ہیں، لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ سونا زیادہ قیمتی ہے یا چاندی یا پیتل۔ یہ فیصلہ تو کلچر کی سطح پر ہوتا ہے۔ گویا اگر کچھ لوگوں نے ایسی کوئی بات کہی ہے کہ فلاں فلاں حروف زائد ہیں، تو یہ ان کی ذاتی ترجیح ہے، صوتیات ایسا کوئی حکم نہیں لگاتی۔ بہر حال اگر کسی کی ذاتی رائے رواج اور چلن کے یکسر خلاف ہوگی، تو خاطر جمع رکھیں وہ تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ اردو میں چونکہ سینکڑوں ہزاروں مستعار لفظوں کی پہچان ہی ان دوہرے تہرے حروف کی بنا پر قائم ہے اور اِن کے بغیر ہمارا لفظیاتی نظام مکمل ہی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اردو لغت کا تصور کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ان تمام حروف کا ناگزیر لسانی کردار خود بخود ثابت ہوجاتا ہے۔ پس واضح رہے کہ غلط حکم لسانیات نہیں لگاتی، لگا ہی نہیں سکتی، البتہ حکم اشخاص لگاتے ہیں۔ سو اعتراض اشخاص پر وارد ہوتا ہے نہ کہ صوتیات پر جو سائنس ہے اور جس کا کام آوازوں کی حقیقت کو جاننا ہے۔

لسانیات اور ہمزہ

یہ بحث ادھوری رہے گی اگر ہم یہ ثابت نہ کریں کہ لسانیات کی معمولی مدد سے املا کی بعض پیچیدہ گتھیوں کو کیسے سلجھایا جاسکتا ہے۔ اردو میں ہمزہ کا استعمال ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ہمزہ کے استعمال پر راقم الحروف نے 1966 میں اس وقت لکھا تھا جب ابھی ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی تو کیا ترقی اردو بورڈ کی تشکیل بھی نہ ہوئی تھی۔ مکمل تجزیے کے بعد راقم الحروف نے عرض کیا تھا کہ ہمزہ اردو میں ایک علامتِ بے صوت ہے۔ یہ ہمارے حروفِ تہجی کا حصہ تو ہے لیکن دوسرے حروف ب، پ، ت کی طرح اس کی اپنی مخصوص آواز نہیں۔ تاہم یہ ہمارے نظام اِملا کا ناگزیر حصہ ہے۔ یعنی عربی فارسی الفاظ تو کجا بعض ہندی الفاظ مثلاً آئے، جائے، بھائی، نائی، کیکئی، لکھنؤ وغیرہ بھی اردو میں ہمزہ کے بغیر نہیں لکھے جاسکتے۔ چنانچہ میں نے ایک سادہ سا اصول پیش کیا تھا کہ اردو میں جس لفظ میں دو مصوتے، حروفِ علت یا دو حرکات ساتھ ساتھ آئیں وہاں ہمزہ لکھا جائے گا۔ /آیئے، جایئے، فرمایئے/ یا /لیجیے، دیجیے، کیجیے، دیے، کیے، چاہیے/ وغیرہ متنازعہ الفاظ میں سے کسی کو اس اصول کی روشنی میں دیکھ لیجیے۔ صحیح جواب ملے گا۔ (ملاحظہ ہو مضمون ''ہمزہ کیوں'' ہماری زبان، علی گڑھ، 1 مئی-7 مئی 1967)

مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے اردو املا کی جو سفارشات منظور کی ہیں ان میں ہمزہ اور واؤ، ہمزہ اور ی، نیز ہمزہ اور یے کے تحت جو مثالیں دی ہیں، ان سب میں ہمزہ کے استعمال کا جواز اسی اصول کی رو سے ہی صحیح ہے۔ سفارش میں چلن یا صوتی ضرورت کی سائنسی وضاحت ضروری ہے، صرف حکم لگا دینے سے کام نہیں چلے گا۔ مثلاً (1) ذیل کے الفاظ بغیر ہمزہ کے ی سے لکھے جائیں: سنیے، چاہیے، کیے، لیے، دیے اور (2) مندرجۂ ذیل الفاظ میں ہمزہ استعمال کیا جائے: اٹھایئے، آیئے، جایئے، سنایئے، کھایئے، بتایئے، منگایئے (اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری 1986، صفحہ 19) سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک جگہ ہمزہ لکھا جائے، ایک جگہ نہ لکھا جائے، آخر کیوں؟ چلن سے اس بارے میں زیادہ مدد ملتی نہیں، کیونکہ شق اول کے الفاظ اکثر و

بیشتر ہمزہ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ ایسے الفاظ سینکڑوں ہیں اور سب کو سفارش میں درج نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اصول کی وضاحت ضروری ہے۔ یعنی جہاں دو مصوتے ساتھ آئیں، مثلاً /اٹھایئے/ آیئے/ وہاں ہمزہ لکھا جائے گا، اس کے مقابلے پر جہاں دو مصوتے ساتھ نہیں آتے، مثلاً / کیے/ لیے/ وہاں ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ اس بات کو سہولت کی خاطر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جہاں حرفِ ماقبل مکسور ہوگا /کِ یے/ لِ یے/ وہاں ہمزہ نہیں آئے گا۔ ایسے تمام الفاظ کا تجزیہ کرکے دیکھ لیجیے، یہ سادہ اور آسان اصول ہر جگہ کارگر نظر آئے گا۔

ہمزہ کے بارے میں ابومحمد سحر صاحب لکھتے ہیں ''ہمزہ حرکت کے طور پر صرف اضافت میں استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے موقعوں پر حرف ہے''۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اضافت میں بھی حرکت کسرہ کی ہے نہ کہ ہمزہ کی۔ ہمزہ جیسا کہ بتایا گیا ہے دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آئے گا۔ اردو میں یہ املائی نشان ہے اور بس۔ رہی یہ بات کہ ہمزہ دوسرے موقعوں پر حرف ہے تو یہ کیسا حرف ہے جس کی کوئی آواز نہیں۔ البتہ اس کو تسلیم کرنا چاہیے کہ ہمزہ اردو املا کا ناگزیر نشان ہے۔ بہت سے لفظ اس کے بغیر لکھے ہی نہیں جاسکتے۔ (یعنی زیر زبر پیش کی طرح اس کا نہ لکھنا اختیاری نہیں)۔ روایتاً بھی یہ اردو حروفِ تہجی میں شامل چلا آتا ہے۔ اس لیے ہمزہ کو اردو حروفِ تہجی میں شامل رکھنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہے۔

لسانیات اور اضافت

ہمزہ سے جُڑا ہوا مسئلہ اضافت کا ہے۔ اضافت زیر سے بھی ظاہر کی جاتی ہے یائے سے بھی اور ہمزہ سے بھی۔ کہاں کس کا مقام ہے اس بارے میں روایت میں طرح طرح کی بحث کی گئی ہے۔ اپنے مضامین سے بار بار حوالہ دینا کوئی اچھی بات نہیں لیکن بعض حقائق ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔ راقم الحروف نے اُسی مضمون میں جس کا اوپر حوالہ دیا جاچکا ہے، اضافت کے بارے میں سادہ سا فارمولہ پیش کیا تھا۔ اضافت کے استعمال کی کوئی شکل اس سادہ سے فارمولے سے

باہر نہیں، نیز اس اصول کا سمجھنا اور سمجھانا بھی نہایت آسان ہے:

اضافت ←	ہمزہ	ہائے مختفی کے بعد
	ئے	الف یا واؤ کے بعد
	کسرہ	دیگر تمام صورتوں میں

وضاحت:

(1) اضافت ظاہر کی جائے گی ہمزہ سے اگر وہ ہائے مختفی کے بعد آئے (مثلاً جذبۂ دل، نالۂ بلبل)

(2) اضافت ظاہر کی جائے گی 'ئے' سے اگر وہ الف یا واؤ کے بعد آئے (مثلاً نوائے وقت، صدائے دل)

(3) اضافت ظاہر کی جائے گی کسرہ سے دیگر تمام صورتوں میں (مثلاً دردِ دل، ماہِ نو، شمعِ روشن، وادیِ گل، گلِ نغمہ)

اس میں 'یے' پر ختم ہونے والے مضاف کا ذکر نہیں ہے اس لیے کہ 'یے' خود اضافت کی شکل ہے، اور اضافت کی آواز اس میں ضم ہوجاتی ہے۔ مثلاً 'رائے' میں یے پہلے سے موجود ہے، مضاف لکھا جائے گا، رائے صائب، رائے عالی وغیرہ۔

(یہاں الف اور واؤ پر ختم ہونے والے الفاظ کے بارے میں، میں نے اپنے سابقہ اصول میں ذرا سی ترمیم کی ہے۔ گویا نوائے وقت، اردوئے معلیٰ وغیرہ بغیر ہمزہ کے نہیں بلکہ ہمزہ کے ساتھ لکھے جاسکتے ہیں۔) ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا تھا کہ گوپی چند نارنگ کے اصول کی رو سے ان شکلوں میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آتے ہیں تو پھر ہمزہ کیوں نہ لکھا جائے۔ مجھے ان سے اتفاق ہے۔ گویا 1966 والے مضمون ''ہمزہ کیوں'' میں جو فارمولا پیش کیا تھا، اور جسے املا نامہ (دہلی 1974) میں دہرایا تھا (صفحہ 68 تا 69) اس میں اب قدرے ترمیم ہوگئی ہے۔

لسانیات اور حروف تہجی

اردو کے حروف تہجی میں 29 حروف اصلاً عربی کے ہیں۔ چار کا اضافہ فارسی

میں ہوا۔ تین حروف ہند آریائی کی معکوسی آوازوں کے لیے بعد میں بڑھائے گئے۔ یہ کل ہوئے چھتیس (36)۔ بشمول ہمزہ کے جس سے اوپر بحث کی گئی، یہ تعداد سینتیس (37) ہوجاتی ہے۔ ہکاریت کے لیے ہائے دوچشمی کا اضافہ اسمٰعیل میرٹھی سے لے کر ہمعصر ماہرین تک سب تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح اردو کے حروفِ تہجی اڑتیس (38) ہوئے۔ راقم الحروف کا معروضہ ہے کہ جس صوتی اصول کے تحت ہائے دوچشمی کا اضافہ جائز ہے، اُسی اصول کے تحت نون کے بعد نون غنّہ کا اضافہ بھی ضروری ہے کیونکہ ہکاریت کی طرح غنّیت بھی اردو کا امتیازی صوتی وصف ہے اور جس طرح ہکاریت دس گیارہ بنیادی آوازوں کے ساتھ وارد ہوتی ہے اسی طرح غنّیت بھی دس مصوتی آوازوں کے ساتھ وارد ہوتی ہے اور ہکاریت کی طرح پوری زبان میں معنی کی تفریق میں ناگزیر کردار ادا کرتی ہے۔ چنانچہ نون غنہ کے اضافے کے ساتھ اردو کے کُل حروف تہجی انتالیس (39) ہوئے۔ ان کی ترتیب حسب ذیل ہے:

ا

ب پ ت ٹ ث

ج چ ح خ

د ڈ ذ ر ڑ ز ژ

س ش ص ض ط ظ ع غ

ف ق ک گ ل م ن ں

و ہ ھ ء ی ے

(کل تعداد 39)

جب ہائے دوچشمی کو حروف تہجی میں شامل کردیا گیا ہے تو دوچشمی ہے کی مختلف ملواں شکلوں یعنی بھ پھ تھ وغیرہ کا اندراج حروف تہجی میں ضروری نہیں، اگرچہ اسمٰعیل میرٹھی نے اس کو روا رکھا تھا۔ البتہ حروف تہجی کے اندراج کے بعد الگ سے بھ پھ تھ ڈھ جھ چھ کھ گھ ڑھ وغیرہ کو ابتدائی قاعدوں میں درج کرسکتے ہیں تاکہ طالب علم مفرد آوازوں کے طور پر ان کی مشق کرسکیں۔

لسانیات اور اعراب

اب آخر میں لیجیے اعراب کا مسئلہ۔ اردو میں اس میں بھی بڑے بڑے اختلافات ہیں۔ خدا بھلا کرے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا کہ اردو اعراب کی بعض صورتوں میں قاعدہ بندی کی کچھ صورت پیدا ہوگئی۔ ان میں کم از کم یائے معروف کے لیے کھڑا زیر اور واؤ معروف کے لیے الٹا پیش اب ابتدائی کتابوں میں عام طور سے دکھائی دینے لگا ہے۔ لیکن ابو محمد سحر کی لسانی بصیرت کو یہ بھی گوارہ نہیں، فرماتے ہیں:

> ''یائے معروف کی طرح واؤ معروف کے لیے جو علامت (ۏ) اختیار کی گئی وہ بھی قباحت سے خالی نہیں۔ یہاں بھی اعراب حرف ماقبل پر ہونا چاہیے تھا نہ کہ واؤ پر۔ واؤ سے پہلے کے حرف پر دیگر اعراب یعنی زیر زبر پیش کی طرح الٹا پیش بھی لگایا جاسکتا تھا۔ کسرۂ معروف اور ضمۂ معروف دونوں کی اپنی دو دو آوازیں ہیں، ایک کھنچی ہوئی دوسری مختصر کھنچی ہوئی۔ کھڑا زیر یائے معروف کے نیچے اور الٹا پیش واؤ معروف پر لگانے کے بجائے اگر حرف ماقبل یعنی اس حرف پر لگائے جائیں جس پر وہ پڑھے جاتے ہیں تو دوسرے حروف کے ساتھ بھی کسرۂ معروف وضمۂ معروف کی کھنچی ہوئی اور مختصر کھنچی ہوئی دونوں آوازوں کی نمائندگی کرسکتے ہیں''۔
>
> (صفحہ 12، نیا دور لکھنؤ، جون جولائی 1985)

اگر یہ بیان انتشار پھیلانے کی بدترین مثال نہیں تو پھر یہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے پاس کوئی سسٹم نہیں اور اگر کوئی سسٹم ہے تو اس کی بنیاد واضح نہیں ہے۔ کاش وہ صرف روایتی نظام ہی سے مدد لیتے تب بھی وہ چیزوں کو سہل بنا کر پیش کرسکتے تھے کیونکہ روایتی نظام میں بھی جیسا کہ ثابت کیا جاچکا ہے، اعراب کا صوتی جواز موجود ہے۔ جس منطق سے انھوں نے تہجی میں لام الف کو رد کیا تھا اسی منطق کی رو سے کھڑے زبر اور کھڑے زیر کا رد بھی لازم آتا ہے۔ لیکن وہ کھڑے زبر اور کھڑے زیر کو یائے معروف کے کھڑے زیر سے ملاکر نہ صرف خلط مبحث پیدا کرتے ہیں بلکہ

گمرہی بھی پھیلاتے ہیں۔ وہ چونکہ صوتیات نہیں جانتے انھیں معلوم نہیں کہ ملواں نون کے لیے الٹا جزم بھی ناگزیر نہیں۔ غور فرمایئے کہ وہی شخص جو حروف تہجی کی تعداد میں کسی اضافے کا قائل نہیں، اور اُسے ہر قیمت پر اڑتیس (38) رکھنا چاہتا ہے (اگرچہ اڑتیس (38) جیسا کہ ہم بتا آئے ہیں کوئی مقدس ہندسہ نہیں، اسمٰعیل میرٹھی کے یہاں یہ تعداد اکتالیس (41) ہے)، وہی شخص اردو کے اعراب کو جو چلن میں اکثر و بیشتر استعمال نہیں ہوتے، نو (9) سے بڑھا کر 12 (بارہ) تک پہنچا دیتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان بارہ (12) اعراب میں واؤ معدولہ کے نیچے چھوٹا خط شامل نہیں۔ گویا اس کو شامل کرلیں تو تعداد تیرہ (13) ہوجائے گی۔ فرماتے ہیں :

> ''واؤ معدولہ ہمیشہ خ کے بعد آتا ہے۔ قاعدے میں ایسے چند الفاظ آتے ہیں جنھیں طالب علم آسانی سے پہچان سکتا ہے، اور اسے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اُن الفاظ میں واؤ لکھا تو جاتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ پوری زبان میں بھی واؤ معدولہ کے الفاظ کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کو صحیح پڑھ لینا کوئی خاص مسئلہ نہیں''۔
>
> (نیا دور، لکھنؤ، صفحہ 12، جون جولائی 1985)

ڈاکٹر ابومحمد سحر جب صوتی حربوں سے کام لیتے ہیں جو ان کا میدان نہیں تو وہ خطرناک طور پر پھسلتے ہیں۔ بیشک واؤ معدولہ خ کے بعد آتی ہے، خواب، خود، خورشید، لیکن خ کے بعد اعلان کا واؤ بھی تو آتا ہے جیسے خون، خوب، خوف، خول وغیرہ۔ اعلان کے واؤ سے واؤ معدولہ کا فرق ابتدائی کتابوں میں کس طرح دکھایا جائے گا، اس کا کوئی جواب سحر صاحب کے پاس نہیں، اس لیے کہ کوئی سسٹم ان کے پاس نہیں۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ اردو میں زیادہ تر اعراب کی ضرورت مصوتوں کو ظاہر کرنے کے لیے پیش آتی ہے۔ مثلاً زیر، زبر، پیش کا فرق یا یائے معروف اور یائے مجہول کا فرق جس سے لفظوں کے معنی بدل جاتے ہیں (مثلاً مِل، مَل، مُل یا میل میل) لسانیات کا بنیادی اصول کفایت اور سادگی ہے۔ یعنی جس اصول کے بیان

میں جتنی زیادہ کفایت برتی جائے گی یا جتنی سادگی ہوگی اتنا اچھا وہ اصول ہوگا۔ مصوتوں کے اعراب میں ابھی تک سادگی کے نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا گیا۔ یعنی جتنی ہم اعراب کی تعداد بڑھاتے جائیں گے کیا اردو پڑھنے والوں کی مشکلوں میں ہم اتنا اضافہ نہیں کریں گے۔ سوچنا چاہیے کہ اگر ہم اعراب کی تعداد کو گھٹا سکیں، تو کیا اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے اُتنی آسانی نہیں ہوگی۔ خاطرنشاں رہے کہ اردو کا عام مزاج اعراب کے عدم استحکام کا ہے۔ اعراب کی ضرورت ابتدائی کتابوں میں، لغت میں، یا متن میں اجنبی الفاظ کے تلفظ کو ظاہر کرنے کے لیے پیش آتی ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ نشانات میں ایک چیز ہے صِفر کا تصور، یعنی عدم نشان۔ بہت سی زبانوں میں اس تصور سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، تو ہم بھی کفایت اور سادگی کے پیش نظر کیوں نہ اس پر غور کریں، اس سے روایتی ڈھانچے پر کوئی ضرب نہیں پڑتی اور نہ کوئی انقلابی تبدیلی لازم آتی ہے، البتہ نظامِ ہجا ضرور متاثر ہوتا ہے۔ لیکن اگر سادگی اور آسانی کو ترجیح حاصل ہے تو تھوڑی سی تبدیلی گوارا کرنا ہی ہوگی۔ اردو میں مصوتوں کی بنیادی آوازیں دس ہیں لیکن صحیح معنوں میں حرف صرف ایک ہے یعنی الف۔ یوں تو واؤ، چھوٹی ی اور بڑی ے بھی ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کا صوتی کردار دُہرا ہے۔ یعنی لفظ کے شروع میں ان کی حیثیت مصوتوں کی نہیں ہوتی۔ بہرحال چار حروفِ علت بھی مان لیں یعنی الف، واؤ، ی اور ے تو بھی ان سے دس مصوتوں کی آوازوں کا کام لینے کے لیے اعراب یعنی نشانات کی مدد لینے کی ضرورت ہے۔ اعراب کے بغیر دس آوازیں ظاہر ہی نہیں کی جاسکتیں۔ بیشک اردو کا عام رجحان اعراب کے استعمال کا نہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ نئے تاریخی حالات میں ہندوستان اور پاکستان میں اہلِ زبان سے زیادہ غیر اہلِ زبان اردو پڑھتے ہیں۔ اور ان کے لیے کم از کم ابتدائی کتابوں میں اعراب کا استعمال ناگزیر ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اعراب کا سادہ اور آسان ترین نظام وضع کیا جائے، جو روایت سے بھی دور نہ ہو اور صوتیات پر بھی مبنی ہو، یعنی جس کی صحت تجزیاتی اور سائنسی اعتبار سے ثابت ہو۔ راقم الحروف نے اس بارے میں جو نظام پیش کیا ہے، اس میں دس مصوتی

آوازوں کو تین سِٹ میں تقسیم کیا گیا ہے، جنھیں نہایت آسانی سے یاد رکھا جاتا ہے۔ پہلا سِٹ الف کا ہے، دوسرا سِٹ واؤ کا، اور تیسرا سِٹ یائے کا۔ آیئے پہلے الف کا سِٹ دیکھیں۔ اردو میں تین چھوٹی آوازیں یا حرکات تو سب کو معلوم ہیں، یعنی زیر، زبر، پیش اور ان کے ساتھ بڑی آواز، الف یا الف مَد کو شامل کیجیے۔ یہ پہلا سِٹ ہوگیا جس کو یوں لکھا جاسکتا ہے:

اِ	(زیر)	(اِن، بِن)
اَ	(زبر)	(اَن، بَن)
اُ	(پیش)	(اُن، بُن)
آ	(الف/ الف مد)	(آن، بان)

دوسرا سِٹ واؤ کی تین آوازوں کا ہے۔ واؤ مجہول (مثلاً ڈھول، گول) واؤ معروف (مثلاً اؤن، خؤن) اور واؤ ماقبل مفتوح (مثلاً، اَور، غَور) واؤ معروف کے لیے اُلٹے پیش کی سفارش ہے اور چلن میں بھی آچکی ہے۔ اسی طرح واؤ ماقبل مفتوح کے لیے زبر کی سفارش بھی روایت کا حصہ ہے۔ جب دو آوازوں کی پہچان الگ الگ سے ہوگئی، یعنی واؤ معروف اور واؤ ماقبل مفتوح کی، تو کیا واؤ مجہول کے لیے الگ سے کسی نشان کی ضرورت ہے؟ یعنی جب سونا، پیتل اور چاندی میں سے سونے اور پیتل کی پہچان ہوگئی تو کیا تیسری بچی ہوئی چیز چاندی نہیں ہوگی؟ یہ اعراب کے عدم (صفر) استعمال کا وہ تصور ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ (اسے املا نامہ، 1974 میں صفحہ 76-75 پر پیش کیا تھا) اردو اعراب میں سادگی لانے کے لیے اس تصور سے کام لینے کی شدید ضرورت ہے۔ یعنی وہ واؤ جو بغیر کسی نشان کے ہے وہ واؤ مجہول ہے۔ اس طرح واؤ کے سِٹ کی سادہ ترین شکل یہ ہوگی:

ؤ	(اؤن، خؤن)	واؤ معروف
وَ	(اَور، غَور)	واؤ ماقبل مفتوح
و	(ڈھول، گول)	واؤ مجہول

تیسرا اور آخری سِٹ یائے کی آوازوں کا ہے۔ یہ سٹ بالکل واؤ کی آوازوں

کی طرح ہے۔ یعنی یائے معروف، یائے مجہول اور یائے ماقبل مفتوح۔ یائے معروف (مثلاً نِیلا، پِیلا) میں کھڑے زیر کا استعمال، اور یائے ماقبل مفتوح (مثلاً سَیر، بَیر) میں زبر کا استعمال روایت اور چلن کا حصہ ہے۔ رہ گئی یائے مجہول کی پہچان تو اس میں واوٴ مجہول کی طرح حذفِ اعراب (صفر) سے کام لے سکتے ہیں، یعنی جو یائے معروف یا یائے ماقبل مفتوح نہیں، وہ یائے مجہول ہے۔ اس سِٹ کی سادہ ترین شکل یہ ہوگی:

یٖ	(نٖیلا، پٖیلا)	یائے معروف
یَے	(سَیر، بَیر)	یائے ماقبل مفتوح
یے	(شیر، بیر)	یائے مجہول

مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے املا کے مسائل پر جو کتاب شائع کی ہے، اس کے آخر میں 14 سفارشات درج ہیں (روداد سیمنار: املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، اسلام آباد، 1985، ص 246-244) نیز اخبارِ اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جنوری 1986 کے شمارے میں بنیادی چودہ (14) سفارشات کو بڑھا کر جو پچیس (25) سفارشات شائع کی گئی ہیں۔ (ص 22-15) ان میں اعراب کے تحت زبر، زیر، پیش، مد، جزم اور تشدید یعنی صرف چھے اعراب درج کیے گئے ہیں۔ غالباً اردو کے تمام مصوتوں پر غور کرنے اور ان کے الگ الگ اعراب طے کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ انھیں طے نہ کیا گیا تو واوٴ مجہول اور واوٴ معروف کا باہمی فرق کس طرح ممکن ہوگا۔ ابتدائی کتابوں، لغت اور متن میں غریب الفاظ کے تلفظ کو ظاہر کرنے کے لیے تو اعراب کے بغیر چارہ نہیں۔ واوٴ معروف کے لیے الٹا پیش اور یائے معروف کے لیے کھڑا زیر، بابائے اردو مولوی عبدالحق کے زمانے سے اب تک چلن میں آچکا ہے، اس کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ نیز چونکہ اردو کا مزاج اعراب کے عدم استعمال کا ہے، واوٴ مجہول اور یائے مجہول کے لیے صفر نشان یعنی اعراب کے عدم استعمال کے تصور کو بھی اپنا لینا چاہیے۔ یہ طریقہ نہ صرف نہایت آسان اور سادہ ہے بلکہ سائنٹفک بھی ہے اور چلن اور مزاج کا بھی ساتھ دیتا ہے۔

لسانیات اور ہجا

اہلِ روایت کے نزدیک ہجا کے بغیر اردو تدریس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس کا چلن روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اہل روایت کو گمان ہے کہ ایسا لسانیات کے عمل دخل کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ لسانیات/ صوتیات ایسا کوئی حکم نہیں لگاتی۔ کوئی آوازوں سے پڑھانا چاہے تو، اور کوئی ہجا سے پڑھانا چاہے تو، لسانیات کسی طرح کا اعتراض نہیں کرتی۔ البتہ حروف کی آوازوں کا تصور استاد کے ذہن میں صاف ہونا ضروری ہے۔ صرف ایک مثال سے بات واضح ہو جائے گی، مثلاً اردو میں لفظوں کا آخری حرف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے۔ جب یہ متحرک ہو ہی نہیں سکتا تو ہر بار اس کو ساکن یا ماقوف کہلوانا کیا معنی رکھتا ہے۔ نیز رَب کے ہجے رے بے زَبر رَب بتائے جاتے ہیں۔ غور فرمائیے، زبر یعنی مصوتہ، رے کے بعد وارد ہوتا ہے لیکن بے کے بعد بتایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب مان لیا گیا کہ بھ، پھ، تھ ہکاری آوازیں ہیں اور ان کا درجہ مفرد آوازوں کا ہے تو بھ کو بے زبر دو چشمی ہے بَھ کہنا کس حد تک صحیح ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں: ''ان کے ہجے کا طریقہ بے دو چشمی ہے زبر بَھ ... بتانا چاہیے۔ ان (سے بننے والے لفظوں) کے ہجے بھی اسی طرح بتانا چاہیے، مثلاً گاف دو چشمی ہے رے زبر گَھر)'' (اردو کے قاعدے، ص 16) گھر کے ہجے میں خود اپنے اصول کی رو سے جو دوسرا زبر بتانا چاہیے تھا، اس کو سحر صاحب گول کر گئے، یعنی اگر گھَ کے ہجے ''گاف دو چشمی ہے زبر'' ہیں، تو گھر کے ہجے ''گاف دو چشمی ہے رے زبر گَھر'' ہوئے۔ غور فرمائیے۔ CVC ساخت (C= مصمتہ اور V= مصوتہ) کے چھوٹے سے لفظ کے لیے ہم نے ہجوں کے لیے پانچ نام استعمال کیے۔ یہ کفایت کے خلاف تو ہے ہی، مضحکہ خیز بھی ہے۔ اسی طرح پھوُل کے ہجے ہوئے ''پ دو چشمی ہے، واوٗ الٹا پیش لام ماقوف'' یا پھَینک کے ہجے ہوئے ''پ دو چشمی ہے زبر یائے نون غنہ کاف ماقوف''۔ یہ الفاظ صرف ایک صوتی رکن کے ہیں، یعنی CVC (مصمتہ + مصوتہ + مصمتہ) — تعلیم و تدریس کے تمام جدید نظریے آوازوں کی مدد سے لفظوں کو پڑھانے کی تائید کرتے

ہیں۔ حروف کے نام اور ترتیب جاننا تو ضروری ہے، لیکن لفظوں کے جوڑ، آوازوں سے بنتے ہیں حروف کے ناموں سے نہیں۔ پھر اس میں آسانی، محنت و کوشش کی کفایت، اور وقت کی بچت بھی ہے۔ لیکن اگر اہلِ روایت کو ہجوں کے قدیم طریقے کے خلط مبحث پر اصرار ہے تو وہ جانیں، لسانیات اس میں مانع نہیں آتی۔

لسانیات اور املا کی متبادل شکلیں

لسانیات کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ واقعے سے بحث کرتی ہے، قدر سے نہیں، یعنی اس کا کام تجزیہ کرنا/ وضاحت کرنا ہے، تجویز کرنا یا سفارش کرنا نہیں۔ لسانیات سائنسی طور پر یہ بتا سکتی ہے کہ صوتی اعتبار سے کیا صحیح ہے اور کیا غلط، لیکن اگر کوئی چیز چلن میں آچکی ہے تو سماجی لسانیات اس کو رد نہیں کرسکتی یعنی اس کو غلط قرار نہیں دے سکتی۔ چلن میں ایک لفظ کو لکھنے کی ایک سے زیادہ شکلیں ہوسکتی ہیں، سماجی لسانیات ان میں سے کسی کو غلط قرار نہیں دیتی بلکہ یہ کہتی ہے کہ فلاں لفظ کے املا کی فلاں فلاں شکلیں Free Variation (آزادانہ تبادل) میں ہیں۔ یعنی ایک کے بجائے دوسری شکل استعمال ہوسکتی ہے کیونکہ اس سے معنی کا فرق لازم نہیں آتا۔ مثلاً کہا جائے گا /دیجیے/ اور /دیجئے/ اردو املا میں آزادانہ تبادل میں ہیں۔ لیکن ہم نے ہمزہ کے سادہ سے اصول کی مدد سے مرجح شکل یعنی، /دیجیے/ کا تعین کردیا، لیکن ہر جگہ حل اتنا آسان نہیں، مثلاً آزمایش، نمایش، ستایش، نمایندہ، پایندہ، قایم کو بعض لوگ از روئے اصل یائے سے لکھتے ہیں۔ از روئے صحت یہ لفظ ہمزہ سے ہیں اور ہمزہ سے بھی لکھے جاتے ہیں۔ گویا اردو میں /آزمایش/ اور /آزمائش/ اور اس قبیل کے تمام الفاظ کا دوہرا املا یعنی آزمائش یائے سے یا ہمزہ سے آزادانہ تبادل میں ہے۔ گویا لسانیات میں متبادل املا کی صورتوں کو جائز مان لینے کی گنجائش ہے۔ معیاربندی کے لیے ترجیحات اور اصول طے کرنا اگرچہ ضروری ہے، اس کے باوجود چلن میں بعض دوسری شکلیں بھی رہیں گی۔ ان پر چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں۔ زبان میں تبدیلی حکم لگانے سے نہیں ہوتی۔ ہمارا کام اصولوں کو واضح کردینا

ہے۔ جیسے جیسے ان کا عرفان ہوتا جائے گا یہ چلن میں آتے جائیں گے۔ خاکسار نے ہمزہ اور اضافت کے تحت /اردوئے معلےٰ/ نوائے ادب/ وغیرہ ترکیبوں میں ہمزہ کی تائید کی ہے لیکن اگر کوئی غالب کے تتبع میں یا ایرانی روایت کے تتبع میں /اردوے معلیٰ/نواے ادب/ لکھتا ہے تو آزادانہ تبادل کے اصول کے تحت اس کو بھی غلط نہیں کہا جاسکتا۔ ''املا نامہ'' میں (1) /آزمایش/ کے ساتھ/آزمائش/ (2) /یہ / کے ساتھ /یہ/ لکھنے اور (3) / بلکہ، چونکہ، چنانچہ/ کی مروجہ ملی ہوئی شکلوں کو بھی صحیح قرار دینے کے لیے راقم الحروف نے جو رائے پیش کی تھی، وہ آزادانہ تبادل کے اسی اصول کے تحت تھی۔ (ملاحظہ ہو املانامہ، دہلی 1974، ص 59، 68 اور 74)

تلفظ اور املا کے تنوع کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا یہ قول ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے:

> ''املا کے قاعدے کیسے ہی ہمہ گیر اور مکمل (کیوں نہ) بنائے جائیں، زبان کی پوری اور سچی ترجمانی ان سے مشکل ہی سے ہوسکتی ہے۔ ایک 'کوئی' کا لفظ ہم کئی طرح ادا کرتے ہیں''۔

اس سے بحث کرتے ہوئے مظفرعلی سید نے اپنے مقالے ''حرف وصوت کا رشتہ'' میں لکھا ہے:

> ''کوئی کا لفظ ایک مصمتہ اور دو یا تین مصوتوں پر مشتمل ہے، جن کا اشباع اور تخفیف (Lenthening and Shortening) دونوں ممکن ہیں۔ غالب نے ایک مشہور غزل میں اس کو ردیف بنا کر 'فعلن' کے وزن پر باندھا ہے:
>
> ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
>
> جبکہ فیض نے ایک ہی مصرعے میں اس ایک لفظ کو دو مختلف طریقوں سے برتا ہے:
>
> دے کوئی سنکھ 'دہائی' کوئی پایل بولے
>
> ان میں پہلا کوئی وتد مجموع ہے، 'فعل' کے وزن پر اور دوسرا سبب ثقیل ہے، دو متحرک حروف کے برابر۔

غالب ہی نے ایک اور جگہ اسے 'فاع' کے وزن پر نظم کیا ہے:

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

جبکہ یہی ''کوئی'' میر و سودا کے دور میں ایک سبب خفیف یعنی 'فع' کے وزن پر بھی استعمال ہوا کرتا تھا، خواجہ میر درد کا شعر ہے:

انداز وہ ہی سمجھے مرے دل کی آہ کا
زخمی جو کوئی ہوا ہو، کسی کی نگاہ کا''

(مشمولہ روداد سیمنار: املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1985، ص 101)

گویا شعری اوزان کی ضرورت کی بنا پر لفظ ''کوئی'' ''فعلن'' کے وزن پر بھی باندھا جاتا ہے اور ''فعل'' ''فاع'' اور ''فع'' کے وزن پر بھی، لیکن لکھا ایک ہی طرح سے جاتا ہے۔ جس طرح تلفظ میں یعنی لفظوں میں ''آزادانہ تبادل' جائز ہے، اس طرح املا میں بھی اس کو ناجائز نہیں سمجھنا چاہیے اور کچھ گنجائشیں رہنے دینی چاہئیں۔

لسانیات اور سیاست

اردو املا کی معیار بندی کے سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے لے کر اب تک، یعنی معاصر ادیبوں کی کوششوں تک جو بھی کام ہوا ہے، اس کا کسی سیاسی جذبے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہندوستان کے اہلِ قلم کی کوششوں کی خواہ وہ اہلِ روایت کی ہوں یا اہلِ لسانیات کی، اس نوع کی تاویل کرنا ان کے خلوص نیت پر شبہ کرنا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں۔ اس نوع کی کوششیں آزادی سے پہلے بھی ہوتی رہی ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی جاری ہیں۔ جس طرح اس حقیقت میں کلام نہیں کہ اردو رسم خط اصلاً سامی خاندان سے ماخوذ ہے، اسی طرح اس حقیقت میں بھی کلام نہیں کہ اردو آریائی خاندان کی زبان ہے۔ چنانچہ اردو کے ضمن میں جہاں عربی، فارسی اثرات کی بحث ناگزیر ہے، وہاں ہند آریائی یعنی دیسی تقاضوں کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ اگر ان

مباحث میں کسی نے دیوناگری یا ہندی کا حوالہ دے دیا، تو اس کو کسی طرح کی سیاست سے جوڑنا حق و انصاف کا خون کرنا ہے۔ جس طرح عربی فارسی اثرات کی بحث غیر علمی نہیں ہوسکتی، اسی طرح ناگری کا حوالہ بھی غیر علمی نہیں ہے۔ البتہ ان باتوں کو شک وشبہہ کی نظر سے دیکھنا غیر علمی رویہ ہے۔

اردو ایک زندہ زبان ہے۔ زندہ زبانوں میں Standardisation یعنی معیار بندی ایک نامیاتی عمل ہے۔ املا کی معیار بندی ہندوستان میں اور پاکستان میں دونوں جگہ اردو کی ترقی و ترویج کے اسی نامیاتی عمل کا حصہ ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کے املا سیمنار میں پڑھے گئے مقالات میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مظفر علی سید نے چلن اور صوت دونوں کو اہمیت دی ہے۔ اس بارے میں راقم الحروف کا مسلک کم و بیش وہی ہے جس کو مظفر علی سید نے یوں بیان کیا ہے: ''املا کو اگر روایت کا ایک مظہر قرار دیا جائے اور صوتیات کو اجتہاد کا، تب بھی روایت اور اجتہاد میں ایک متوازن مطابقت کو ممکن بنانا اہل علم کے تہذیبی کردار کا تقاضا ہوگا''۔ (بحوالہ مذکورہ، ص 1-4) مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔ یہ علمی رائے ہے۔ جو حضرات غیر علمی توجیہات کرتے ہیں، وہ مناسب نہیں۔

اختتامیہ

راقم الحروف نے 1966 میں عرض کیا تھا اور اب بیس (20) برس بعد 1986 میں پھر اسی کے اعادے کی ضرورت ہے کہ معیار بندی کے اصولوں کو سادہ اور آسان بنانے کی ضرورت ہے۔ زندہ زبانوں میں اصلاح اور توسیع کا عمل ناگزیر ہے۔ اردو زندہ زبان ہے۔ اردو املا کے اصولوں کو آسان، سادہ اور سہل بنانا وقت کی ضرورت ہے۔ مادری زبان کے طالب علموں، دوسری زبانوں کے طالب علموں، غیر ملکی طالب علموں، سب کے لیے املا کی معیار بندی اور قاعدہ بندی وقت کی آواز ہے۔

کاتب، ٹائپسٹ، ٹیلی پرنٹر، کمپوزر اور کمپیوٹر پروگرامر کی ضرورتوں کو بھی نظر میں رکھیے۔ بیس برس پہلے میں نے ہمزہ والا اصول، اور اضافت والا فارمولا، مستقبل کی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر پیش کیا تھا۔ ان بیس برسوں میں کمپیوٹر ہندوستان اور پاکستان میں آپہنچا ہے۔ مزید پانچ دس بیس برسوں میں اطلاعات رسانی اور طباعت میں اس کا چلن بڑھے گا۔ چنانچہ املا کے کفایت پر مبنی سادہ اصول تو قاعدہ بند کرنے ہی ہوں گے۔ راقم الحروف کا معروضہ یہی ہے کہ آپ اور میں ایسا نہیں کریں گے تو آنے والے لوگ کریں گے۔ روایت اور لسانیات کی آگہی کو ملانے سے نہایت سادہ اور صحیح اصول وضع کیے جاسکتے ہیں اور آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاح اور ہر تجویز چلن اور رواج کے تابع ہے۔ ثقافتی اثرات اور تقاضوں کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ لسانی معاملوں میں حکم لگانا غیر ذمہ داری کا اشتہار دینا ہے۔ روایت کے علمبرداروں کا تحکم اور رعونت کا انداز تو میں نے اکثر دیکھا ہے لیکن لسانیات سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص اگر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے تو میں عرض کروں گا کہ وہ لسانیات کا مزاج شناس نہیں ہے اور اس کو لسانیات کی نمائندگی کا حق نہیں۔ لسانیات کا کام روشنی فراہم کرنا ہے۔ اس روشنی کا صحیح یا غلط استعمال ہمارا کام ہے۔ تاہم اگر کوئی کسی علم کی روشنی پر دریچہ بند کرتا ہے تو اس سے علم کا تو نقصان نہیں ہوتا، خود ہم ہی تاریکی میں گِھر جاتے ہیں، اور ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ آفتابِ تازہ تو بطنِ گیتی سے پیدا ہوچکا، ڈوبے ہوئے تاروں کے ماتم میں مصروف رہنا مستحسن نہیں۔ روشنی ہمارے دریچوں تک آپہنچی ہے، البتہ روشنی سے استفادے کے لیے دریچے کھولنا شرط ہے۔

(1987، شاعر، بمبئی، جلد 60، شمارہ 15)

دتاتریہ کیفی کی لسانی خدمات

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی (1866-1955) ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علمی اور تحقیقی مضامین لکھے، شعر وادب کی بحثیں کیں، نظمیں کہیں، مثنویاں لکھیں اور ناول، افسانے اور ڈرامے بھی تصنیف کیے۔ لیکن ان کا وہ کارنامہ جسے اردو کا مورّخ کبھی نظر انداز نہیں کرسکتا، ان کی لسانی خدمت ہے۔ اردو زبان اور انشا اور صرف ونحو پر جس طرح انھوں نے قلم اٹھایا، اور جس طرح اپنے زمانے کے غلط رجحانات کے خلاف نہایت جرأت اور بے باکی سے آواز بلند کی، اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔ ہماری شاعری انیسویں صدی کے وسط کے بعد کی دہائیوں میں آزاد و حالی کی رہنمائی میں جدید دور میں داخل ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کی نصف صدی پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ اردو میں معنوی اور لسانی دونوں اعتبار سے وہ زمانہ خاصی افراط وتفریط کا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شاہ سعداللہ گلشن نے ولی اورنگ آبادی کو مقبولیت کا جونسخۂ ترکیب بتایا تھا اور جس کے اثر سے اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے نصفِ اول میں اردو غزل اپنے بامِ عروج تک جاپہنچی تھی، وہ ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد اپنا کام کرکے نمٹ چکا تھا، اب نئے تقاضے اور نئی ضرورتیں تھیں۔ لیکن زبان کا یہ حال تھا کہ معیار بندی (Standardisation) نے نہایت قبیح صورت اختیار کرلی تھی۔ لوگ ایک ایک لفظ پر لڑتے تھے، بال کی کھال نکالی جاتی تھی، متروکات کی فہرستیں بناکر کنجی تالے میں رکھی جاتی تھیں، ایک آواز کے دبنے یا گرنے سے شعرا اور ان کے شاگردوں کی جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف صف بستہ ہوجاتا کرتی تھیں۔ مشاعرے، معرکوں اور مجادلوں کا رنگ اختیار کرچکے تھے، اور ایک ایک لفظ کی تذکیر وتانیث پر دفتر سیاہ

کر دیے جاتے تھے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں مغربی تعلیم کے اثرات، آزاد اور حالی کی کوششوں اور سرسید اور ان کے دوسرے رفقا کی تحریروں سے اردو نظم و نثر میں ایک معنوی انقلاب تو آ گیا تھا، لیکن زبان کی دنیا میں ابھی پرانا سکہ ہی رائج تھا، اور زبان اسی پرانی معیار بندی کی پٹری پر چلی جاتی تھی۔ پنجاب خصوصاً لاہور اردو کے ایک نئے مرکز کی حیثیت سے سامنے آچکا تھا، لیکن اُسے خاطر میں کون لاتا تھا۔ اس دور کے ماہرینِ زبان میں محمود شیرانی، وحیدالدین سلیم اور مولوی عبدالحق کی علمی اور لسانی خدمات اپنی اپنی جگہ نہایت وقیع ہیں، لیکن وہ شخص جس نے پرانے دور کی اندھی معیار بندی، زبان کے سکہ بند تصوّر اور لسانی پاک بازوں (Purists) کی سخت گیری، کٹرپن اور دقیانوسیت کے خلاف اجتہاد کا علم بلند کیا اور لسانی سطح پر اردو کو جدید دور کی عقلیت پسندی اور آزاد خیالی سے روشناس کرایا اور اُسے عربی اور فارسی کے جبر و تسلّط سے آزاد کرانے اور زبان کی حیثیت سے آزادانہ مقام دلانے کی بھرپور کوشش کی، وہ کیفی اور صرف کیفی تھے۔ وہ حالی اور آزاد کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے تھے۔ جدید شاعری کا آغاز 1874 میں ہوا اور کیفی کی تحریریں بیسویں صدی کے اوائل میں سامنے آنا شروع ہوئیں۔ ان دونوں میں پچیس تیس برس کا فاصلہ ہے، لیکن یہ بات بلا مبالغہ اور بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ معنوی سطح پر جو کارنامہ آزاد اور حالی نے انجام دیا تھا، ان کے بعد لسانی سطح پر وہ کام کیفی اور اکیلے کیفی نے کیا۔ ادبی دنیا میں وہ ماہرِ زبان سے زیادہ شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے، اور اسے ستم ظریفی سمجھنا چاہیے کہ وہ خود بھی اپنی اسی حیثیت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ شاید اسی لیے ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی لسانی خدمات کا وہ اعتراف نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ انھیں اب عام طور پر ماہرِ لسانیات کہا جانے لگا ہے حالانکہ وہ ماہرِ لسانیات نہیں تھے۔ زبان کے علوم دو طرح کے ہیں۔ ایک کو Philology کہتے ہیں اور دوسرے کو Linguistics۔ دوسرا نسبتاً جدید ہے، اور اس میں زبان کی بحث تجرباتی سائنس اور منطق کے اصولوں کی روشنی میں کی

جاتی ہے، جبکہ پہلے میں بحث زیادہ تر زبان کے صرف ونحو اور اس کی تاریخ سے ہوا کرتی تھی۔ اردو میں Philology کو علم زبان اور Linguistics کو لسانیات کہنا موزوں ہوگا۔ اگرچہ کیفی نے لسانیات کو Linguistics کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور ان کے ایک مقالے کا عنوان بھی اردو لسانیات ہے، لیکن دراصل وہ Philologist یعنی ماہرِ زبان تھے، انھیں ماہرِ لسانیات کہنا کیفی اور لسانیات دونوں سے اپنی عدم واقفیت کا ثبوت دینا ہے۔

کیفیہ اور منشورات میں انھوں نے زبان اور انشا کے مسائل سے کھل کر بحث کی ہے۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ معمولی سے نکتے کی تحقیق میں وہ سینکڑوں کتابوں کو کھنگال ڈالتے تھے۔ متروکات کے مضمون کے لیے انھوں نے جن شاعروں کے دواوین وکلیات کا مطالعہ کیا، ان کے ناموں کی فہرست تین صفحوں میں آئی ہے۔ زبان کے مباحث سے ان کی طبیعت کو گہری مناسبت تھی، زبان کا ذکر آیا نہیں کہ ان کے قلم نے تیغِ دودم کی صورت اختیار کی نہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کا عالمانہ طنز اور تحقیقی جلال دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے:

عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہاں سب سے پہلے ہمیں ان کا نظریۂ زبان معلوم کرنا چاہیے۔ اردو زبان کے معاملے میں انھوں نے سوائے سید انشا کے کسی کو خراجِ تحسین پیش نہیں کیا۔ انشا کے علاوہ انھوں نے چھوٹے بڑے، عامی، عالم، شاعر، گرامرداں سب پر اعتراض کیے ہیں، اور زبان سے متعلق اگلوں کے دقیانوسی اور تقلیدی مفروضات کی سخت مخالفت کی ہے۔ سید انشا کے بھی وہ صرف اس لیے قائل تھے کہ اس نے دریائے لطافت میں چلتے چلتے ایک بڑی پتے کی بات کہہ دی تھی:

> ''واضح رہے کہ ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہوگیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح؛ وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق ہو تو بھی صحیح ہے؛ اور اگر اصل کے خلاف مستعمل ہے، تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اردو میں اس کے استعمال پر منحصر ہے

کیونکہ جو اردو کے خلاف ہے، غلط ہے، خواہ وہ اصل زبان میں صحیح ہو؛ اور جو اردو کے موافق ہے، صحیح ہے خواہ وہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو''۔

(دریائے لطافت، اردو ترجمہ 241)

یہ بیان ہر لحاظ سے اردو زبان کا میگنا کارٹا (Magna Charta) کہے جانے کا مستحق ہے۔ اس لیے کہ اس میں سب سے پہلے اردو کی آزادانہ حیثیت منوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیفی کے نظریۂ زبان کا نقطۂ آغاز بھی یہی ہے کہ اردو نہ تو فارسی اور عربی کی غلام ہے، نہ سنسکرت اور پراکرت کی باندی۔ اس کے اصول و قواعد خود اس زبان کے استعمال اور چلن کی روشنی میں متعین ہونا چاہئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کلاسیکی زبانوں کا جبر اردو کے نئے نئے جسم سے بُری طرح خون چوس رہا تھا۔ لوگ سند لاتے تھے تو انھیں کتابوں سے جو بنیادی طور پر عربی اور فارسی کے لیے لکھی گئی تھیں، اور قواعد کی بات کرتے تو انھیں پرانے اصولوں کی روشنی میں۔ کیفی کو اس کا شدید احساس تھا کہ اردو ایک ترقی یافتہ اور نمو پذیر زبان ہے، اور دوسری زبانوں سے اس نے جو کچھ لیا ہے، اس میں اردو کی خراد پر چڑھ کر اور اس کے استعمال میں آکر کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوگی۔ لیکن ''لسانی پاک باز'' ان تبدیلیوں پر ناک بھوں چڑھاتے تھے، اور ان تبدیلیوں کو اردو بدر کرنے پر زور دیتے تھے۔ کیفی کا مسلک یہ تھا کہ اردو کے یہ ہمدرد اس کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ لکھتے ہیں :

''سیاسیات کی مانند لسانیات میں بھی سخت جان ہوا کرتے ہیں ... ان کا استبداد اور سخت گیری زبان کی ترقی اور توسیع کے مزاحم اور جانی دشمن ثابت ہوئے ہیں۔ ہر زبان ان حضرات سے تنگ ہے۔ کہاں اللہ بخشے وہ بزرگ، جن کا قول تھا کہ برقع چونکہ ہماری زبان سے الف سے نکلتا ہے، اس لیے بجائے عین کے الف سے لکھنا چاہیے، اور کہاں یہ حضرات جو تصرفِ لسانی کے نام سے بھویں تانتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں ''خود رفتہ'' نہیں، بلکہ ''از خود رفتہ'' استعمال کرنا لازم ہے۔ جواب دیا گیا کہ ''سرگزشت'' کی سرگزشت تو ذرا بیان فرمائیے''۔

کیفی نے اردو کے لسانی تصرفات کو تفریس اور تعریب کے تتبع میں ''تارید'' کا

نام دیا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے قدما کی خدمات کی دل کھول کر داد دی ہے:

''ذرا غور فرمایئے کہ ان بزرگوں کی ذہنیت کتنی دقیقہ رس اور نکتہ پرور ہوگی اور ان کے تصرفِ لسانی کی قوتِ عمل کتنی زبردست ہوگی جو بخشنا، خریدنا، آزمانا، بدلنا، فرمانا وغیرہ وغیرہ مصدر ترکہ میں چھوڑ گئے ... تصرفِ لسانی کے معنی صرف اپنانا نہیں، بلکہ اپنا سا بنا لینا ہیں۔ آپ نے دیکھا عربی لفظ ''بدل'' کو لے کر بدلنا مصدر بنایا۔ اب اس فعل کی ہر زمانے اور صیغے میں گردان ہوسکتی ہے۔ یہیں تک نہیں، حاصل مصدر بنا ''بدلی''۔ تابع مہمل بھی اس کے ساتھ ملایا گیا جیسے ''ادل بدل''۔ مختصر یہ کہ اس کی وہی حیثیت ہوگئی جو آنا، جانا، کھانا، پینا کی تھی''۔

اس سلسلے میں کیفی اردو کی مذہبی رواداری پر بھی بجا طور پر زور دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے بزرگوں نے اردو کو بنانے اور سنوارنے کا عزم کیا تھا، شدھی یا تبلیغ کا نہیں۔ قرآن کا جامہ پہننا اور گنگا اٹھانا تو ایک طرف رہا، قدما نے صلوٰۃ جیسے مقدس لغت کے معنی میں بھی تصرف کیا۔ کیفی نے اس ضمن میں جو مثالیں پیش کی ہیں، ان میں گوبر گنیش، بگلا بھگت، ولی کھنگڑ، لن ترانی اور سیتا ستی (ہندی مسلمان عورت جس کے دامن پر نماز جائز ہو) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انھوں نے کئی جگہ وضاحت کی ہے کہ اردو نے تصرف و اختراع کے دوران عربی، فارسی، سنسکرت سب زبانوں سے استفادہ کیا ہے، مثلاً منہ پھٹ، ہتھ چھٹ، لنگوٹیا یار، ہنس مکھ، گنگا جمنی، تھڑدلا، گرہ کٹ، جیب کترا، گلے باز، منہ زور، جوشیلا، دل لگی، کمر کس، قبول صورت، ڈھلمل یقین، ایمان داری، درشنی جوان، بے کل وغیرہ مرکبات اردو کی قوتِ اشتقاق اور اختراع کا بین ثبوت ہیں، لیکن افسوس ہے کہ متاخرین نے قدما کی اس روایت کو برقرار نہیں رکھا اور وہ لسانی تعصب میں مبتلا ہوگئے۔ انشا کے اصول کا حوالہ دیتے ہوئے کیفی لکھتے ہیں:

''متاخرین نے طلسمِ لسان کے اس اسمِ اعظم کو بھلا کر اردو کو غیر زبانوں کا کنوڈا کردیا۔ فرماتے ہیں، عرصہ عربی میں مدت کے معنی میں نہیں آتا، اس

لیے اس معنی میں لانا غلط ... یہ ماخذ پرستی ہی نہیں بلکہ ... جبر و استبداد ہے ... عربی، فارسی، سنسکرت اور فرنگی کلمے اردو میں ہیں اور رہیں گے اور آئیں گے، مگر اس نوع سے جیسا کہ سید انشا نے فرمایا ... ہم نے دھَرم کو دھرَم، کرَم کو کرْم، موسِم کو موسَم بنادیا۔ ہم آتما یا روح کو نفس یعنی مرکزِ احساسات و جذبات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم حور (صیغۂ جمع) کو واحد قرار دے کر اس کی جمع حوروں اور حوریں لاتے ہیں ... ارواح روح کی جمع ہے۔ ہم نے کہا، اس کی ارواح خوش ہوئی ... گوبر گنیش اور صلواتیں سنانا صاف کہہ رہے ہیں کہ مقدس کلمے بھی اردو کے تصرف سے نہ بچ سکے ... شمس ہم عرب سے اٹھا تو لائے، لیکن تصرف کے افسوں نے اسے عورت سے مرد بنادیا''۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ زبان میں قاعدے اور قانون کی پابندی ضروری نہیں۔ کیفی اگر ایک طرف زبان کے سخت گیروں کے خلاف تھے تو دوسری طرف انھوں نے ان لوگوں کو بھی نہیں بخشا جو سرے سے کسی قاعدے یا ضابطے کو مدِ فضول سمجھتے ہیں۔ کیفی ان دونوں کو ادب کی جان کا دشمن کہتے تھے :

''جہاں دنیائے اردو میں ایسے اصحاب پیدا ہوگئے ہیں، جو کسی قاعدے یا ضابطے کے پابند ہی نہیں؛ وہبیت کا جن ان کے سر پر ایسا سوار ہے کہ ان کی گردن کسی اصول اور ہدایت کے سامنے خم ہونے میں نہیں آتی؛ ایسے اصحاب بھی عنقا کا حکم نہیں رکھتے جو قدیم ضابطے اور دستورالعمل میں سرِ مو تبدیلی اور ترمیم کو کفر و ارتداد کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کا ادبی جبر و استبداد سیاسی جبر و استبداد سے کم نہیں۔ یہ ادبی سخت جان اور سخت گیر بھی زبان کے حق میں ایک طرح کا مزمن مرض ہیں۔ ان میں اور اُن میں فرق وہی ہے جو تپ دق اور طاعون میں ہے، دونوں ادب کی جان کے لاگو ہیں''۔

متاخرین اور معاصرینِ کیفی کا ایک رجحان یہ بھی تھا کہ عربی اور فارسی کے الفاظ اردو میں اندھادھند لیے جاتے تھے، اور اردو کو ان الفاظ اور ترکیبوں سے بوجھل اور مشکل بنایا جارہا تھا۔ اس سلسلے میں کیفی کا ردِّ عمل شدید تھا، سخت سے سخت الفاظ میں کہتے ہیں :

''وہ اردو ہی کیا کہ جب تک قاموس اور برہان، امرکوش اور شبد کلپدرم داہنے بائیں تشریف فرما نہ ہوں، ایک تحریر کا معنی مدعا سمجھ ہی میں نہ آسکے''۔

''جن کے سر پر ادبی معاملات میں بھی شدھی اور تبلیغ کا شیخ سدّو سوار ہے وہ مہربانی سے عربی اور سنسکرت میں خامہ فرسائی کیا کریں اور اردو کو اپنے قلمِ غرابت رقم کی منت پذیری سے معاف فرمائیں''۔

''ہم کو اردو زبان کی ترقی کے لیے جس طرح کیلاش اور بنارس جانے کی ضرورت نہیں، اسی طرح قاہرہ اور تہران جانے کی بھی حاجت نہیں''۔

شاعری میں لسانی تعصب اور سخت گیری کی بدولت اور نثر میں کچھ ٹیگوریت اور ادبِ لطیف کی وجہ سے اور کچھ علمی اور سائنسی کتابوں کے بے روح تراجم اور صحافتی اردو کا دائرہ وسیع ہونے کی وجہ سے مشکل پسندی اور بلند آہنگی اس زمانے میں وبا کی صورت اختیار کررہی تھی اور اردو میں عربی فارسی لغات کی بھرمار کو باعثِ فخر سمجھا جانے لگا تھا۔ کیفی ان لوگوں کی خبر لیتے ہوئے کہتے ہیں:

''بعض کا خیال بلکہ یقین ہے کہ فارسی یا عربی الفاظ کا استعمال کلام میں زور پیدا کردیتا ہے۔ خدا معلوم وہ لوگ زور سے کیا مراد لیتے ہیں؟ ... ادب میں زور اس موسل کو نہیں کہتے جو اوکھلی میں دھان کوٹتا ہے، بلکہ زور نام ہے اس تاثر کا جس کا تعلق نفسیات سے ہے''۔

ایک اور جگہ لکھا ہے:

''بلند آہنگی اور غریب نگاری آج کل عام پسند چیزیں ہیں جس سے طرح طرح کے سقم کلام میں پیدا ہوجاتے ہیں ... بلند آہنگی کو بلاغت اور غریب نگاری کو معنی آفرینی کا مترادف ٹھہرانا التباسِ عمد کی حد سے بڑھ کر ہے''۔

اس ضمن میں انھوں نے غرابت یعنی نامانوس کلموں کے استعمال اور مخالفتِ قیاسِ لغوی یعنی اردو کے ضابطے کے خلاف لفظ کلام میں نہ لانے پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ ان کا بیان ہے:

''یہ دو نقائص کلام کے اور سب نقائص سے کہیں زیادہ عام ہیں۔ مقامی اور ذاتی تخصیص کا اس میں دخل نہیں۔ لوگوں کا مذاق کچھ ایسا بگڑ گیا ہے کہ بے ضرورت اور بے محل کلام میں غیر مانوس لغات عربی، فارسی اور سنسکرت کے ٹھونسے جاتے ہیں۔ اگر پنڈتائی اور مولویت کا زعم ذہنِ شریف پر ایسا ہی مسلط ہوگیا ہے، تو عربی، فارسی اور سنسکرت میں خامہ فرسائی کیوں نہیں فرمائی جاتی؟ بیچاری اردو کے گلے پر شمشیر اصفہانی اور فولادِ ہندی کیوں لادی جاتی ہے؟''

البتہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ غرابت کی ذیل میں انھوں نے اپنے اردو اور پنجاب والے خطبے میں جو مثالیں دی ہیں، ان میں سے احتجاج، حریّت، آدرش، اندولن اور استبداد اب اردو میں پوری طرح رچ بس گئے ہیں، اس لیے کہ ان کا بدل اردو میں ہے ہی نہیں۔ حیرت ہے کہ استبداد کو کیفی نے کلمۂ نامانوس کس طرح کہہ دیا جبکہ خود ان کی تحریروں میں یہ لفظ بیسیوں جگہ استعمال ہوا ہے۔ ایک زندہ زبان میں الفاظ کی تبدیلیاں کتنی تیزی سے اور کس انداز سے ہوتی ہیں، اس کا یہ پہلو جتنا حیرت انگیز ہے، اتنا ہی سبق آموز بھی! بہرحال کیفی کا یہ بیان ان کی معقولیت اور سلامت روی کی روشن دلیل ہے:

''ایسی کاجو بھوجو زبان جو ہمارے نقاد اور غیر مصنف ادیب بنانا چاہتے ہیں، سرسبز نہیں ہوسکتی۔ ہمارا دستور العمل یہ ہونا چاہیے:
مصلحت بیں وکارِ آساں کن''

فصاحت کے مسئلے پر بھی کیفی نے اپنے کئی لکچروں میں روشنی ڈالی ہے۔ فصاحت کے بارے میں ان کا مسلک تھا کہ فصاحت اور بلاغت کا ذکر تو عام طور پر کیا جاتا ہے لیکن فصاحت کا اصلی مفہوم زبان دانوں اور شاعروں کے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے۔ کیفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے نظریۂ فصاحت پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی اور بتایا کہ خانِ آرزو کی عطیۂ کبریٰ اور موہبتِ عظمیٰ ہو یا میرزا قتیل کی چارشربت اور نہرالفصاحت یا سید انشا کی دریائے لطافت یا صہبائی کا ترجمۂ حدائق البلاغت، ان میں کہیں بھی فصاحت کی اس تعریف پر اضافہ نہیں ملتا جو

سگا کی اور قزوینی نے اپنی عربی کتابوں میں لکھی تھی۔ یعنی ''الفصاحت یوصف بہاالمفرد والکلام والمتکلم''۔ کیفی نے اس بات پر زور دیا کہ علمِ معنی و بیان کی مشہور کتابوں میں مقدمے کی ذیل میں فصاحت کے متعلق جو کچھ درج ہے، وہ ضمنی حیثیت رکھتا ہے، اور زیادہ تر خطابت پر عائد ہوتا ہے، انشا پر نہیں، ان کا فرمانا ہے:

> ''سبھوں نے زورِ طبع بلاغت پر صرف کیا۔ فصاحت کا ذکر چلتے چلتے کسی نے مقدمے میں کردیا، کسی نے خاتمے پر۔ جبھی تو آج ہر کوئی اچھے سے اچھے شاعر کے کلام کو منہ کھول کر کہہ گزرتا ہے، فصیح نہیں؟ یہ لفظ فصیح نہیں۔ بھئی وجۂ علّت؟ کیوں فصیح نہیں ... اردو میں جو بُرچھے گردی اور طوائف الملو کی پھیلی ہوئی ہے، اس کی علّتِ غائی ادیبوں کا اختلالِ طبع اور اضطرابِ ذہن ہے ... سگا کی اور وطواط، خانِ آرزو یا شمس الدین فقیر کا کہنا کوئی آیت و حدیث تو تھا نہیں کہ اس پر کہیں انگلی رکھنا کفر ہو یا گناہِ کبیرہ!''

متقدمین نے فصاحت کا تصور تثلیث کے طور پر کیا تھا یعنی فصاحتِ کلمہ، فصاحتِ کلام اور فصاحتِ متکلم۔ کیفی نے اس نظریے کی بنیاد ہی کو غلط قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں:

> ''فصاحتِ کلمہ، فصاحتِ کلام اور فصاحتِ متکلم — یہ تینوں اضافی ترکیبیں ہیں۔ کلمہ کی تعریف صرف میں اور کلام کی تعریف نحو میں آجاتی ہے ... لیکن یہ کسی کے خیال میں نہ آیا کہ اتنا تو فرمادیتے کہ فصاحت اسے کہتے ہیں۔ ان مرکبات میں فصاحت ہی اہم اور جزوِاعظم ہے، اور اس کی اصطلاحی حیثیت بتانے سے احتراز کیا گیا''۔

فصاحتِ کلمہ کی تعریف یوں کی گئی تھی کہ وہ کلمہ جس میں تنافرِ حروف، غرابت اور مخالفتِ قیاسِ لغوی کے عیب نہ ہوں، فصیح ہے۔ کیفی نے اس تعریف پر دو اعتراض کیے۔ پہلا یہ کہ یہ تعریف محض مانع ہے، جامع و مانع نہیں۔ اس لیے منطق کی رو سے ناقص ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی کلمہ جو علمِ صرف کے قواعد کے مطابق ہے، اپنی لغوی حیثیت میں فصیح یا غیر فصیح نہیں ٹھہرایا جاسکتا؛ جو چیز اسے فصیح یا غیر فصیح بناتی ہے، وہ

اس کا استعمال ہے۔ گویا فصاحت یا غیرفصاحت کا اطلاق کلام پر ہونا چاہیے نہ کہ کلمے پر مثلاً مومن کا شعر ہے:

پانو تربت پہ مری دیکھ سنبھل کر رکھنا
چُور ہے شیشۂ دل سنگِ ستم سے پس کر

اس پر اعتراض ہوا کہ چار سین ایک جگہ لاکے اکٹھے کردیے ہیں۔ کیفی نے جواب دیا کہ یہ اعتراض شاعر کے شعورِ تالیف کے خلاف ہونا چاہیے، نہ کہ کلمات کے۔ سنگ، ستم، سے اور پس کسی میں اپنی مجرد حیثیت سے یعنی باعتبار مجرد کلمے کے نام کو بھی ثقلِ تلفظ یا تنافر نہیں۔ یہی کلمے جب مناسب محل پر صرف کیے جائیں، تو کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

اسی طرح انھوں نے مخالفِ قیاسِ لغوی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے ''جو کلمہ قاعدے، قانون اور محاورے کے خلاف ہوگا وہ صحت سے محروم ہوگا۔ فصاحت یا غیرفصاحت کا اس میں دخل ہی کیا ہے؟'' فارسی کے بعض مستند شعرا نے لنکن (فاقہ)، جکر (جھکڑ، آندھی)، کچری (کھچڑی) اور کٹار؛ اور بعض اردو اساتذہ نے نمبر، نوٹ، فریم، فیر وغیرہ الفاظ کو اردو کے قانون اور محاورے کے خلاف باندھا ہے، لیکن ان کے ایسے اشعار غیرفصیح کی ذیل میں نہیں آتے۔

فصاحت کلمہ کے غلط تصور سے ہمارے شعر و ادب پر جو بُرے اثرات پڑے، کیفی نے ان کی طرف بھی توجہ دلائی۔ کہتے ہیں: ''شعرا کا مطمحِ نظر صرف کلمۂ مفرد رہ گیا اور کلام و تخیل پسِ پشت ڈال دیے گئے ... ہندوستان میں کلمہ اور مفرد کا جادو ایسا چلا کہ آج تک کلام اس کی بھول بھلیاں میں چرغتو ہے۔ الفاظ کا تقابل اور مناسبت کا جنون بھی اسی ذیل میں آتا ہے جو منشی اور متکلم کے ہاتھ سے تخیل اعلیٰ کا سلسلہ چھڑا دیتا ہے اور کلام صرف الفاظ کا گورکھ دھندا رہ جاتا ہے۔ یہ ساری خرابی دلی والوں نے، جس میں خانِ آرزو اور مرزا قتیل کا بڑا حصہ ہے، لکھنؤ کی نوتوڑ سرزمین میں جاکر پھیلائی''۔

اس تمام بحث کے بعد کیفی نے فصاحت کی جو تعریف کی ہے، وہ جامع بھی ہے اور مانع بھی، محض مانع نہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے قریب ترین پہنچا دیتا ہے''۔ انھوں نے فصاحت کے تین درجے بتائے ہیں۔ پہلا افہام و تفہیم، دوسرا لطف اندوزی یعنی کلام سے لذت اور راحت حاصل ہونا، اور تیسرا تاثر۔ تاثر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ''اس کے معنی ہیں مخاطب آپ کے کلام سے متاثر ہوکر آپ کا ہم خیال ہوجائے''۔ یہ بیان محلِ نظر ہے۔ انھوں نے فصاحت کی تعریف جہاں تک زبان یعنی اظہار کی سطح پر کی، یہ خوب تھی؛ لیکن جونہی انھوں نے معنویات Semantics کے کوچے میں قدم رکھا (جس میں بڑی حد تک فلسفہ اور نفسیات کا سکّہ رائج ہے) وہ زیادہ دور تک نہیں چل سکے۔ اول تو یہ کہ تاثر کے معنی ہم خیال ہونا نہیں، بلکہ اثر قبول کرنا ہیں۔ پھر یہ کہ جمالیاتی تجربہ (Aesthetic Experience) صرف لذت اور راحت سے عبارت نہیں، یہ خاصا پیچیدہ اور تہ در تہ نفسیاتی اور وجدانی عمل ہے۔ (رچرڈز اسے Systemization of Impulses کہتا ہے۔ بہرحال کیفی شاید تخلیقی طور پر اس کی اصلیت سے بے خبر نہ تھے، جبھی تو فصاحت کی ذیل میں قربتِ ذہنی کی مزید وضاحت سے بچتے ہوئے انھوں نے اس بحث کو غالب کے اس شعر پر ختم کردیا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کیفی کے زمانے میں متروکات کا مسئلہ بھی اردو کے لیے پیرِ تسمہ پا بنا ہوا تھا۔ کیفی نے اردو زبان کو اس کے جبر سے رہا کرانے کی جو کوشش کی وہ قابلِ قدر ہے۔ ان کی لسانی تحقیق کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ موضوعِ زیرِ بحث کے تمام گوشوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ لکھا جاچکا ہے وہ اس سب پر نہایت غیرجانب داری سے نظر ڈالتے، علمی معروضی انداز سے اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں

سے پردہ ہٹاتے اور پھر اس مسئلے سے متعلق اپنی جچی تلی اور سوچی سمجھی ہوئی رائے پیش کرتے، جو برسوں کے مطالعے اور محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہوتی۔ متروکات کی ذیل میں شوق نیموی کی اصلاح معہ ایضاح سے لے کر نیّر کاکوروی کی نوراللغات تک نصف درجن کتابوں کا تفصیلی تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لینے کے بعد کہتے ہیں: ''اب تک ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ فلاں لفظ، فلاں ترکیب فصحا نے ترک کردی۔ کوئی پوچھے کہ آخر حضرت اس ترک کی وجہ؟ اس کا موجب؟ تو جواب ندارد... مزاج کی سودائیت نے ایک حسا سی کیفیت پیدا کر کے قوتِ ممیّزہ کو ماؤف کردیا ہے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شے میں آدم بو کا مضمون صورت پذیر ہوگیا، نہ لفظ کی صرفی ماہیت پر نظر گئی، نہ اس کی معنوی اہمیت کا لحاظ ہوا اور خَرَجَ یخرج، ترک تیرک کی گردان شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوتا ہے کہ اس اچھوت سدھار اور مساوات کے زمانے میں اردو میں 'نکالو! باہر کرو' کے سوا اور کوئی صدا سننے میں نہیں آتی''۔

کیفی نے متروکات کی لے کے بڑھ جانے کے سماجی اور معاشرتی وجوہ پر بھی نظر ڈالی ہے، ان کا یہ بیان دل چسپی سے خالی نہیں: ''ہم لوگ یعنی ہندوستان کے ہندو مسلمان خواہ کسی خطے یا حصے میں رہتے ہوں، مذہبی عقیدت اور دینی احکام کی پابندی میں نہایت راسخ اور استوار ہونے کے باوجود تہذیب الاخلاق کے باب میں نہ صرف یقین سے بلکہ عمل سے بھی ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقین ہیں۔ شبہہ شنکا، شگون، بدشگون، سعد و نحس وغیرہ ارکانِ دین کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں پر مسلّط ہیں، نذر نیاز، بھینٹ، چڑھاوا، سامنے سے چھینک پڑی، ابھی مت جاؤ، بلی راستہ کاٹ گئی، کسی سے لڑائی ہوگی، اس طاقچے کو جمعرات کے دن سہرا اور گھی کا دیا چڑھاؤ، اس پیپل کے پیڑ کو پورن ماشی کی رات کو دودھ پلاؤ اور کلاوہ پہناؤ... جبکہ ہماری معاشرتی اور جماعتی حالت وہ ہے جس کی طرف ابھی اشارہ ہوا تو یہ امر لابد تھا کہ ہماری زبان شکوک اور واہمہ کی زیرِ مشق ہو۔ جبھی تو آپ دیکھتے ہیں کہ نقائص اور سقائم، عیوب اور ذمائم جتنے ہمارے ہاں بتائے جاتے ہیں اس قسم کے کسی اور زبان میں نہیں پائے جاتے... ان سب پر طرہ یہ کہ لے دے کے تین حروفِ علت تو

ہماری زبان کی پونجی، مگر وہ بھی منہ کھول کر اپنا نام نہیں بتانے پاتے''۔

نوراللغات کے مؤلف نے لفظ سندیسا کو متروک قرار دیا تھا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے کیفی نے بتایا ہے کہ سندیسا کے معنی ہیں راضی خوشی کا پیغام، خیریت کی خبر اور عربی فارسی کا کوئی لغت جو اردو میں مستعمل ہو، اس معنی کا حامل نہیں ہے، ان کے استدلال کی یہ جلالی شان لطف سے خالی نہیں: ''نوراللغات کے جامع سے پوچھنا چاہیے کہ یہ لفظ کس وجہ سے متروکات کی فہرست میں شامل کیا گیا اور یہ کہ سندیسا کا مترادف پیغام انھوں نے کس تحقیقات کی بنا پر لکھ دیا ہے؟... اگر لکھنؤ نے اس لفظ کو ترک کردیا تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس لفظ کو استعمال کب کیا تھا۔ اخذ، اختیار یا استعمال کیے بغیر ایک شے ترک نہیں کی جاسکتی ہے۔ کسی ہندو کا یہ کہنا کہ ختنہ ترک کیا جائے یا کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ مردے کو جلانا متروک ہے، ایسا ہی لایعنی ہے جیسے یہ کہنا کہ سندیسا اردو میں متروک ہے''۔

اسی طرح انھوں نے پہ بمعنی پر، پر بمعنی مگر یا لیکن، گر بجائے اگر، تلک، یاں واں، لیجے دیجے، بتلانا، دکھلانا، عرصہ، عادی، مشکور، مت وغیرہ نام نہاد متروکات پر نظر ڈالی اور متاخرین و معاصرین کے کلام سے مثالیں پیش کرکے ثابت کیا کہ یہ الفاظ سخت گیر زباندانوں کے کڑے احتساب کے باوجود استعمال ہوتے رہے ہیں اور ان کا استعمال جاری رہنا چاہیے۔

چکھا، رکھا، لکھا، اٹھا کے بارے میں ان کا مسلک یہ تھا کہ ''غزل میں ان چاروں لفظوں کا ک تشدید بغیر آنا وجوباً متروک قرار دینا چاہیے''۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ ''امر کے واحد حاضر صیغے اور اسی طرح فعل کے دوسرے صیغوں کا آپس میں التباس نہ رہے''۔ لیکن لفظ سدا کی بحث میں وہ اپنے التباس والے نظریے سے خود ہی دست بردار ہوگئے، کہتے ہیں: ''ہماری زبان میں بہت لفظ ایسے موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور وہ بے تکلف استعمال کیے جاتے ہیں۔ 'مگر' حرف استثنا ہے اور ایک دریائی جانور کا نام بھی ہے اور کسی سے سرگوشی

کرنے کا امتیاز بھی رکھتا ہے ... ایک اور لفظ صلوٰت ہے جو دو بالکل متناقض معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بھاشا کے ایسے بہت لفظ اردو میں موجود ہیں جو سدا اور صدا سے بھی زیادہ متشابہِ باہم ہیں ... جیسے کالا، مالی، مور، بندر وغیرہ۔ کیوں بھاشا کے لفظ متروک قرار دیے جائیں اور عربی، فارسی کے نہیں، جن کے مترادف اردو میں موجود ہیں؟'' چاہیے تھا کہ وہ چکھا، رکھا، لکھا، اٹھا کی تشدید کو بھی شعرا کی سہولت پر چھوڑ دیتے۔ اول تو یہ کہ انھوں نے خود کہا ہے کہ التباس کو ترک کی بنیاد بنانا غلط ہے اور دوسرے یہ کہ اگر وہ اردو صوتیات سے پوری طرح واقف ہوتے، تو انھیں معلوم ہوتا کہ اٹھا ماضی مطلق اور اٹھا امر میں جو التباس ہے وہ محض صرف کی سطح پر ہے صوتیات کی سطح پر ان میں کوئی التباس نہیں۔ ان جملوں کو دیکھیے :

(1) وہ کام ختم کر کے اٹھا (2) وہ کتاب اٹھا

(3) اس نے خط لکھا (4) اس کو خط لکھا

اٹھا اور لکھا ماضی میں پہلے صوتی رکن پر بل (Stress) ہے، اور اٹھا اور لکھا امر میں دوسرے صوتی رکن پر بل ہے۔ نیز ان کی معنوی تفریق میں لہجے کی لہر (Intonation) کا فرق بھی ہے۔ کیفی اس سے بے خبر نہیں تھے۔ اپنے فصاحت والے خطبے میں انھوں نے ایک جملہ ''میں کل دہلی جاؤں گا'' کی مثال سے چھ مختلف معنی اخذ کیے ہیں۔ لیکن غالباً انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس طرح جملے میں الفاظ کے علاوہ لہجے کی لہر بھی معنی کی تفریق کا باعث بن جاتی ہے، اسی طرح لفظ کے صوتی ارکان کا بل بھی اہمیت رکھتا ہے، اگرچہ یہ بل اردو میں نہایت جزوی امتیاز کا حامل ہے۔

کیفی کی بڑائی اس میں ہے کہ ان سے پہلے لوگوں نے آنکھیں بند کر کے متروکات کی فہرستیں شائع کردی تھیں اور کسی نے اس اہم موضوع پر تحقیقی نظر ڈال کر مدلل بحث کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ کیفی نے اس سلسلے میں نہ صرف اساتذہ کے دواوین کھنگال ڈالے اور متروکات کے افسانہ و افسوں (Myth) کی دھجیاں اڑا دیں، بلکہ آئندہ رہنمائی کے لیے اصول بھی متعین کیے۔ ان کا بیان ہے : ''متروک

وہ لفظ یا ترکیب ہے جو ایک وقت ایک زبان میں بغیر کسی قید اور تخصیص کے مستعمل ہو، لیکن پھر اس کا استعمال بالکل یا اس کے ایک مختص معنی میں ترک کر دیا گیا ہو"۔

متروکات کو کیفی نے دو شقوں میں تقسیم کیا: معنوی اور لفظی۔ معنوی متروکات میں انھوں نے محبوب کے خطِ عارض کے ذکر، کم سنی، جوبن، وصل و عریانی، دل کی تجارت وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ ان میں بیشتر غزل کے فرسودہ مضامین سے متعلق اُن اصولوں کی توسیع ہیں جو حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں پیش کیے تھے۔ یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ 1925 میں جب انھوں نے یہ خطبہ لکھا، تو معنوی متروکات کے باب میں وہ اس مقام سے آگے نہیں بڑھے، جہاں حالی 1893 میں پہنچ چکے تھے، یہ اس لیے کہ لسانی اعتبار سے کیفی جدید دور کے علم بردار سہی لیکن جہاں تک اخلاق اور آداب کا تعلق تھا، وہ پرانی قدروں ہی کے دلدادہ تھے۔ منشورات اور کیفیہ دونوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "وصل کے اشعار میں ایسی بدمذاقی اور عریاں نویسی سے کام لیا جاتا ہے کہ کوئی شاعر سینے پر ہاتھ مار کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنی غزلیں اپنی ماں اور باپ اور بہن کے سامنے پڑھا کرتا ہوں"۔ اپنی جگہ بہت خوب ہے، لیکن اس جملے کے دوسرے حصے سے بالواسطہ طور پر شاعری کی جو تعریف مستنبط ہوتی ہے، اُسے اگر صحیح مان لیا جائے تو ہمیں دنیا کی شاعری کے ایک بڑے حصے سے دست بردار ہو جانا پڑے گا۔

لفظی متروکات کی ذیل میں انھوں نے حکم لگایا کہ "نثر اور غزل میں اضافت کا استعمال قطعاً ترک کر دیا جائے اور واوٴ عاطفہ کے ساتھ بھی اضافت کا سلوک کرنا چاہیے"۔ بارے بعد میں انھوں نے خود وضاحت کر دی کہ ... "میں ادب اور زبان کے معاملوں میں بُرچھے گردی کے سخت خلاف ہوں ... زیادتی جیسی کلام کا سقم ہے، ویسی ہی فن کے قواعد کی توضیح کا"۔ ورنہ اُن کے بیانات میں بعض جگہ جو قطعیت اور سخت گیری ملتی ہے، اس سے ان کی معقولیت اور جدید ذہن پر حرف آتا اور یہ اعتراض بھی وارد ہوتا کہ عطف و اضافت کے معاملے میں وہ خود اپنے اصولوں پر کاربند نہیں تھے، کیونکہ ان کی تحریروں کا شاید ہی کوئی پیراگراف ہو جو واوٴ عاطفہ اور

اضافت سے خالی ہو!

کیفی کا اندازِ بیان بنیادی طور پر سادہ اور سلیس ہے۔ اس میں صفائی ہے، روانی بھی اور زور بھی۔ وہ طنز سے بھی کام لیتے تھے، لیکن ان کی ظرافت، شوخی اور بے ساختگی سے عاری ہے، یہ کتابی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ان کی زبان بھی کہیں کہیں تصنع کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ جہاں مسئلۂ زیرِ بحث کے بارے میں ان کا ذہن صاف نہیں اور جہاں وہ اپنے بعض لیکچروں کی تمہید باندھتے ہیں، ان کا اندازِ بیان پیچیدہ، مغلق اور ژولیدہ ہے؛ اور خود ان کے بیان کیے ہوئے بعض نقائص ان کی اپنی تحریروں میں مل جاتے ہیں۔ ایسے مقامات پر ان کے اسلوب کا فطری حسن رخصت ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ علمیت جتائی جا رہی ہے اور قاری یا سامع کو مرعوب کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات دیکھیے :

> ''زبان متعدد علوم سے استعانت کرتی ہے، لیکن باوجود اس کے انسان کا ذہن افکار کے اظہار کی تلاش اور چھان بین میں زبان کی ترقی وحلِ معضلات اور روابط و نتائج کے درمیان ایک قسم کی حدوسطی ہے۔ تاریخ کے مانند زبان کی تحلیل علمیہ مثل کیمیا اور طبیعات کے ایک معمل میں ناممکن ہے''۔
>
> (اردو لسانیات، ص 7، پہلا ایڈیشن)

> ''اگر آپ جانتے ہیں کہ فکر کی قوت کا وہ درجہ ہے کہ جس تک ترقی کرنے سے التزاماً انسان کا ذہن اتنا صحیح الفکرت اور قوی الحرکت، وسیع المشاہدات اور سریع المناظرات ہو جاتا ہے کہ پھر اُسے فوراً ضابطوں کے سمجھنے اور نفس نظام کے پہچاننے یعنی اصول قائم کرنے میں دقت پیش نہیں آتی''۔
>
> (اردو اور پنجاب، ص 289)

ان کے جملوں کی ساخت بعض جگہ انگریزی سے اور بعض جگہ بلا ضرورت فارسی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ وہ شخص جس نے ساری عمر سادہ اور عام فہم زبان لکھنے کی تلقین کی ہو، اس کے ہاں جب ہم کئی کئی سطروں میں یا پورے پیراگراف میں پھیلے ہوئے جملوں کو دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔ ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں

جہاں انھوں نے بعض الفاظ یا ترکیبوں کو نامانوس طریقے پر استعمال کیا ہے:

''یہ دلیل اس وقت پذیرا ہوسکتی ہے'' (ص 60، پہلا ایڈیشن)
''تشبیہ متعدد، یہ دو قسم ہے ...'' (ص 114)
''اولیات مبادیات سے دستبردار ہوکر براہِ راست موضوع سے رجوع لاتا ہوں''۔ (ص 66)
''وقت اور اختلاف جو آکر پڑتے ہیں'' (ص 73)
''سنسکرت کے اکثر الفاظ اس صوتی جبر کے معمول ہیں''۔ (ص 73)
''مرد کی سبقت عورت پر مذکر سے مونث کی ساخت کی منتج ہوئی''۔ (ص 84)
''حسوں اور قوائے ذہنی کا معاملہ علم الحس والقویٰ کے متعلق ہے''۔ (ص 102)
''صفت جس میں ان دونوں یعنی مشبہ اور مشبہ بہ کو اشتراک یا افتراق ہو، تین طرح پر ہے''۔ (ص 106)

جملے کے اندر ذیلی جملے کا استعمال ان کی کمزوری تھا۔ ایسے ٹکڑے نثر کی روانی میں حائل ہوتے ہیں اور ان سے معنوی الجھاؤ بھی پیدا ہوتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

''پھر بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ سنسکرت کے مقابلے میں عربی کلمات کی شرکت اردو میں زیادہ ہوئی ہے، لیکن لسانیاتی تاثر کا جہاں تک تعلق ہے اور صرفی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہماری زبان عربی سے زیادہ سنسکرت سے براہ راست یا بالواسطہ مستفید ہوئی ہے''۔ (ص 67)

''نہ سمجھیے کہ یہ ناک کاٹنے کا عمل کہیے مرض ہندوستان اور عورتوں ہی سے تعلق رکھتا ہے''۔ (ص 93)

''ان کی تنظیم یعنی انشا کہیے جملوں کا ایسا اسلوب جو منشی یا متکلم کے مافی الضمیر کو بوجہ احسن ظاہر کرسکے اور کارآمد و متداول علوم وفنون سے متعلق اظہارِ بیان کی قدرت رکھتا ہو''۔ (ص 67)

اگرچہ انھوں نے ایک جگہ خود لکھا ہے ''میرا یہ زعم نہیں کہ جن نقائص و اسقام کا ذکر ذیل میں آئے گا ان سے میرا کلامِ نظم و نثر بالکل پاک ہو''۔ لیکن یہ کہہ کر وہ

بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ جو شخص سادہ و سلیس زبان کی حمایت میں سب سے آگے رہا ہو اور دوسروں پر اعتراض کرنے میں شمشیر برہنہ کی مثال رہا ہو، اگر خود اس کا اپنا اسلوب ژولیدہ بیانی اور مخالفتِ قیاس لغوی سے پاک نہ ہو تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اپنی زبان کے بارے میں وہ کسی کی تنقید سننے کے روادار نہ تھے۔ گویا زبان کے معاملے میں جہاں وہ بت شکن تھے، اپنے اسلوب کے معاملے میں وہ بُت پرست تھے۔

اردو زبان کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کا سب قابلِ قبول نہیں۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں ان کی معلومات تشنہ اور ادھوری معلوم ہوتی ہیں۔ وہ مرکبات اور مشتقات کے بارے میں اخذ و تصرف کے قائل تھے۔ کہیں کہیں یہ لَے بہت بڑھ گئی ہے، انھوں نے ایسے لفظوں کی فہرستیں پیش کی ہیں جنھیں خود انھوں نے وضع کیا تھا اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی انھیں اپنائیں اور استعمالِ عام میں لے آئیں۔ لیکن ان لفظوں کو سوائے ان کے کسی دوسرے نے استعمال نہیں کیا۔ وہ دو آبۂ گنگ و جمن کو دو آبۂ گنجم کہتے تھے۔ قبل مسیح کے لیے قم اور بعد مسیح کے لیے بم کی اصطلاحیں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح پولی ٹیشین کو سیّاس اور سائیکولوجی کے ماہر کو نفّاس کہتے تھے۔ شارٹ سٹوری کے لیے افسانہ پہلے سے موجود تھا، لیکن وہ افسانچہ کہنے پر زور دیتے تھے۔ اور تو اور لنگوسٹ کو ماہرِ لسانیات نہیں بلکہ لسّان کہتے تھے۔ نیم گرم ارادہ اور گلابی اصول بھی ان کی اس طرح کی اصطلاحیں تھیں۔ وہ مواد، احتجاج اور استبداد وغیرہ لفظوں کے بھی خلاف تھے، جو اب استعمالِ عام میں آچکے ہیں۔ اسی طرح وہ عربی متعلقات فی الحال، قریب المرگ، دائم المریض، بعینہٖ اور بَین اور بِین اور فارسی ہرچند، ہنوز، مدام اور امسال کو اردو سے خارج کردینے کے حق میں تھے، وہ حد کو Extent کے معنی میں استعمال کرنا بھی غلط سمجھتے تھے، مثلاً یہ جملہ ''کسی حد تک اس کا امکان ہے'' یا ''ایک حد تک تو وہ مان گیا ہے'' ان کے نزدیک نظری تھا۔ ایک طرف جہاں انھوں نے ادبی ناداری، اقتصادی تنظیم، اتحادی، پن بجلی، تارید، تشخیص، زمینداری، لام بندی جیسی عمدہ اصطلاحیں اردو کو دیں، وہیں دوسری

طرف انھوں نے Inferiority Complex کے لیے چھوٹ وہم، سنیما کے لیے تختہ و چادر وضع کیے تھے، اور ہوائی جہاز کو اڑناؤ اور فاؤنٹن پن کو سرجیون قلم کہنے پر اصرار کرتے تھے۔ عربی میں قاعدہ ہے کہ ایک لغت جو مفرد میں مونث ہو جمع سالم کی صورت میں مذکر ہو جاتا ہے۔ کیفی اردو میں اس اصول کی پیروی کے خلاف تھے۔ لیکن ان کے بعض جملے خود ان کے اصول کی نفی کرتے ہیں :

''اطراف تشبیہ کے دیگر تشبیہی تفصیلات اور باریک نکات کو نظرانداز کر کے اب میں وجہِ شبہ کا ذکر کرتا ہوں''۔

یا

''ان چھٹوں مطبوعات میں سے کئی ایسے ہیں''۔

متروکات کے باب میں جدید ذہنی رویے کے باوصف وہ فعل حال کی شکل ''آئے ہے، جائے ہے'' کو پسند نہیں کرتے تھے، حالانکہ شعری چلن کا فیصلہ اِن کے استعمال کے حق میں رہا ہے۔

منشورات اور کیفیہ دونوں کتابوں میں بہت سے موضوعات مشترک ہیں، لیکن ان میں ایک اہم فرق ہے۔ کیفیہ میں مباحث کو مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے جبکہ منشورات لکچروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں ایک شخصی لَے ملتی ہے جس کی وجہ سے خشک سے خشک مباحث بھی دلچسپ ہوگئے ہیں۔ منشورات میں زیرِ بحث آنے والے موضوعات کے علاوہ کیفیہ میں انھوں نے حروفِ تہجی، اسم، صفت، ضمائر، ظرف، تذکیر و تانیث، روزمرہ، محاورہ، اسلوب، عروض اور املا کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تذکیر و تانیث کی ذیل میں ایک جگہ انھوں نے یہ ذکر چھیڑا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں : کوشش کرنی ہے اور بعض کہتے ہیں : کوشش کرنا ہے۔ جو لوگ کرنا کے حق میں ہیں، ان کا یہ قول ہے کہ اردو کا ہر مصدر مذکر ہے، اس میں تصرف ناجائز ہے۔ کیفی نے دو ٹوک فیصلہ دیا ہے کہ مصدر میں تصرف نہ صرف ناجائز نہیں، بلکہ زبان کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ جب ''وہاں جانے سے کیا فائدہ ہوگا''۔ جیسے جملوں میں ہم ''جانا'' کو مابعد کے حرفِ جار کی وجہ سے ''جانے''

میں تبدیل کر سکتے ہیں تو ''کرنا'' کو ''کرنی'' میں کیوں تبدیل نہیں کیا جا سکتا! اسی طرح فعلِ ناقص کی جنس کے بارے میں بھی انھوں نے نہایت واضح رائے دی ہے۔ یہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب مبتدا اور خبر مختلف الجنس ہوں۔ اس سلسلے میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ اگر فعل مبتدا کے قریب آپڑا ہے تو اس کی جنس کے موافق ہوگا ورنہ دوسری صورت میں خبر کے موافق۔ لیکن اساتذہ تک کے ہاں اس سلسلے میں بے قاعدگی ملتی ہے۔ غالب کا شعر ہے:

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

اس میں فعل خبر سے قریب ہے لیکن جنسیت میں مبتدا کے موافق ہے، جبکہ ذوق کے مندرجہ ذیل شعر میں یہ خبر کے موافق ہے:

دریائے غم سے میرے گزرنے کے واسطے
تیغِ خمیدہ یار کی لوہے کا پُل ہوا

کیفی نے اس ضمن میں نہایت مدلل طریقے سے کہا کہ جملۂ اسمیہ میں امتیازی حیثیت مبتدا کی ہے خبر کی نہیں۔ مثال کے طور پر ایک لڑکی اپنے بھائی سے کہتی ہے: ''اگر میں تیرا بڑا بھائی ہوتی تو بھی تو مجھ سے یہی کلام کرتا''۔ اس جملے میں ''بھائی'' کی رعایت سے اگر ''ہوتا'' بولا جائے تو غلطِ محض ہے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ قربت کی شرط بے حقیقت ہے اور فعلِ ناقص کو ہمیشہ مبتدا کا ہم جنس ہونا چاہیے۔

املا کے بارے میں بھی انھوں نے قابلِ قدر باتیں لکھی ہیں۔ لیکن ان کی اس تجویز سے اتفاق کرنا ممکن نہیں کہ واؤ معروف کے سر پر اکثر الٹا واؤ بنایا جاتا ہے، اس لیے کاما کو استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ وہ سکتے کے لیے ڈیش (ـ) اور ختمِ جملہ کے لیے صلیب (+) کی علامت رائج کرنا چاہتے تھے۔ یہاں چلن کا فیصلہ ان کے حق میں نہیں۔ اردو میں سکتے کے لیے کاما کا استعمال عام ہو چکا ہے اور ختمِ جملہ کے لیے وہی پرانی علامت یعنی چھوٹی لکیر یا ڈیش استعمال کی جاتی ہے۔

کیفی اردو شاعری میں بنیادی تبدیلیوں کے حق میں تھے۔ انھوں نے کئی جگہ اس کی وضاحت کی ہے کہ پہلے عروض عرب سے ایران گیا اور ''ایران سے ہندوستان میں بلائے مبرم کی طرح نازل ہوا''۔ اس باب میں وہ نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی سے متفق تھے۔ ''ہر زبان کا خاص لہجہ ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ کے خاص اوزان ہوتے ہیں، لامحالہ وزنِ شعر بھی جداگانہ ہوگا''۔ کیفی اس بات پر زور دیتے تھے کہ اردو آریائی زبان ہے اور عربی سامی زبان۔ یہ صرفی زبان ہے اور وہ غیر صرفی زبان۔ دونوں کی اپنی ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہے؛ ان میں نہ صرفی ہم آہنگی ہے، نہ نحوی اور لسانیاتی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ''بحور و اوزان اور قافیے کے قواعد جو عربی زبان کے لیے مدون کیے گئے تھے، مارشل لا کی طرح ہم پر عائد کیے گئے۔ ان کا نباہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ان سے بغاوت اس جوش و خروش کی ہوئی کہ اب بے راہ روی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔'' موجودہ عروض کو کیفی طلسماتی عروض کہا کرتے تھے۔ اس کے استبداد کو ختم کرنے کا ان کے نزدیک ایک ہی طریقہ تھا کہ اس میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور اردو زبان کے مزاج کو سامنے رکھ کر ایک دیسی عروض کی تشکیل و تدوین کی جائے۔

کیفی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اُردو کو کلاسیکی زبانوں کے حد سے بڑھے ہوئے رسوخ سے آزاد کر کے ایک قائم بالذات اور مستقل حیثیت دینے کی کوشش کی۔ اگلوں کے اصولوں کو تحقیق کی کسوٹی پر کسا اور ان کے فرسودہ اور غلط حصے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ دقیانوسیت، سخت گیری اور لسانی انتہا پسندی کے خلاف آواز بلند کی اور اردو کو ایک آزاد اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے پیش کیا، لسانی تبدیلیوں کی طرف توجہ دلائی، تصرفات کو سراہا، عام اور سادہ زبان کے حُسن کو واضح کیا؛ زبان کے معاملے میں عقلیت اور جدید ضرورتوں کے شعور کو عام کیا اور اُردو کے دائرے کو وسیع کرنے، نئے تقاضوں کو سمجھنے اور مستقبل کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنے پر زور دیا۔ اس مضمون کو انھیں کے ایک اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے:

''یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اردو کے واحد مالک نہیں بلکہ امین ہیں۔ وہ ایک ودیعت، ایک امانت ہے جو حفاظت اور ترقی کے لیے ہمیں سونپی گئی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ماضی سے سبق لے کر اس کی موجودہ حالت کا صحیح موازنہ کریں اور اُسے ایسا بنا جائیں ... اور اس کی ترقی کے ایسے رستے نکال کر چھوڑ جائیں کہ جو ہمارے بعد ہماری جگہ آئیں گے، ان کے لیے کوئی ناگوار عوارض مانعِ اِرتقا نہ رہ جائیں''۔

اردو کے اس محسن، بہی خواہ اور جاں نثار نے اپنا یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا، لیکن کیا ہمیں بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے!

(1968)

احتشام حسین کی لسانی خدمات

ادبی مسائل کے علاوہ احتشام صاحب لسانی مسائل کے بارے میں بھی غور وفکر سے کام لیتے تھے۔ یہ بات انھوں نے شروع ہی سے محسوس کرلی تھی کہ زبان کا جو تصور عام طور پر رائج ہے وہ زوال آمادہ اور گم راہ کن ہے۔ کہیں اسے مذہبی برتری کے لیے، کہیں علاقائی برتری کے لیے اور کہیں سماجی برتری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ زبان کے استحصالی روپ ہیں، جس میں اس کی اصلیت اور ماہیت کو اور اس کی سماجی اور عوامی ضرورتوں کو جن کی وجہ سے زبان وجود میں آتی ہے، نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ احتشام صاحب کو ان مسائل کے بارے میں سوچتے ہوئے سائنسی اور معروضی نظر لسانیات اور صرف لسانیات سے حاصل ہوسکتی تھی جو ایک سماجی سائنس ہے اور جو زبان کو بنیادی طور پر ترسیل اور افہام وتفہیم کی چیز سمجھتی ہے، جو زبان کی عوامی بنیاد پر اصرار کرتی ہے، اور جو زبان کو طبقاتی، نسلی، مذہبی یا علاقائی برتری کے حربے کے طور پر استعمال کیے جانے کی شدید مخالفت کرتی ہے۔ آزادی سے چند برس پہلے ہندوستان کی قومی زبان کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کرگیا تھا۔ لسانیات سے احتشام صاحب کی دلچسپی اسی موقع پر پیدا ہوئی۔ انھوں نے جان بیمز کی کتاب An Outline of Indian Philology کا ترجمہ کیا اور اس پر طویل مقدمہ لکھا جس میں تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس وقت انھوں نے لکھا تھا ''میرا ارادہ ہے کہ جلد ہی فلسفۂ لسان اور اردو پر ایک مختصر سی کتاب پیش کروں''۔[1] اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1957 میں شائع ہوا، تب انھوں نے لکھا تھا ''جب پہلی دفعہ یہ کتاب شائع ہوئی تھی تو میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ لسانیات پر ایک کتاب جلد ہی مرتب

1 ہندستانی لسانیات کا خاکہ، طبع 1957، ص 7

کروں گا، لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اور وہ اب بھی قائم اور نیت اب بھی بخیر ہے، بلکہ اس سلسلے میں بہت سا کام ہو بھی چکا ہے''۔[1] احتشام صاحب اکثر ملاقاتوں میں اس کتاب کا تذکرہ کیا کرتے تھے کہ اس کے بہت سے اجزا انھوں نے لکھ لیے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کی مصروفیات بڑھتی گئیں اور وہ اس کام کو مکمل نہ کر سکے۔ وہ ترقی اردو بورڈ کے لسانی پینل کے رکن بھی تھے اور آخری برسوں میں گریرسن کی Linguistic Survey of India کی 9 جلدوں کے حصۂ اول کا ترجمہ کر رہے تھے جس میں مغربی ہندی، ہندستانی، اردو، ہریانی، برج، قنوجی اور بندیلی کی تاریخ اور ساخت سے بحث کی گئی ہے، لیکن افسوس کہ یہ کام بھی مکمل نہ ہو سکا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کے جو اجزا انھوں نے ترجمہ کر لیے تھے، وہ محفوظ بھی ہیں کہ منتشر ہو گئے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ تاریخی لسانیات سے ان کی دلچسپی برابر قائم رہی اور لسانی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ سائنسی انداز نظر سے برابر کام لیتے رہے۔ ان کی جو لسانی تحریریں شائع ہو چکی ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

ہندستانی لسانیات کا خاکہ (مقدمہ)		1948
اردو کا لسانیاتی مطالعہ	ادب اور سماج	1948
اردو کے لیے ہندی رسم الخط	'ہماری زبان'	15 جون 1958
زبان اور رسم خط	ذوق ادب اور شعور	1955
پاکستان میں اردو	ذوق ادب اور شعور	1955
زبان اور تہذیب	افکار و مسائل	1962
صحت زبان کے لسانیاتی پہلو	افکار و مسائل	1962
ہند آریائی مسلمانوں کی آمد سے پہلے	رسالہ اردوئے معلیٰ	1961
اردو رسم خط: چند خیالات	رسالہ شب خون	1970

اس سے ظاہر ہے کہ احتشام صاحب نے زبان کے مختلف پہلوؤں اور مسائل پر خاصا

1 ہندستانی لسانیات کا خاکہ، طبع 1957، ص 8

لکھا، لیکن سب سے زیادہ توجہ انھوں نے قومی زبان کے مسئلے یعنی ہندی اردو کے رشتے، اردو کے مستقبل اور رسم خط کے مسئلے پر صرف کی۔ ان کی لسانی تحریروں میں یہ مسائل مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظریۂ زبان سے متعلق ان کی فکر کا ارتقا برابر جاری رہا اور اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں۔ اس سلسلے میں ان کی سب سے مبسوط اور جامع تحریر ''ہندستانی لسانیات کا خاکہ'' کا مقدمہ ہے۔ جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ محض ایک محرک تھا۔ اصل مقصد ہندستانی سماج میں اور ہندستانی زبانوں میں اردو کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالنا تھا۔ یہ مقدمہ 74 صفحوں پر محیط ہے۔ گویا آدھی کتاب مقدمہ ہے اور آدھی ترجمہ اور دراصل ترجمے کی یہ ضخامت بھی حواشی کی وجہ سے ہے جنھیں احتشام صاحب نے نہایت محنت سے لکھا۔ اگر حواشی کو نکال دیا جائے تو ترجمہ اصل کتاب کا ایک تہائی بھی نہیں۔ اس کتاب کا انتساب مہاتما گاندھی کے نام ہے۔ جس وقت گاندھی جی کی شہادت ہوئی، یہ کتاب غالباً لکھی جارہی تھی۔ انتساب کے الفاظ ہیں: ''مہاتما گاندھی کی یاد میں جنھوں نے ہندوستان کی لسانی گتھی کو سلجھانے کی سب سے زیادہ پرخلوص کوشش کی'' (12 فروری 1948) اس وقت احتشام صاحب کے ذہن میں یہ سوال بار بار اٹھا ہوگا کہ آزاد ہندوستان کے لسانی نقشے میں اردو کا کیا مقام ہوگا اور آئندہ چل کر ہندوستان کی قومی زبان ہندی کے ساتھ اردو کی کیا حیثیت ہوگی۔ یوں تو ہندی، اردو اور ہندستانی کی بحثیں بہت ہورہی تھیں، لیکن ان کی نوعیت زیادہ تر جذباتی تھی یا سیاسی۔ لسانیات کی نظر عام نہیں تھی۔ احتشام صاحب نے اس کمی کو محسوس کیا، اور اس راہ میں قدم بڑھاتے ہوئے لکھا:

''اس وقت اردو ہندی اور ہندستانی کی جو گتھی ہر ناخن کے لیے حوصلہ شکن بن رہی ہے، اس کے حل کرنے میں قومی جذبات سے زیادہ لسانیات کا مطالعہ مدد دے سکتا ہے''۔[1] اردو اور ہندی کے بارے میں احتشام صاحب نے جان بیمز کو اپنا رہنما قرار دیا۔ بیمز اردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں تسلیم نہیں کرتا اور مجموعی حیثیت سے دونوں کے لیے اکثر ہندی ہی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس زمانے میں خود

1 ہندستانی لسانیات کا خاکہ، طبع 1957، ص 5

احتشام صاحب کی بھی یہی رائے تھی۔ ''لسانیات کے نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں ہے''۔[1] بعد میں احتشام صاحب کو اپنے اس نظریے میں تبدیلی کرنی پڑی۔ جان بیمز نے اس سلسلے میں ایک دلیل یہ دی تھی کہ ''اردو کا کوئی ایسا جملہ لکھنا ناممکن ہے جس میں آریائی الفاظ نہ ہوں۔ اس کے برعکس ایسے بہت سے جملے لکھے جاسکتے ہیں جن میں فارسی کا ایک بھی لفظ نہ ہو''۔[2] اس تعریف کی خامی یہ ہے کہ جان بیمز نے زبان کی ساخت اور لفظیات میں خلط مبحث کردیا ہے۔ ساخت تو ہندی اور اردو کی ایک ہی ہے، فرق لفظیات کا ہے، وہ بھی تدبھو کا نہیں، تت سم کا جو علمی اور ادبی سطح پر استعمال ہوتے ہیں۔ اردو ہندی کی اس تعریف میں ساخت اور لفظ دونوں کو ملا کر لفظ سمجھ لیا گیا ہے جب کہ صرف لفظ زبان نہیں ہوتے۔ اردو اور ہندی پر کام کرنے والے بہت سے ماہرین مدتوں فریب کا شکار رہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندی اور اردو ایک زبان تو ہیں لیکن غیر مشروط طور پر نہیں، یعنی اصل اور بنیاد ایک ہے لیکن دونوں کی ادبی روایتوں کا فروغ اور ارتقا اس طرح ہوا ہے کہ اب یہ دو الگ الگ مستقل زبانیں بن چکی ہیں۔ چنانچہ بعد میں احتشام صاحب نے اس ضمن میں اپنے خیالات پر نظرثانی کی جس کا اظہار انھوں نے 1970 میں اپنے ایک مضمون میں کیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ہندی اور اردو کی بحث کے بعد مقدمے کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جسے احتشام صاحب کی مجوزہ لسانی کتاب کی بنیاد کہنا چاہیے۔ اس کا پہلا حصہ ''زبان اور سماج'' پر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر احتشام صاحب نے Huxley, Haldaane, Gray, Lindsay, Childe کی تصانیف غور سے پڑھی تھیں اور زبان کی نشوونما کے بارے میں تمام ضروری مآخذ کا مطالعہ کیا تھا۔

مقدمے کے ابتدائی حصے میں احتشام صاحب نے ہندستانی زبانوں کی گروہ بندی سے بحث کی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے لسانی خاندانوں کا ذکر کرنے کے بعد

---

1 ہندستانی لسانیات کا خاکہ، طبع 1957، ص 12

2 ایضاً، ص 14

انھوں نے ہند یوروپی اور ہندوستان اور آریہ اور سنسکرت اور پراکرت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد پراکرتوں کے تین ادوار کا ذکر ہے۔ یہ چند صفحے گویا بیج تھے اس اہم توسیعی خطبے کا جو انھوں نے ''ہند آریائی، مسلمانوں کی آمد سے پہلے'' کے نام سے بارہ برس بعد دہلی یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز میں میری فرمائش پر لکھا تھا۔[1]

مقدمے میں انھوں نے اردو کی ابتدا کے مختلف نظریوں پر بھی مختصر نظر ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شروع کے دو سو سالوں میں مخلوط زبان کے خدو خال تو ضرور ابھر سکتے ہیں لیکن دو سو سال کی مدت زبان بننے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔[2] یہ ایک اعتبار سے پروفیسر مسعود حسین کے نظریۂ آغاز اردو کی توثیق ہے، اگرچہ وہ آگے چل کر یہ بھی کہتے ہیں ''ابتدائی دور میں پنجابی کی کافی آمیزش نظر آتی ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ خود پنجابی اور بالخصوص مشرقی پنجابی اسی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی تھی جس سے کہ مغربی یوپی کی بولیاں''۔[3]

اس بحث میں احتشام صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پنجابی، ہریانی اور کھڑی بولی کی خصوصیات ابتدائی دور میں پائی جاتی ہیں۔ ''بعد میں ایسی تبدیلیاں ہوتی گئیں جنھوں نے اسے پنجابی سے دور کردیا اور کھڑی بولی نکھرتی گئی''۔[4] اس ضمن میں انھوں نے شوکت سبزواری کے اس خیال کی بھی تردید کی کہ اردو کی ابتدا کا سراغ پالی میں تلاش کرنا چاہیے۔ شوکت سبزواری قواعدی آدمی تھے اور جدید لسانیات سے

1 راقم الحروف کی تحریک پر دہلی یونی ورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ نے اردو لسانیات کے توسیعی خطبوں کا پروگرام بنایا تھا۔ ان خطبوں کے لیے سید احتشام حسین، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری اور پروفیسر مسعود حسین کو زحمت دی گئی تھی۔ بعد میں یہ سب مقالے مع پروفیسر گیان چند جین اور راقم الحروف کے مقالوں کے اردوئے معلّٰی کے لسانیات نمبر میں شائع کیے گئے۔

2 ہندستانی لسانیات کا خاکہ، ص 56

3 ایضاً، ص 56

4 ایضاً، ص 58

علاقہ نہیں رکھتے تھے۔ ایسی اختراعی بات انھیں کے ذہن سے نکل سکتی تھی۔ مقدمے کے آخری حصے میں احتشام صاحب نے اردو کے ارتقا سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے دل کی بات ''قومی زبان کا مسئلہ'' کے عنوان سے شروع کرتے ہیں۔ یہاں چونکہ خیالات میں آمد تھی، احتشام صاحب کو احساس ہوا ''یہ مقدمہ اندازے سے بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اس لیے اب صرف اشاروں سے کام لینا پڑے گا''۔[1] وہ اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں کسی جگہ زبان کے مسئلے نے یہ شکل اختیار نہیں کی جو آج ہندوستان میں ہے اور جو ''فرقہ پرستی، رجعت پسندی اور گم راہ حب الوطنی''[2] کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ انھیں دکھ تھا کہ جب آٹھ سو سال کی کوشش کے بعد عام بول چال کی ایک ایسی زبان بنی جو قومی وحدت کی شیرازہ بندی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھی تو کھڑی بولی کے روپ میں ایسی ہندوستانی زبان کو نظر انداز کیوں کیا گیا۔ اس کی ساری ذمہ داری انھوں نے انگریزی سیاست اور نئے متوسط طبقے پر ڈالی جس نے ہندو اور مسلم قوم پرستی کا الگ الگ جذبہ پیدا کیا''۔[3] اردو کے بارے میں انھوں نے یہ پتے کی بات کہی ''پندرہ سو سال قبل مسیح جو رشتہ ٹوٹ گیا تھا وہ مسلمانوں کے میل جول سے پھر قائم ہوا اور اس نے جدید ہندآریائی زبانوں کو نئی طاقت بخشی''۔[4] اس تمام بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندی کو قومی زبان تسلیم کرنا ہی چاہیے لیکن یہ ہندی آسان ہندی ہو۔ سنسکرت کے جو تدبھو رائج ہیں، انھیں پھر تت سم میں تبدیل کرنا لسانی اعتبار سے رجعت پسندی ہے۔ انھوں نے اردو کو پنجاب سے بہار تک کے خطے میں علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا اور اس بات کی سفارش کی کہ ایسے اقدام کرنا چاہئیں کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آجائیں مثلاً ''ثانوی درجوں تک دونوں زبانوں کی

1 ہندستانی لسانیات کا خاکہ، ص 62

2 ایضاً، ص 63

3 ایضاً، ص 63

4 ایضاً، ص 66

تعلیم لازمی کردی جائے۔ جب ہر شخص دونوں زبانیں جانے گا تو مستقبل میں ان کے ایک ہونے میں آسانی ہوگی''۔[1] یہ دراصل خوش فہمی تھی جس کی تردید بعد کے حالات نے کردی۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا ''ہندوستان میں اردو کے لیے فارسی رسم الخط جاری رہے۔ جب ہر شخص دیوناگری اور فارسی دونوں رسم خط جان لے گا تو مستقبل میں اس بات کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ وہ مستقبل کی زبان کے لیے کون سا رسم خط اختیار کرے''۔[2]

ان اقتباسات میں یہ بات غور طلب ہے کہ اس وقت احتشام صاحب کا خیال تھا کہ آگے چل کر اردو اور ہندی ایک ہوجائیں گی یا کم سے کم ان کا رسم خط ایک ہوجائے گا۔ یہ خیالات اگرچہ خلوص پر مبنی تھے لیکن بائیس تیئیس (22-23) برس کے تاریخی واقعات کی رو نے انھیں غلط ثابت کردیا اور احتشام صاحب کو اپنے نظریۂ زبان پر نظرثانی کرنی پڑی۔ رسم خط پر وہ ایک مضمون پہلے لکھ چکے تھے۔ 1970 میں انھوں نے دوسرا مضمون لکھا۔[3] ''اردو رسم خط : چند خیالات'' جو شب خون میں شائع ہوا۔ یہ مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ احتشام صاحب نے اس میں واضح الفاظ میں اپنے نظریۂ زبان میں تبدیلی کا ذکر کیا اور اس کی وجوہ بھی بیان کیں۔

اردو زبان اور رسم خط کے بارے میں بعض ترقی پسند ادیب جس طرح سوچتے رہے ہیں، ان کے خیالات کو اگر مجتمع کیا جائے تو کچھ اس طرح کے نتائج نکلتے ہیں کہ ان کی نظر میں شمالی ہندوستان کی اصل زبان ہندی ہے اور بولیوں کی شکل میں اس کی جڑیں عوام میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے برعکس اردو زبان عوامی نوعیت نہیں رکھتی۔ یہ جاگیرداری عہد کی پیداوار ہے اور صرف شہری تعلیم یافتہ طبقے سے متعلق ہے اس لیے وسیع تر عوامی ضرورتوں کے پیش نظر مناسب یہ ہے کہ اردو کو ہندوستان کی عوامی زبان یعنی ہندی کے عوامی دھارے سے ہم کنار ہوجانا چاہیے اور رسم خط کی

---

1 ہندستانی لسانیات کا خاکہ، ص 70

2 ایضاً، ص 71-70

3 شب خون، اکتوبر 1970، ص 17-11

تبدیلی بھی قبول کر لینی چاہیے۔ ترقی پسند ادیبوں کے مقابلے میں دوسری طرف ہندی حلقوں سے بعض ایسے ادیبوں کی آوازیں اٹھتی رہیں جن کا ایمان تھا کہ اردو اور ہندی کے درمیان صرف رسم خط کی دیوار حائل ہے۔ اگر یہ دیوار گرا دی جائے تو اردو بھی اسی طرح ہندی میں ضم ہوجائے گی جیسے راجستھانی، برج، اودھی، بھوجپوری اور دوسری بولیاں۔ ترقی پسند نظریۂ زبان کے مقابلے میں ان خیالات کی بنیاد صاف طور پر لسانی سامراجیت اور جبر پر ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کا نظریۂ زبان اس لحاظ سے لائق ستائش تھا کہ اس کی بنیاد وسیع النظری، کشادہ ذہنی اور لسانی اتحاد پسندی کے جذبے پر تھی لیکن اس کی وہ کوتاہی جس نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا، یہ تھی کہ اس میں عوامی بولیوں کی محبت میں اردو کی لسانی انفرادیت، تہذیبی نوعیت اور اردو کے مخصوص بین لسانی اور بین سماجی کردار کو نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے مخالفت ہوئی اور دوسری طرف سے لسانی جبر کی مثالیں بھی سامنے آئیں تو ترقی پسند ادیبوں کو اس نظریے پر نظرثانی کرنی پڑی اور یہ احساس ہونے لگا کہ یہ نظریہ اردو کے مخصوص ثقافتی کردار سے انصاف نہیں کرتا اور اردو کے مستقبل کا ضامن نہیں۔ اس تبدیلیِ فکر کا بھرپور اظہار احتشام صاحب کے مذکورۂ صدر مضمون میں ملتا ہے۔ اس وقت اردو رسم خط کو چھوڑنے اور دیوناگری کو اختیار کرنے کی تحریک زوروں پر تھی اور کئی رسالے اس میں حصہ لے رہے تھے۔ شب خون نے اس بحث سے متعلق تین مضمون ایک ہی شمارے میں شائع کیے۔ ان میں سید مسعود حسن رضوی اور محمد حسن عسکری کے مضامین پہلے شائع ہوچکے تھے۔ ان دونوں کے مباحث کی اہمیت کے پیش نظر ان کو دوبارہ شائع کیا گیا۔ احتشام صاحب کا مضمون ''اردو رسم خط : چند خیالات'' نیا تھا اور اس مسئلے کے بارے میں بطور خاص لکھا گیا تھا۔ اس سے پہلے بمبئی کے متعدد ادیب رسم خط کی تبدیلی کے حق میں لکھ چکے تھے۔ دہلی سے بھی اس کی تائید میں آوازیں اٹھی تھیں۔ پھر لکھنؤ سے اردو اور ہندی کے ادیبوں کا ایک مشترکہ بیان بھی شائع ہوا جس کی تہہ میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ ہندی کے ترقی پسند ادیب اتر پردیش میں اردو

کو اس کا حق دلوانے میں اردو والوں کے مطالبے کی تائید کریں گے۔[1] لیکن یہ توقعات پوری نہ ہوئیں۔ احتشام صاحب کا مضمون ''لکھنؤ معاہدہ'' کی ناکامی کے دو سال بعد کا ہے۔ احتشام صاحب نے صاف صاف لکھا:

> ''اب زبان اور رسم خط کے فطری تغیر و تبدل اور فطری ارتقا کا سوال نہیں رہا بلکہ جو کچھ سوچا اور کہا جارہا ہے اس میں ایک ایسی رجعت پسندانہ، فاشسٹ اور احیائی خواہش شامل ہے جو ان تمام صحت مند تہذیبی عناصر کا بھی خاتمہ کردینا چاہتی ہے جنھیں وہ اپنا نہیں سمجھتی۔ اس جذبے کی زد پر صرف رسم خط نہیں زبان، تہذیب، تاریخ، روایات، طرز زندگی، مذہب، عقیدہ، پسند اور ناپسند، علم اور یقین ہر چیز ہے۔ اس کے سامنے سر جھکانے کے معنی ہوں گے ترقی پسندی کے تصور سے دست برداری، عقل اور عقیدے سے دست برداری، تہذیبی روایات کے اس تسلسل سے دست برداری ...''۔[2]

اس اقتباس میں تہذیب، مذہب، عقیدے اور روایات کے تسلسل پر جو زور دیا گیا ہے وہ احتشام صاحب کی فکر و نظر کی کلید ہے۔ یہ ہے ان کی بنیادی معقولیت پسندی جس کی بدولت اکثر وہ ادعائیت سے بچ جاتے ہیں جس کا شکار ان کے بہت سے ہم مشرب ہوگئے۔ احتشام حسین کو احساس تھا کہ جان بیمز کا مقدمہ لکھتے ہوئے ان کا نظریۂ زبان دوسرا تھا۔ اس میں تبدیلی اور اس کی وجوہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 اس مشترکہ بیان کو ''لکھنؤ معاہدہ'' کا نام دیا گیا تھا۔ اس پر 29 ادیبوں کے دستخط تھے جن میں ہندی کی طرف سے سمترانندن پنت، بھگوتی چرن ورما، یش پال، امرت لال ناگر، اندیور، امرت رائے اور اردو کی طرف سے فراق گورکھپوری، آنند نراین ملا، سجاد ظہیر، احتشام حسین، کرشن چندر، مخدوم، سید اعجاز حسین، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی اور رام لعل نے دستخط کیے تھے۔ ملاحظہ ہو:
New Generation 3, 1968, Ed. Ram Lall, "Writers make impossible possible", by K.A. Abbas, "Lucknow Agreement", p. 13-15, 148

2 احتشام حسین: مضمون متذکرۂ صدر، ص 15

''بیس پچیس سال پہلے اس مسئلے پر عملی نقطۂ نظر سے غور کرنا اور اس کے نتائج پیش کرنا بحث کے دروازے نہیں کھولتا تھا۔ آج اس کے ساتھ ایسے عناصر وابستہ ہوگئے ہیں کہ انھیں الگ کرنا محال ہے۔ تقریباً بائیس سال پہلے ... (اشارہ ہے جان بیمز کے مقدمے کی طرف) رسم خط کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ زبان کے ساتھ بنیادی یا فطری طور پر وابستہ نہیں۔ اگر بالکل ابتدا ہی سے کوئی زبان کسی خاص رسم خط میں لکھی جانے لگے تو وہی اس کا رسم خط بن سکتا ہے۔ کوئی شخص اردو کو چھوڑ کر ہندی رسم خط میں لکھنا چاہے تو اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ان خیالات پر نہ کسی نے تنقید کی اور نہ مجھے بدنیتی کا مجرم ٹھہرایا۔ لیکن آج حالات دوسرے ہیں۔ خود میرے خیالوں میں بھی معمولی تغیرات ہوئے ہیں''۔ (1)

اس مضمون میں رسم خط کے مسئلے کے جتنے بھی حل ہوسکتے ہیں احتشام صاحب نے ان سب سے فرداً فرداً بحث کی، یعنی اول یہ کہ اردو کے لیے رومن رسم خط اختیار کرلیا جائے، دوسرے یہ کہ رومن میں ساری آوازیں نہیں آسکتیں، اس لیے بین الاقوامی صوتی خط بہتر ہے، تیسرے یہ کہ دیوناگری اردو کی بہ نسبت صوتی اور سائنسی رسم خط ہے، اس کی خوبیوں اور کوتاہیوں پر غور کیا جائے، چوتھے یہ کہ اردو رسم خط ہر لحاظ سے مکمل اور بے عیب ہے اور اسے جوں کا توں رکھا جائے، اور پانچویں یہ کہ موجودہ اردو رسم خط میں کچھ نقائص ہیں، ان پر غور وخوض ہو اور معمولی اصلاحیں کرلینے کے بعد اسے جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ ان نکات سے بحث کرتے ہوئے احتشام صاحب لکھتے ہیں :

''اگر ہم منصفانہ ان پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر پہلو میں تھوڑی بہت صداقت اور وزن ہے''۔ (2)

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ بلٹز اور دھرم یگ میں شائع ہونے والے مضامین کے جواب میں دہلی کے ہفت روزہ اخبار 'دوست' کی فرمائش

---

1 احتشام صاحب : مضمون متذکرۂ صدر، ص 15

2 ایضاً، ص 14

پر میں نے اردو رسم خط پر ایک مضمون 1962 میں لکھا تھا[1] جس میں اردو رسم خط کا صوتیاتی تجزیہ کرکے واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ جس رسم خط میں ایک تہائی ایسی آوازوں کی علامتوں کا اضافہ ہو چکا ہو جو نہ عربی ہیں نہ فارسی ہیں، یعنی ہکار اور معکوسی آوازوں کی علامتوں کا اور جس میں معتد بہ عربی فارسی حروف کی وہ اصوات نہ رہی ہوں جو ان زبانوں میں ہیں، تو ایسے رسم خط کو غیر ملکی کہنا علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔ میرا معروضہ یہ تھا کہ اگرچہ ہم نے اپنا رسم خط عربی فارسی سے لیا ہے لیکن ہم اس کو اس حد تک اردوا چکے ہیں کہ یہ ہمارا رسم خط بن چکا ہے۔ نیز یہ کہ اردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے اور اس کے رسم خط کو آزاد اور مستقل ماننا چاہیے۔ اس مضمون کو کئی رسالوں اور اخباروں نے نقل کیا تھا۔ یہ احتشام صاحب کی نظر سے بھی گزرا اور انھوں نے راقم الحروف کے بنیادی معروضات سے اتفاق کا اظہار فرمایا۔ بعد میں جب یہ بحث اور آگے بڑھی تو احتشام صاحب نے اس مضمون کی نقل اترپردیش کی قانون ساز کونسل کے رکن ڈاکٹر فریدی کو فراہم کی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو بھی دی جنھوں نے اسے 1965 میں اپنے نوٹ کے ساتھ صدق جدید میں دو قسطوں میں شائع کیا۔ اس مضمون کے چند جملے یہاں مقتبس ہیں تاکہ بحث کا پورا پس منظر سامنے رہے:

> ''جس رسم خط میں ایک تہائی علامتوں کا اضافہ تاریخی اور تہذیبی ضرورتوں کی بنا پر ہوا ہو، وہ رسم خط ہمارا اپنا ہے یا اب بھی ہم اسے غیر ملکی کہتے رہیں گے۔ قومی یک جہتی کے تصور کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ہندوستان میں مختلف اور متضاد عناصر ہیں، ان میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ یعنی ضرورت ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہے، عناصر کو مٹانے کی نہیں۔ رسم خط کو تبدیل کرنے کا مشورہ گویا عناصر کو مٹانے کی تجویز ہے''۔[2]

چند برس بعد احتشام صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، اور اپنے خیالات میں ''تغیرات'' کا ذکر کیا تو وہ ذیل کے نتائج پر پہنچے:

1 ''اردو رسم خط : ایک بحث'' دوست، دہلی، جون 1962

2 صدقِ جدید، جون 1965

''اردو ایک آزاد، مستقل، ترقی پذیر اور لسانی حیثیت سے ہر دوسری زبان کی طرح مکمل زبان ہے۔ اس میں جو تبدیلیاں ہوں گی وہ ناگزیر ضرورتوں کے ماتحت ہوں گی۔ جنھیں اس زبان کے ذریعے اظہار خیال میں آسانی ہے وہ اسے چھوڑنے یا جبر کے ماتحت بدلنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوسکتے۔ اردو کوئی مذہبی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی مشترکہ سیکولر تہذیب کی نمائندگی زیادہ واضح شکل میں کرتی ہے۔ یہ ہندی کے مقابلے میں ایک الگ، آزاد اور مستقل زبان ہے جس کے پیچھے بہت سے لسانی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی اسباب اور افکار ہیں جنھیں ایک بہت بڑی لسانی اقلیت کو کچلے اور درہم برہم کیے بغیر بدلا نہیں جاسکتا۔ یہی صورت اس کے رسم خط کی بھی ہوگئی ہے جو تقریباً آٹھ سو سال سے اس کے تحریری اظہار کا ذریعہ بنا ہوا ہے اور نفسیاتی طور پر اس زبان سے وابستہ ہوگیا ہے۔ اس کی کشش، دائروں، نقطوں، صوری علامتوں سے ذہن میں جو تصویریں بنتی ہیں ان کے پیچھے صدیوں کا ساحرانہ اور نفسیاتی عمل ہے۔ اس لیے اب وہ (رسم خط) زبان ہی کی طرح زندگی کا جز ہے''۔(2)

اس رائے کو قائم کرتے ہوئے احتشام صاحب نے نہ صرف لسانی اور تاریخی عوامل پر نظر رکھی بلکہ تہذیبی اور نفسیاتی اثرات کو بھی پوری اہمیت دی اور رسم خط کے جمالیاتی تقاضوں کو بھی۔ اب اس وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ رسم خط کے مسئلے کے پانچ حل میں سے احتشام صاحب نے آخری یعنی پانچویں حل پر صاد کیا کہ اردو رسم خط کو باقی رکھنا چاہیے، البتہ اس میں کچھ کوتاہیاں ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے اصلاحات اور ترمیمات ضروری ہیں۔ اردو املا کی اسی معیار بندی کے لیے 1972 میں ترقی اردو بورڈ نے ڈاکٹر سید عابد حسین کی صدارت میں املا کمیٹی مقرر کی تھی جس کی سفارشات شائع ہوچکی ہیں۔(2)

رسم خط کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے احتشام صاحب نے اس پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی کہ کسی زبان کے پاس رسم خط نہ ہونا ایک بات ہے اور برا بھلا کوئی رسم خط ہو اس کا بدلنا دوسری بات ہے۔ اس کی وضاحت بھی انھوں نے روس کے

1 احتشام حسین، مضمون متذکرہ صدر، ص 16-15

2 املا نامہ، مرتبہ گوپی چند نارنگ، نئی دہلی 1974

مختلف علاقوں کی ایسی زبانوں کی مثال کے ذریعے کی جن کا پہلے کوئی رسم خط نہ تھا، کیونکہ وہ پہلے کبھی لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ ماہرین نے روسی رسم خط میں ترمیمیں اور اضافے کرکے ان زبانوں کی صوتیات کے مطابق رسم خط بنا دیے اور وہی رائج ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ جب کسی زبان کے لیے کوئی رسم خط برابر استعمال ہوتا رہا ہو، اس وقت اس کا رسم خط بدلنے میں اکثر و بیش تر دشواریاں پیش آتی ہیں۔

احتشام صاحب کی یہ خوبی قابل ذکر ہے کہ متنازع موضوع کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ نہایت ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کرتے تھے۔ ان کے ہاں شدت اور جذباتیت نہیں، معقولیت کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ اردو کے جو ادیب اس زمانے میں دیوناگری کی حمایت میں اظہار خیال کرتے رہے تھے، ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ان کی نیت پر شک کرنا مناسب نہیں۔ اس کے پیچھے کوئی سازش دیکھنا بھی تنگ نظری ہے ... بحث مباحثے سے ذہن صاف ہوں گے اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی غور وفکر کا سرمایہ بہم پہنچے گا''۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ اگر اردو اور اس کے رسم خط کی مستقل اور آزادانہ حیثیت کو تسلیم کرلیا جائے تو ہمیں اپنے ادب کی زیادہ اشاعت کے لیے ناگری کے تجارتی استعمال پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے بھی تجارتی ضرورتوں پر کسی کا بس نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ ہم نہیں، ہمارے ادب کو دوسری زبان کے پڑھنے والے کرتے ہیں۔ ہم لاکھ چاہیں کسی کو روک نہیں سکتے۔ ہم روزمرہ زندگی کے مختلف سماجی مواقع (Social situations) پر مختلف طرح کے اسلوب اور بولیاں بولتے ہیں، اسی طرح دوسرے اپنی سہولت کے لیے کیا کرتے ہیں، یہ ان کا مسئلہ ہے۔ البتہ خود ہمیں اپنے رسم خط پر اصرار کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج کا زیادہ تر ڈھانچہ ذولسانی (Bilingual) اور کثیر لسانی (Multilingual) ہے۔ اردو اور ہندی کا گہرا باہمی رشتہ اور ہماری ذولسانیت ہم سے ایک طرح کی لسانی بقائے باہم (Linguistic coexistance) کا تقاضا کرتی ہے۔ اردو اور پنجابی کے کئی شاعر اور ناول نویس اور افسانہ نگار ایک سے زیادہ

1 احتشام حسین مضمون متذکرۂ صدر، ص 17

رسم خط کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس سے ان کے قارئین کی تعداد بڑھتی ہے اور مالی یافت بھی ہوتی ہے۔ احتشام صاحب نے بھی اپنے متذکرہ مضمون میں اس امید کا اظہار کیا تھا۔ ''اگر اردو ادب کا کچھ حصہ دیوناگری رسم خط میں چھپتا ہے اور اس سے اردو کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا ہے یا اردو کا پیام اس کے حلقے سے باہر پہنچتا ہے یا اردو لکھنے والوں کو مادی منفعت حاصل ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کرنا غلط ہوگا''۔[1] ہماری مشکل کا حل دو زبانوں کو ایک کرنے یا دو رسم خط کو ایک کرنے میں نہیں ہے؛ ایسا کوئی بھی حل غیر جمہوری، غیر فطری، جبری اور مصنوعی ہوگا۔ احتشام صاحب کی بھی یہی رائے تھی کہ ہمارا حل لسانی بقائے باہم میں ہے۔ اردو زبان کو اپنی ادبی روایت، صوتیات و لفظیات کے تمول، اپنی وسعت اور لوچ، اپنے لہجے کی چستی اور کھنک اور اپنے صوری پیکروں کی جمالیات پر بجاطور پر ناز ہے۔ اگر ہماری تاریخی اہمیت اور لسانی سالمیت کو تسلیم کرلیا جائے اور ہمارے اپنے خطے میں ہماری زبان کی زندگی کا سامان کردیا جائے تو ہمارے ادیب اور شاعر اپنی زبان اور رسم خط سے کمٹ منٹ کے باوصف دوسروں کے دیوناگری استعمال کرنے پر معترض نہ ہوں گے۔ محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اردو کا پیغام محبت، مفاہمت اور وسعتِ نظر کا پیغام ہے۔ اردو ناگری کو بہت کچھ دے سکتی ہے اور دے رہی ہے اور ناگری سے بھی ہمیں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ناگری والے بھی اردو کے لیے اپنے دل کے دروازے کھول دیں۔ تفریحی ادب، فلموں اور برقیاتی میڈیا میں تو یہ دروازے عوامی ضرورتوں اور سماجی اور مالی تقاضوں کی وجہ سے کھل ہی جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انتظامی اور سرکاری سطح پر بھی اردو کی اہمیت کا احساس عام ہو۔ ایک آزاد جمہوریت میں ہم سب کے خوابوں کی تعبیر اس طرح نکل سکتی ہے۔

(شب خون، اگست 1977)

---

1 احتشام حسین، مضمون متذکرۂ صدر، ص 17

فرمان فتح پوری اور اردو

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس عہد کے ان معدودے چند صاحبانِ علم میں سے ہیں جن کی اردو شناسی کے بارے میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ اردو میں ادیبوں اور مصنفین کی کمی نہیں لیکن اہل علم کا درجہ کتنوں کو حاصل ہے، اس کا جواب مشکل نہیں۔ آزادی کے بعد اردو کے زمین و آسمان اس تیزی سے بدلے ہیں کہ بہت سی پچھلی خوبیاں قصۂ پارینہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ بازار کی رونق تو بڑھ گئی ہے لیکن مال کی وقعت اتنی ہی گرگئی ہے۔ اب وہ لوگ کہاں ہیں جو علم کی کسی ایک ادا پر پوری کی پوری زندگیاں کھپا دیتے تھے، اب تو جسے دیکھیے جینے کی ہوس کا شکار ہے:

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

اب لگن اور دلسوزی کے مال کو کون دیکھتا ہے، لوگ لیبل پر جاتے ہیں۔ ملمع سازی کی اس ہا و ہو میں گہری لگن اور یکسوئی سے اپنی مستی کو نبھائے جانا اور اپنے علمی کام کو کیے جانا بہت بڑی سعادت ہے جو صرف چند لوگوں ہی کے حصے میں آئی ہے۔

فتح پور کا خیال آتے ہی نیاز صاحب اور نگار کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ نیاز صاحب نام کے نیاز تھے، اصلاً وہ سراپا ناز تھے۔ فرمان صاحب نام کے فرمان ہیں، اصلاً سراپا نیاز ہیں۔ نیاز و فرمان یا فرمان و نیاز کا رشتہ خاصا مثالی ہے۔ نیاز صاحب سے نیازمندی کا جو حق فرمان صاحب نے ادا کیا ہے، کیا کسی کو ایسی توفیق ہوگی۔ رسالہ 'نگار' بیادگار نیاز مدتوں پوری آن بان سے نکلتا رہا۔ بعد میں نیاز لیکچرز کا سلسلہ بھی قائم کیا گیا اور ہر سال پورے اہتمام و انصرام سے نیاز مرحوم کی یاد ان کے شایانِ شان منائی جاتی تھی جس میں ہندو پاک دونوں ملکوں کی سرکردہ شخصیات

شریک ہوتی تھیں اور علمی جشن کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ جلسے جلوس کوئی بڑی بات نہیں، لیکن کسی علمی روایت کی طرح ڈالنا اور کسی کی یادگار مناتا اور مناتے رہنا فقط سعادت ہی نہیں کارنامہ بھی ہے۔

بادۂ پارینہ کے خصائص میں ہے کہ جتنی عمر رسیدہ ہو، اتنی ہی لذت فزا ہوتی ہے۔ فرمان صاحب، کے علمی کارناموں میں بالیدگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ آئی ہے۔ انھوں نے اپنے علمی سفر کی کوئی منزل عشق کی ایک جست میں طے نہیں کی بلکہ جو کام بھی کیا پوری توجہ اور محنت سے کیا، جو کچھ بھی لکھا رسان اور اطمینان سے لکھا۔ یوں تو ان کی تصانیف اور تالیفات کی تعداد چالیس (40) سے کیا کم ہوگی لیکن ہر کارنامہ اہمیت رکھتا ہے۔'اردو ہندی تنازع' میں بہت سے بیانات تاریخی طور پر غلط ہیں اور گیان چند جین اور دوسروں نے بجاطور پر اعتراض کیا ہے۔ تاہم لغتِ کبیر کا کام ایسا کام ہے کہ کون ہے جو داد نہ دے گا۔ اس بڑے لغت کا کام حضرت جوش ملیح آبادی کے زمانے میں شروع ہوا تھا اور جس میں جناب ابواللیث صدیقی اور جناب شان الحق حقی جیسے اہل علم اور محققین شریک رہے، اس کو جس علمی وقار سے فرمان صاحب نے جاری رکھا اور اس کی جلد سات سے جلد 16 تک کے کام کو جس ذمہ داری اور کارآگہی سے مرتب اور شائع کیا، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ وہ اس عظیم منصوبے کو بائیس جلدوں میں مکمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ویسے فرمان صاحب کے علمی کاموں کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس سب کا جائزہ لینے کو دفتر بھی ناکافی ہے۔ انھوں نے تحقیقی اور علمی کتابیں بھی لکھی ہیں، تنقید بھی لکھی ہے اور تدوین و تالیف کا حق بھی ادا کیا ہے۔ ان کے کام کو کئی شقوں میں رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے، مثلاً اصناف سے متعلق کتب: ''اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا''، ''شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، ''اردو کی منظوم داستانیں''، ''اردو شاعری کا فنی ارتقا''، ''اردو نثر کا فنی ارتقا''، ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار''، ''اردو کی ظریفانہ شاعری''، ''اردو کی نعتیہ شاعری''، ''فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت''، ''اردو کی بہترین مثنویاں'' وغیرہ؛ دوسرے شخصیات پر مونوگراف مثلاً ''غالب، شاعر

امروز و فردا''، ''اقبال سب کے لیے'' یا ''میر انیس حیات اور شاعری'' یا ''قمر زمانی بیگم'' جس میں خط کتابت بھی ہے نیز ''نیاز فتح پوری شخصیت اور فن''، ''مولانا جوہر حیات اور کارنامے''، ''مولانا حسرت موہانی شخصیت اور فن''، ''سرسید احمد خاں'' وغیرہ۔ تیسرے تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے جیسے ''تحقیق و تنقید''، ''نیا اور پرانا ادب''، ''تاویل و تعبیر''، ''ادبیات و شخصیات'' اور اسُ نوع کی کتابیں؛ اور چوتھے زبان اور مسائل زبان سے متعلق کتابیں مثلاً ''زبان اور اردو زبان''، ''اردو املا اور رسم الخط : اصول و مسائل''، ''ہندی اردو تنازع''، ''قومی یکجہتی، اردو اور پاکستان''، ''تدریس اردو''، ''اردو املا و قواعد : مسائل و مباحث'' جو مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔

سردست مجھ کو ان کی علمی یافت کے دوسرے منطقوں کے بارے میں کچھ نہیں کہنا، میں گفتگو کو فقط آخری شق تک محدود رکھوں گا ورنہ یہ تحریر اپنی حدود سے تجاوز کرجائے گی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے دیگر کمالات اپنی جگہ پر، میرے نزدیک سب سے اہم یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے مسائل پر ان کی نظر گہری ہے۔ دیکھا جائے تو مسائلِ زبان میں املا کہنے کو ایک محدود موضوع ہے، لیکن دقت نظری اور اصابت رائے ہی کا اندازہ کرنا ہو تو عشق نبرد پیشہ کے صَلا پر لبیک کہنے کے لیے اتنی سی زمین بھی بہت ہے۔ بنیادی اہمیت تصورِ زبان کے تئیں ذہنی رویے اور ترجیحات کی ہے، یعنی لسانی معاملات میں جو معروضی فاصلہ اور سائنسی نظر ضروری ہے اس کی شہادتیں کتنی اور کیسی ہیں۔ اگر بنیادی تصور ہی ذہن میں صاف نہیں تو ترجیحات مشکوک ہوسکتی ہیں اور دیوار سیدھی اٹھ ہی نہیں سکتی۔ بعض حضرات کے نزدیک 'اردو گھر کی لونڈی ہے' لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اردو سادہ زبان نہیں ہے بلکہ کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہہ سکتا ہے۔ جس نے تین تین چار چار عالمی خاندانوں سے رس جس پایا ہو، جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو، جس نے قوسِ قزح کی طرح رنگوں کو کشید کیا ہو، جس کا حسن تہ در تہ اور پہلو در پہلو ہو، وہ زبان کچھ بھی ہوسکتی ہے، سادہ نہیں۔ اردو کی امتزاجی کیفیت ایسی جہت

اندر جھت ہے کہ اس کے سامنے کے انچھروں کا احاطہ کرتے ہوئے بھی اچھے اچھوں کا ٹانکا کھل جاتا ہے۔ اردو کی اداشناسی کے تقاضے سخت ہیں اور اس میں ایک دو نہیں متعدد مقامات سخت آتے ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ 'با درد کسے رسد کہ دردے دارد'۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس وادی کو کیسے طے کیا ہے اور راہ کی دشواریوں کو کیسے سہل کیا ہے، اسی سے کچھ اندازہ اُس علمیت اور رمز آشنائی کا ہوگا جس کی طرف اشارہ کیا گیا۔ زیرِ نظر تحریر ایک مختصر کوشش ہے اور بنیادی مقدمے کی توثیق کے لیے بھی فقط خاص مثالوں سے دلیل لانے پر اکتفا کی جائے گی۔

اردو زبان کے مسائل پر پہلا مضمون فرمان صاحب نے نگار لکھنؤ میں جون 1951 میں لکھا۔ ''اردو زبان اور رسم الخط'' غالباً یہ مضمون ان کے مجموعے ''زبان اور اردو زبان'' مطبوعہ کراچی میں شامل ہے۔ 1973 میں سندھ ٹکسٹ بک بورڈ کی فرمائش پر اردو املا پر ایک مضمون لکھ کر بورڈ کے اراکین کو دیا جس کی ایک نقل جناب شان الحق حقی کے پاس تھی جسے انھوں نے اردو نامہ شمارہ پچاس بابت مارچ 1975 میں شائع کردیا۔ رسم الخط اور اردو املا کے دونوں مقالوں کو ملاکر نگار پاکستان کا مسائلِ زبان نمبر 1977 میں شائع ہوا اور یہی دو مقالے سنگ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے مارچ 1977 میں ''اردو زبان اور رسم الخط : اصول و مسائل'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیے۔ مقتدرہ قومی زبان سے جون 1990 میں ''اردو املا و قواعد : مسائل و مباحث'' کے نام سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مرتبہ جو کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں مسائل زبان اور قواعد کے بارے میں جو مضامین رسالہ اردو نامہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے تھے، ان کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اردو املا والا مضمون اپنی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مقتدرہ قومی زبان کی اردو املا اور رموز اوقاف کمیٹی کے بھی صدر تھے، اور املا کے بارے میں جو سفارشات مرتب کی گئیں ان میں بھی فرمان صاحب کا مشورہ اور فیصلہ شامل تھا۔

پاکستان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس احساس کو عام کیا کہ اردو املا انتشار اور نراج کا شکار ہے۔ جس طرح جس کا جی چاہتا ہے لکھتا ہے اور اس بارے میں

بے راہ روی اور من مانی عام ہے۔ مثال کے طور پر کنواں کو کواں، کوا اور کنوا چار طرح سے لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح گاؤں کو بھی گانو، گانوں یا گاوں لکھا جاتا ہے۔ انھیں، اُنہیں، انھوں انہوں، تمھیں تمہیں، ہائے دوچشمی سے بھی لکھے جاتے ہیں اور کہنی دار 'ہ' سے بھی، صحیح کیا ہے، کسی کو پروا نہیں۔ کیجیے، لیجیے، دیجیے کبھی یائے سے کبھی ہمزہ سے جیسا جس کا جی چاہے لکھ دے، کسی قاعدہ کی پیروی ضروری نہیں سمجھی جاتی، اسی طرح مسالا، مسالہ، مصالحہ، مصالہ چار طرح سے، علیٰحدہ، علاحدہ، علحدہ تین طرح سے، سیکڑا، سینکڑا، سیکڑہ، سینکڑہ چار طرح سے عام چلن میں ہیں۔ لفظوں کو بھی ملا کر یا الگ الگ لکھنے کے اصول نہیں ہیں، اور افراتفری عام ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس کی پیروی کریں۔ بعض الفاظ عربی سے آئے ہیں، بعض فارسی سے اور بعض ہندی یا پراکرتوں سے آئے ہیں۔ اصل میں شکل کچھ تھی، اردو میں آکر کچھ ہوگئی، جیسا کہ مصالحہ سے ظاہر ہے۔ نہ صرف املا بدل گیا، کہیں کہیں تو معنی میں بھی تصرف ہوگیا۔ اردو کا دامن عربی فارسی سے بھی بندھا ہوا ہے اور ہندی پراکرت سے بھی۔ اگر چلن کی پیروی کریں تو اصل کی نفی ہوتی ہے جیسے اصل میں زکوٰۃ ہے اردو میں زکات ہوگیا ہے، اسی طرح صلات، تورات، مسمّات وغیرہ۔ اور اگر اصل کی پیروی کریں تو چلن سے انحراف ہوتا ہے۔ فیصلہ کس بنا پر کریں۔ مسئلہ فقط اصل زبان کا نہیں، ثقافتی، معاشرتی، اثرات اور تاریخ کا بھی ہے جسے نظرانداز کریں تو دوسری پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی لفظ مجرد لفظ نہیں، پوری تاریخ ہوتا ہے۔ اس کا دامن مذہب، معاشرت اور تاریخی اثرات سب سے بندھا ہوتا ہے۔ کوئی فردِ واحد خواہ وہ کتنا بڑا عالم یا کوئی ادارہ خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، ایسا حکم نہیں لگا سکتا جو زبان کی داخلی حرکیت کے خلاف جاتا ہو۔ اگر کوئی ایسا حکم لگا بھی دیا جائے تو اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا، اور دیر سویر وہ حکم کالعدم ہوجاتا ہے۔ اکثر ایسے احکام کاغذ کی زینت بنے رہتے ہیں یا اپنے وضع کرنے والے کے جوشِ اصلاح کا نشان بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس مسئلے سے جڑا ہوا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اردو کی اپنی کوئی لسانی بنیاد یا

کسوٹی ہے جس کو معیار مانا جائے۔ ملکی یا قومی یا ثقافتی ترجیحات نہایت اہم ہوتی ہیں اور کوئی ذی شعور انھیں نظرانداز نہیں کرسکتا۔ پاکستان کی اپنی خاص ترجیحات ہیں جن کی وجہ سے عربی فارسی بولنے والے ممالک سے خاص رشتوں کا ہونا فطری ہے، اور یہی وہ زبانیں ہیں جن کے جذب شدہ اثرات اردو کا امتیازی نشان ہیں۔ پاکستان میں اردو کا ان زبانوں کی طرف مائل ہونا سمجھ میں آسکتا ہے، لیکن اردو اگر تمام و کمال عربی فارسی کی طرف مائل ہوتی ہے تو اردو اردو نہیں رہتی۔ یعنی اردو وصل کی خواہاں تو ہے لیکن ایسے وصلِ کُلی کی نہیں جس سے اس کا اپنا الگ وجود ہی باقی نہ رہے۔ گویا اردو میں کہیں نہ کہیں کوئی داخلی توازن ضرور کارگر ہے جس سے تھوڑا بہت انحراف ہوسکتا ہے کلی انحراف نہیں ہوسکتا۔ جن زبانوں میں لین دین کا سلسلہ ہوتا ہے یہ ان کا نازک پہلو ہے کہ زبانیں بھی اپنی داخلی حرکیت کے ہاتھوں وحدت الشہود کی قائل ہوتی ہیں وحدت الوجود کی نہیں۔ یہ اثرات قبول کرتی ہیں انضمام نہیں چاہتیں، بلکہ محبت کرنے والوں کی طرح جو لاکھ فنافی الذات ہوجائیں رہتے دو الگ الگ وجود ہیں، زبانیں بھی فقط اسی حد تک اخذ کرتی ہیں جس حد تک خود ان کی انفرادیت اور تشخص مجروح نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اردو باوصف اس کے کہ عربی فارسی کی مقروض ہے، عربی فارسی کا ظلِ ثانی نہیں ہے۔ بلکہ اسی طرح باوصف اس کے کہ اردو ہندی اور پراکرتوں کی مقروض ہے، اردو ہندی اور پراکرتوں کا ظلِ ثانی بھی نہیں ہے گویا اردو کا اپنا لسانی مزاج، اپنی پہچان، اپنا تشخص اور اپنی آزادانہ حیثیت ہے۔

اردو کی یہ آزادانہ حیثیت یا اردوئیت کیا ہے؟ لسانی مسائل پر کام کرنے والوں کے لیے یہ ہمیشہ ایک نازک مسئلہ رہا ہے اور اچھے اچھوں نے اس راہ میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ گویا یہ راہ بھی پل صراط ہے، بال سے باریک اور تلوار سے تیزتر۔ اس راہ میں مارے جانے والوں کی داستانیں خاصی عبرتناک ہیں اور یہاں اس کی گنجائش بھی نہیں۔ بعضوں کو تو اتنی توفیق بھی نہیں کہ اپنی انتہا پسندیوں کو اعتدال پر لے آئیں۔ غرض اردو کے اپنے تشخص اور آزادانہ لسانی حیثیت کے شعور کے لیے بڑی کارآگہی اور سلامت روی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی علمی نظر کی اصابت کا

کھلا ثبوت ہے کہ اس راہ میں ان کے قدم کہیں نہیں ڈگمگائے اور اردو کی گنگا جمنی میانہ روی کو پہچاننے میں وہ کبھی کسی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے۔ یہی ان کی لسانی علمیت کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔

اس سلسلے کی بحثیں اٹھاتے ہوئے انھوں نے بھی میری طرح نہ صرف انشاء اللہ خاں انشا کی مشہور رائے کو سند مانا ہے بلکہ اسے بطور رہنما اصول کے برتا بھی ہے:

> ''جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہو گیا، خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح۔ اس کی صحت اور غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے۔ کیونکہ جو چیز اردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو اور جو اردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے خواہ اصل میں صحیح نہ بھی ہو''۔

(دریائے لطافت، ص 253، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، 1935)

میں نے ایک جگہ انشا کے اس بیان کو اردو زبان کی خودمختاری اور آزادانہ حیثیت کا 'میگنا کارٹا' کہا ہے۔ اس بیان کو دُہرا دینا جتنا آسان ہے، اس کے مضمرات پر نظر رکھنا، اس کو پوری طرح سمجھنا اور زبان کی اصولی بحثیں کرتے ہوئے اور املا کی سفارشات طے کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا اتنا ہی دقت طلب ہے کیونکہ کہیں یہ بیان عقائد سے ٹکراتا ہے کہیں اصل ماخذ سے اور کہیں ثقافتی ترجیح سے اور کہیں تاریخ سے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے فیصلوں کی اہمیت اس میں ہے کہ انھوں نے حتی الامکان اردو کی اردوئیت اور بحیثیت زبان اردو کی خود مختاری اور آزادی پر نہ صرف زور دیا ہے بلکہ اپنے فیصلوں کو پاکستان کے علمی اداروں میں تسلیم بھی کرایا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ اصول دو دھاری تلوار بھی ہے جو اِدھر سے بھی اردو کا دفاع کرتا ہے اور اُدھر سے بھی۔ میں دو تین مثالیں عربی فارسی اثرات سے لوں گا اور دو تین مثالیں ہندی پراکرت اثرات سے، ان سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی لسانی سلامت روی کا شافی ثبوت فراہم ہو جائے گا، زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

عربی فارسی اثرات سے فقط ہمزہ، الف مقصورہ اور ہم آواز حروف کے مسائل

کو لیا جائے گا۔ ہمزہ کا مسئلہ اردو املا کا خاص مسئلہ ہے۔ عربی میں ہمزہ باقاعدہ حرف ہے، الف کی الگ کوئی حیثیت نہیں، یہ ہمزہ کا قائم مقام ہے جبکہ اردو میں الف باقاعدہ مصوتہ ہے اور ہمزہ محض ایک حرف ہے اور حرف بھی بغیر کسی صوت کے۔ اور تو اور عربی میں لفظ املا ہمزہ کے بغیر نہیں لکھ سکتے لیکن اردو میں لفظ املا کو ہمزہ کے ساتھ کوئی نہیں لکھتا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ہمزہ کی تمام تر صورت حال سے بحث کرنے کے بعد فیصلہ دیا ہے اور صحیح فیصلہ دیا ہے:

> ''ہمزہ عربی زبان کے لیے مخصوص ہے اور حرف مستقل کی صورت میں عام طور پر لفظ کے شروع، درمیان اور آخر تینوں جگہ آتا ہے جیسے اُمر، سائل، سوٗ، ابتداء وغیرہ میں، لیکن اردو میں ہمزہ حرف اصلی کے طور پر کسی لفظ میں نہیں آتا۔ چنانچہ اردو کا کوئی لفظ نہ ہمزہ سے شروع ہوگا اور نہ ہی اس پر ختم ہوگا''۔
> (ص 22)

بظاہر یہ بہت سادہ سا فیصلہ ہے لیکن عام تحریر میں ہزاروں لفظ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ بعض حلقوں سے اس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن حقیقت یہی ہے کہ اردو میں ہمزہ چونکہ الف کا قائم مقام ہے یا لفظ کے بیچ میں دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی نشان ہے، یہ لفظ کے بیچ میں تو آسکتا ہے، یعنی سائل، قائل، مائل، غائب، نائب، صائب وغیرہ لیکن بہت سے لفظ اردو میں بغیر ہمزہ کے صحیح ہیں۔ ایسے لفظوں کی فرمان صاحب نے کئی شقیں قائم کیں ہیں اور ان کی جامع درجہ بندی کی ہے، مثلاً انشا، اخفا، القا، ابتدا، اشتہا، ارتقا، التوا، اقتدا، ابتلا، استعفا، استغنا، استدعا یا عربی جمعیں جیسے شعرا، امرا، فقرا، وزرا، حکما، روٗسا، غربا، اشقیا، اغنیا، اولیا، انبیا وغیرہ۔ فرمان صاحب اس سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور نہایت صحیح اطلاق کرتے ہوئے فیصلہ کرتے ہیں کہ عربی کے بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے حروفِ اصلی میں ہمزہ نہیں ہے، لیکن چونکہ دو مصوتے یکجا ہوئے ہیں اردو میں انھیں یائے سے نہیں ہمزہ سے لکھنا چاہیے مثلاً مضائقہ، معائنہ، شائع، ضائع، مائع وغیرہ۔ اسی طرح فارسی الفاظ فرمائش، نمائش، پیمائش، آرائش، زیبائش اگرچہ اصل

میں یائے سے ہیں لیکن اردو میں ان کو یائے سے نہیں ہمزہ سے لکھنا مناسب ہے۔ یہ بحث فرمان صاحب نے پوری تفصیل سے کی ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو ہمزہ کا اصول اردو کے لسانی نظام کی داخلی آزادی کا عجیب وغریب ثبوت ہے یعنی ایک طرف تو سینکڑوں ہزاروں عربی فارسی الفاظ اردو میں بغیر ہمزہ سے لکھے جاسکتے ہیں، دوسری طرف سیکڑوں ہزاروں ہندی پراکرت الفاظ جن کی اصل میں ہمزہ کا سوال ہی نہیں، وہ سب بغیر ہمزہ کے لکھے ہی نہیں جاسکتے، جیسے نائی، رائی، بھائی، مہنگائی، اکائی (آنہ پیسہ) پائی، یا ہندی افعال کی سیکڑوں ہزاروں صورتیں، مثلاً آئے، جائے، کھائے، لائے، گائے، یا ہندی جمعیں جیسے آئیں، جائیں، کھائیں، لائیں، گائیں، یا آؤں، جاؤں، کھاؤں، لاؤں، گاؤں، یا آؤ، جاؤ، کھاؤ، لاؤ، گاؤ یا آیئے، جایئے، کھایئے، لایئے، گایئے، یا آئی، لائی وغیرہ یا پھر ہندی اسمائے معرفہ مثلاً رامائن، کیکئی، لکھنؤ وغیرہ بھی اردو میں ہمزہ کے بغیر نہیں لکھے جاسکتے۔

ہمزہ ہی کی طرح کا ایک مسئلہ (لیکن جو اتنا وسیع نہیں ہے) الف مقصورہ کا ہے۔ یہ بھی عربی تصور ہے اور اردو کے حروف تہجی میں اس کا وجود نہیں لیکن اردو میں بعض الفاظ میں (اور اہم الفاظ میں) الف مقصورہ استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس بارے میں اسی اردو اصول کو اپنایا ہے جس پر اجماع رائے ہے۔ ان کا بیان ہے: ''عربی کے بعض الفاظ میں ی کے اوپر الف لکھا جاتا ہے جیسے مولیٰ، مولٰینا، علٰیحدہ، دعویٰ، تقویٰ، مصطفیٰ، معریٰ، مدعیٰ، معلیٰ، ادنیٰ، اعلیٰ وغیرہ۔ اردو میں ی کی ضرورت نہیں صرف الف سے لکھنا چاہیے جیسے مولا، مولانا، علاحدہ، دعوا، تقوا، مصطفا، معرا، مدعا، ادنا، اعلا وغیرہ''۔ اس میں انھوں نے فقط ایک استثنا کیا ہے اور صحیح کیا ہے کہ ''اسم علم میں اصل املا قائم رہے گا جیسے عیسیٰ، موسیٰ، سلمیٰ کو اسی طرح لکھا جائے گا''۔ اس بحث کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ عربی میں چھوٹا الف صرف ی کے اوپر نہیں کبھی کبھی دوسرے حروف کے اوپر بھی لکھا جاتا ہے جیسے اسمٰعیل، اسحٰق۔ یہاں الف ی کا بدل نہیں، اس لیے اس الف کو بھی اردو میں پورا لکھنا مناسب ہے مثلاً اسماعیل، اسحاق۔

عربی فارسی اثرات میں اردو زبان کے اپنے سسٹم کی برتری کو تسلیم کرنے کی تیسری مثال ہم آواز حروف کی ہے، مثلاً

ذ ز ض ظ حروف عربی میں الگ الگ آواز دیتے ہیں

یہی حال ث س ص

یا ت ط

یا ح ہ

کا ہے۔ اردو میں حروف کے ان سِٹ میں باہمدگر قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک زمانے میں ان الگ الگ حروف کے خلاف آواز اٹھی تھی کہ اردو میں چونکہ ان حروف کا الگ الگ صوتی وجود نہیں ہے، ان کو ایک طرح لکھنا چاہیے۔ اس کی باقاعدہ کوششیں ہوئیں۔ رسالے بھی نکالے گئے۔ ہرچند کہ بظاہر یہ تجویز سائنٹفک معلوم ہوتی ہے اور لگتا یہی ہے کہ اردو کی اردوئیت کی بنا پر پیش کی جارہی ہے کہ جب ذ ز ظ ض کی آواز ایک ہی ہے تو ان کو ایک طرح کیوں نہ لکھیں، لیکن اصلاً یہ تجویز نہ تو سائنٹفک ہے نہ اردوئیت کی زائیدہ ہے کیونکہ اردو میں سیکڑوں ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جن کا معنیاتی امتیاز فقط ان حروف کے الگ الگ ہونے سے قائم ہوتا ہے۔ ان کو اگر ایک کردیں تو اردو لفظیات کا ایک حصہ (اور اہم حصہ) ملیامیٹ ہوجائے گا۔ گویا زبان کے سسٹم میں صوتی سطح ہی سب کچھ نہیں، ملفوظی اور صرفی سطح بھی اہم ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس نہایت اہم نکتہ کے رمز شناس ہیں، اور وہ 1951 ہی سے ایسی یک طرفہ اصلاحات کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ انھوں نے ان حروف کو اردو کے حروف تہجی میں جوں کا توں برقرار رکھنے پر اصرار کیا ہے کیونکہ یہ حروف لاکھ بے صوت سہی، بے معنی نہیں ہیں اور اردو لفظیات کا ناگزیر حصہ ہیں۔ ان کے بغیر اردو کے ملفوظی اور معنیاتی نظام کا تصور ممکن نہیں اس لیے جہاں تک ان حروف کا تعلق ہے، جیسا سنو ویسا لکھو کے اصول پر عمل کرنا ممکن نہیں۔

اب لیجیے ہندی اور پراکرت اثرات کو۔ اس ضمن میں یہاں صرف دو شقوں کا ذکر کافی ہے، اول اردو کا مصوتی اور اعرابی نظام اور دوم اردو کی ہکار و معکوسی

آوازوں کا نظام۔ ان دو شقوں ہی کی بحث سے اس تحریر کا مرکزی مقدمہ ثابت ہو جائے گا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اردو کا ایک اہم مسئلہ اعراب اور حروف علت یعنی مصوتوں کا ہے۔ اردو کے مصوتے وہ نہیں ہیں جو عربی کے ہیں۔ اسی طرح اردو کے مصوتے وہ بھی نہیں ہیں جو فارسی کے ہیں۔ یہ بات اردو کے ہندآریائی زبان ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اردو کی آزادانہ لسانی حیثیت اسی سے ظاہر ہے کہ اردو زبان مشرق وسطیٰ نژاد نہیں جنوبی ایشیا نژاد ہے۔ اعراب اور حروف علت کے بیان میں اچھے اچھوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اردو کے خاص اعراب تین ہیں، زیر، زبر، پیش اور حروف بھی تین ہیں الف واؤ اور یائے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے صاف لکھا ہے کہ اردو میں اعراب یا حروفِ علت چھ نہیں دس ہیں اور یہ سو فی صد وہی ہیں جو ہندی کے ہیں۔ گویا حروف علت میں مطابقت مکمل ہے (1962 کے زمانۂ وسکانسن سے راقم الحروف ان کی نشان دہی کرتا رہا ہے، ملاحظہ ہو مضمون ''اردو کی آوازیں'' یا کتابچہ ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'')۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہ صرف میری تائید کی ہے بلکہ مَل مِل مُل مال مولا مول مُول مَیلا میلہ مِہل کے اقلی جوڑوں کے گوشوارے سے ان کا حتمی امتیاز بھی ثابت کیا ہے۔ پاکستان میں اس سلسلے کی پہلی کامیاب کوشش کا کریڈٹ فرمان صاحب کو جاتا ہے۔

یہی معاملہ اردو کی ہکار اور معکوسی آوازوں کا ہے جہاں ہندی اور پراکرتوں سے مطابقت مکمل ہے۔ اس بارے میں بھی فرمان صاحب نے اردو کی اداشناسی اور رمز آشنائی کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو کے حروف تہجی میں باقاعدہ

بھ پھ تھ جھ چھ دھ کھ گھ

ٹ ٹھ ڈ ڈھ ڑ ڑھ

ان چودہ آوازوں کو جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں اور خالص ہندی آوازیں ہیں، اردو میں شامل رکھا ہے۔ یہ حروف چودہ بنیادی آوازوں کے لیے ہیں جن کے بغیر عام اردو کا ایک صفحہ تو کیا ایک پیرا بھی نہیں لکھا جاسکتا، اور اردو آوازوں کی یہ وہ شق ہے جو اردو کو سامی خاندان اور ایرانی خاندان کی زبانوں سے یکسر الگ قرار دیتی ہے

اور ہندآریائی خاندان سے جوڑتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری فقط ان چودہ آوازوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے، وہ لھ مھ نھ کے اضافے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں اور واضح طور پر لکھتے ہیں: ''یہ تمام آوازیں ہندی، سنسکرت اور علاقائی زبانوں سے آئی ہیں''۔ (ص 14) امالہ کی بحث بھی ہندی اثرات کی بحث ہے یعنی الف کی آواز کو ے میں بدلنے کا عمل جو عربی فارسی الفاظ پر بھی بڑے پیمانے پر لاگو ہوتا ہے۔ یہاں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں (ملاحظہ ہو صفحہ 34 ,33 ,32) ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے امالہ سے بھی پورا انصاف کیا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو کی آزادانہ لسانی حیثیت اور اردوئیت کے نہایت موثر وکیل ہیں۔ ابھی ہم نے دیکھا کہ اردو خواہ کیسی خوشہ چیں زبان ہو اور اس نے کہاں کہاں اور کس کس کے گل بوٹوں سے اپنے دامن کو سجایا ہو، اس کا داخلی نظام اس کا اپنا نظام ہے۔ اردو بیشک عربی فارسی اور ہندی سنسکرت کی احسان مند ہے کہ ان سے اردو میں کیا کیا کچھ آیا اور خود اردو نے اپنے باطنی تحرک اور اپنے حسن و لطافت سے اس میں کیا کیا اضافے کیے۔ لیکن اردو کے اپنے داخلی نظم کے معاملات میں ان میں سے کوئی بیرونی زبان حَکَم نہیں ہوسکتی۔ اردو کے لسانی معاملات میں قولِ فیصل کسی دوسری زبان کا نہیں خود اردو کا اپنا ہوگا یعنی اردو کے داخلی نظام کی رو سے ہوگا۔ کسی بھی زبان کی لسانی خودمختاری اور آزادی کی بنیاد یہی ہے۔ اس نظام کو سمجھنا اور اس کی روشنی میں مسائل کو حل کرنا اردو کی روح سے ہم کلام ہونا اور اس کے مزاج سے انصاف کرنا ہے۔ اس کا حق پاکستان میں جیسا ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ادا کیا ہے انھیں کا حصہ ہے۔ اردو کے ایسے پارکھ اور اداشناس ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ زبان کی دنیا عجیب آزادی کی دنیا ہے۔ زبان، مذہب، ثقافت، تاریخ، ان سب سے جُڑی ہوئی ہے، لیکن زبان کی اندرونی مملکت میں سکہ کسی دوسرے کا نہیں خود اُسی زبان کا چلتا ہے۔ زبان کا چلن پُراسرار طور پر معاشرت اور استعمالِ عام سے قائم ہوتا ہے۔ یعنی زبان ''شے'' نہیں ''فارم'' ہے، یا زبان ساخت ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے فیصلے صحیح خطوط پر اس لیے بھی ہیں کہ وہ زبان کی ساخت کا ساتھ دیتے ہیں۔

اوپر ہم نے فقط بنیادی مسائل سے استنباط کیا ہے۔ ذیلی معاملات کو بھی انھیں پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ بنیادی اہمیت زبان کے تصور اور اس کے تئیں ذہنی رویے کی ہے۔ اگر طبیعت زبان کی مزاج آشنا ہے اور ترجیحات غیرلسانی نہیں تو لامحالہ ذہن صحیح نتائج ہی تک پہنچے گا۔ فرمان صاحب عربی فارسی اثرات اور ہندی پراکرت اثرات کے بیچ اردو کا لسانیاتی خوش امتزاجانہ توازن برقرار رکھنے کے پل صراط سے جس کامیابی سے گزرے ہیں، اس کے لیے وہ اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔ وہ اردو کے بے لوث خدمت گزار ہیں۔ خدا ان کو سلامت با کرامت رکھے، ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمیں باد!

کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ

کربل کتھا[1] اردو نثر کی قدیم ترین کتابوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے سترھویں اٹھارویں صدی تک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ ہر چیز ایک وضع چھوڑ کے دوسری وضع پر آ رہی تھی۔ اگر کہا جائے کہ ان تبدیلیوں کا سب سے زیادہ اثر زبانوں نے قبول کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ مختلف بولیاں اس زمانے میں خام حالت میں تھیں۔ قدیم سلطنتوں کا سیاسی انتشار، نئی حکومتوں کا قیام، فوجوں کا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنا، باشندوں کی نقل و حرکت، نئے سیاسی مراکز کا قائم ہونا، صوفیا کے سلسلوں کا فروغ اور بھگتی تحریک کا ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھا جانا؛ ان سب عوامل کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف بولیوں میں اختلاط اور ارتباط کے مواقع بہت بڑھ گئے اور پرانی حد بندیاں ٹوٹنے لگیں۔ نواح دہلی کی تقریباً سب بولیاں یعنی کھڑی، ہریانی اور برج، شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں، اس لحاظ سے ان میں کچھ نہ کچھ ہم آہنگی ہے، اس پر سیاسی اور سماجی تحریکوں کے اثرات مستزاد۔ اردو کی بنیاد کے اعتبار سے کھڑی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن کھڑی کے قدیم نمونے بہت کم دستیاب ہیں۔

کھڑی بولی کا سلسلہ یوں تو بابا فرید شکر گنج (متوفی 1269ء/ 668ھ) اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی (متوفی 1356ء/ 757ھ) سے ملایا جا سکتا ہے، لیکن سیر الاولیا اور خیر المجالس میں چند جملے یا اقوال ملتے ہیں۔ امیر خسرو (متوفی 1324ء/ 725ھ) مسلمہ طور پر زبان دہلوی کے پہلے شاعر ہیں، اور ان کو بجا طور پر کھڑی کا نقاشِ اول

---

1 ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے ان صفحات کو 1963 میں میری گزارش پر پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی تھی اور کہیں کہیں مفید حواشی کا اضافہ کیا تھا، ع۔ص۔ سے مراد انھیں کے حواشی ہیں۔

کہا جا سکتا ہے، لیکن ان سے منسوب کلام میں کھڑی کے ساتھ برج کی آمیزش ہے۔ نام دیو (متوفی 1408ء)، کبیر داس (متوفی 1515ء) اور گرونانک (متوفی 1539ء) کے یہاں کھڑی بولی کی نشان دہی کی جا سکتی ہے لیکن یہ ان کی زبان کا غالب عنصر نہیں۔ کھڑی بولی کے چند نمونے شیخ بہاء الدین باجن، (متوفی 1506ء/ 912ھ) (''صفتِ دنیا بزبانِ دہلوی گفتہ'') چندر بھان برہمن (متوفی 1662ء/ 1073ھ) (خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے) اور افضل جھنجھانوی (متوفی 1625ء/ 1035ھ) کی بکٹ کہانی میں ملتے ہیں۔[2] اردو گو متاخرین شعرائے فارسی اور دور اول کے اردو شعرا کا زمانہ اس کے بعد کا ہے۔ فضل علی فضلی کی کربل کتھا کی بنیادی اہمیت یہی ہے کہ یہ کھڑی بولی کی پہلی مستند نثری تصنیف ہے۔[3]

مولانا حامد حسن قادری نے کربل کتھا کے چند جملوں کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ اس میں روزمرۂ دکن کا اثر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فضلی کو ''دکنی الاصل'' قرار دیا ہے۔[4] زیرِ نظر مضمون میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ متعدی افعال کی ماضی مطلق میں جمع غائب مذکر کے ساتھ مضارع، فرمائے، کہے، رکھے وغیرہ کا استعمال دکنی سے مخصوص نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ حالت فاعلی میں لاحقہ 'نے' کا عدم استعمال ہے اور یہ بے قاعدگی اس زمانے کی کھڑی اور ہریانی میں بھی پائی جاتی تھی (اس کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی)۔ فضلی نے بار بار وضاحت کر دی ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے ''زبانِ ہندی'' میں لکھ رہا ہے۔ اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ فضلی کو تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ اس صنعت کا مخترع ہے یعنی زبان ہندی میں (ترجمہ کرنے میں) اسے اولیت حاصل ہے:

''پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب لگ ترجمہ فارسی بہ

---

2 بکٹ کہانی مرتبہ پروفیسر مسعود حسین

3 گمان ہے کہ قصہ 'مہر افروز و دلبر' بھی اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ مرتبہ پروفیسر مسعود حسین، حیدرآباد 1966

4 داستان تاریخ اردو، آگرہ 1957، ص 49

عبارتِ ہندی نہیں ہوئی مستمع''۔ ص 28 (5)

کربل کتھا 33-1732 (1145ھ) میں تصنیف ہوئی اور پچیس سال بعد 57-1756 (1170ھ) میں جب مصنف نے اس پر نظرثانی کی تو اپنے دعوے کو دہراتے ہوئے پھر اس بات پر زور دیا:

''اب کہ نظرِ ثانی کر بکمیت و کیفیتِ مضامین و ہندی استطلاحات (کذا) و استعاراتِ رنگین اصلاح دیا''۔32

کربل کتھا کی لسانی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ اگرچہ واعظ کاشفی کی فارسی ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ ہے، اس کا عام انداز اس زمانے کی بول چال کا ہے اور اس کا روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو فارسی عربی سے نابلد تھے۔ قدیم زمانے میں زبان کا معیار صرف ''منتخب روزگار'' یعنی خاص طبقے کے افراد ہی متعین کیا کرتے تھے، جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آج اردو کے عوامی رشتوں کا سراغ لگانے میں طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ مقام شکر ہے کہ کربل کتھا کی زبان ان بندشوں سے بے نیاز رہی اور اس میں ضرورتاً روزمرۂ عوام ہی کو اختیار کیا گیا۔ فضلی نے خود اس کی وضاحت کردی ہے:

''بندۂ حقیر، پر تقصیر، خاص روضۃ الشہدا کا کہ سب نکتہ سنجانِ مناقبِ شاہِ لافتیٰ نے اور سب دقیقہ فہمانِ مصائبِ سیدالشہدا نے واقعہ شہادتِ شاہِ کربلا کا اوس میں لکھا ہے، سو ناتا تھا لیکن معانی اوس کے نساء و عورات کی سمجھ میں نہ آتے تھے، اور فقراتِ پرسوز و گداز اوس کتابِ مذکورہ کے بسببِ لغاتِ فارسی اون کوں نہ رولاتے تھے۔ اکثر اوقات بعدِ کتاب خانی (خوانی) کے سب یہ مذکور کرتے کہ صد حیف وصد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارتِ فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے۔ ایسا کوئی صاحبِ شعور ہووے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھاوے اور ہم سے بے سمجھوں کو رولاوے۔ مجھ احقر احقر (افقر) کی خاطر میں

5 کربل کتھا کے اقتباسات کے ساتھ ہندسوں سے متنِ کتاب کے صفحات مراد ہیں (مطبوعہ دہلی یونیورسٹی)

گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارت وحسن استعارات ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین ومومنات کیجیے تو بموجب اس کلام بانظام کے کہ من بکا علی الحسین اوتبا کا وجبت لہ الجنۃ، بڑا ثواب باصواب لیجے۔ کیونکہ اس فایدۂ سبحانی سے اور اس مایدۂ ربانی سے زن ومرد اور پیر وجواں، خواندہ وناخواندہ اور خورد وکلاں کو بہرۂ فاضل اور نصیبۂ کامل حاصل ہووے اور ہر ایک بے خبر اس دردِ پر سوز اور اس خبرِ غم اندوز کوں سن کر اور سمجھ کر رووے''۔ 38

کربل کتھا چونکہ اپنی قسم کی اولین کوشش تھی، اس کی نثر فارسی اور عربی ترکیبوں سے خاصی گراں بار نظر آتی ہے۔ شروع میں قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی بھی کی گئی ہے جو اس زمانے کی فارسی انشا کا عام انداز تھا۔ لیکن جیسے جیسے فضلی آگے بڑھتے ہیں، صاف، سلیس اور رواں نثر لکھتے ہیں، اور یہی کربل کتھا کی زبان کا خاص انداز ہے۔

ذیل میں کربل کتھا کی لسانیاتی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

(الف) صوتی

حرکات وعلل:

پنجابی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس میں ایسے الفاظ جن میں ثانی حرف علت ہو، بہ تخفیف حرف علت بولے جاتے ہیں، مثلاً ہتھ، کن، ٹنگ۔ برج بھاشا میں چونکہ الفاظ کو سہل بنانے کا رواج رہا ہے، ایسے الفاظ کو پہلے حرف کے بعد حرف علت کے اضافے سے ادا کیا جاتا ہے، جیسے ہاتھ، کان، ٹانگ۔ حروف علت کی تخفیف وتکبیر کے لحاظ سے کھڑی بولی پنجابی اور برج کے بین بین ہے۔ لیکن کربل کتھا میں بعض ایسے الفاظ، جو بعد میں بہ تخفیف حرف علت رائج ہوگئے، طویل حرف علت کے ساتھ ملتے ہیں، یہ غالباً اس زمانے کی زبان دہلوی پر برج کا اثر ہے۔

لاگے	130
کاندھے	43, 45
راکھ (رکھ)	90

آخری دور کی پراکرتوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بعض مرکب اور مشدد حروف کی ماقبل حرکات کا اشباع ہوجاتا تھا۔ سنسکرت اصطلاح میں اسے "گرنؔ" کہتے ہیں۔ اس سے تلفظ کو نسبتاً سادہ اور سہل بنانے میں مدد ملتی تھی، مثلاً اگی سے آگ یا مکھّن سے ماکھن۔ شمال مغربی بولیوں میں سے پنجابی نے گرنؔ کو منہ نہیں لگایا اور مشدد لہجے کو باقی رکھا۔ کھڑی بولی کے بعض اضلاع مثلاً مظفرنگر، میرٹھ، سہارن پور اور انبالہ وغیرہ میں اس لہجے کا اثر ملتا ہے لیکن دہلی میں اور برج کے علاقوں میں مشدد الفاظ کو سہل کرلیا جاتا ہے۔ کربل کتھا کی زبان بھی اس معاملے میں مٹّی پر ماٹی 150 اور ہڈّی پر ہاڑ (ہاڈ) 147 کو ترجیح دیتی ہے۔

ضمہ:

کربل کتھا میں جہاں الفاظ کے پہلے صوتی رکن میں ضمہ ہے، اسے واؤ میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ حروف علت کو کھینچ کے ادا کرنے کے رجحان کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے، ممکن ہے ضمہ یعنی خفیف لبی مصوتے کا، واؤ یعنی طویل لبی مصوتے میں تبدیل ہونا، اسی رجحان کی وجہ سے ہو۔ لیکن قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ گمان غالب یہ ہے کہ ضمہ کے بجائے واؤ کا استعمال کسی صوتی خصوصیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس زمانے میں اردو املا کا عام انداز اعراب بالحروف کا تھا، اور اُس کو اوس اور اُن کو اون لکھتے تھے۔ وسط انیسویں صدی تک ضمائر کے املا میں بجائے اعراب کے حروف علت کا استعمال اسی طریقے پر ملتا ہے۔[6] کربل کتھا میں یہ انداز

---

6 یہ بالکل صحیح ہے۔ سید انشا نے اوس پر اعتراض کیا ہے: جب اُس کی جگہ اوس لکھتے ہو، اِس کو بھی ایس لکھو۔ (دریاے لطافت کے ابتدائی اوراق میں یہ بحث ہے) لیکن اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس اور اُس دو لفظ جو ایک دوسرے کے متقابل تھے، وہ دونوں گونگے ہوگئے۔ اکثر اوقات یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کسی عبارت کو پڑھنے میں جب تک اس کا پہلے سے مطالعہ نہ کرلیا جائے، پڑھنے والا ٹھوکریں کھاتا ہے اور سننے والے کو الجھن ہونے لگتی ہے۔

سب سے بہتر ہوگا کہ اُس کو ہمیشہ پیش کے ساتھ اور اِس کو ہمیشہ زیر کے ساتھ لکھیے۔ پرانے زمانے میں جن لوگوں نے 'وْ' سے کام لیا چنداں بے جا نہ تھا۔ انھوں نے اوس پورا لکھا اور کاتب کی محنت بچانے کو "اِس" کو بغیر اظہار حرکت لکھا۔ (ع۔ص = ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

صرف ضمائر میں نہیں بلکہ افعال اور اسما میں بھی بکثرت ملتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ضمائر:

اوس	(اُس)	1
اونہے	(انھیں)	86
اون	اُن	105
اونہوں	اُنھوں	111
ووہی	وہی	15

افعال و اسما:

بورائی	(برائی)	58
کوتے	(کتّے)	78
دوکہہ	(دکھ)	
چوپکے	(چپکے)	87
اوجڑا	(اجڑا)	114
اوداس	(اداس)	118
کوپی	(کپّی)	30
گوڈی	(گدّی)	131
بولائے	(بلائے)	57
سونا	(سنا)	57
پہوںچ	(پہنچ)	58
چھوپا	(چھپا)	60
چوبہا	(چبھا)	68
بوجہائے	(بجھائے)	68
اوٹہا	(اٹھا)	83

سولائی	(سلائی)	86
چوکے	(چکے)	93
پوکارا	(پکارا)	102
چون	(چن)	15
اوتریں	(اتریں)	38
جھونجلا	(جھنجھلا)	130[7]

مصوتوں کی اس تبدیلی سے صرف دیسی الفاظ متاثر ہوئے ہیں، عربی فارسی الفاظ میں ضمہ برقرار ہے: رسول 100، خصوص 98، حر 101، مصیبت 113، شجاع 117، جرات 117، دشمن 127، حکم 85

مصوتہ زیر کے یائے مجہول میں تبدیل ہونے کی مثالیں بہت کم ہیں:

پھیر	(پھر)[8]	(90, 46)	ایتوار	(اتوار)
ایدھر	ادھر	(94, 66)	دیکھلائے	(دکھلائے)

ہکار آوازیں:

اردو میں ہائے مخلوط، بندشی آوازوں پ ب، ت د، ٹ ڈ، اور ک گ، اور ایفریکیٹ (Affricate) آوازوں چ ج کے ساتھ ملتی ہے۔ اردو کی ہکار (Aspirated) آوازیں دس ہیں: پھ بھ، تھ دھ، ٹھ ڈھ، کھ گھ اور چھ جھ[9]۔ یہ خالص ہند آریائی

7 اصل یہ ہے کہ ہم لوگ ایک مدت تک فارسی کتابت کی طرح اردو لکھتے رہے اور رسم الخط کی درستی کی طرف اس لیے توجہ نہیں کی کہ یہ تو ہماری زبان ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں مکتوب لفظ کا تلفظ کیوں کر کرنا چاہیے۔ جب کچھ انگریز اس طرف متوجہ ہوئے مثل گل کرسٹ کے تو بھی ہمارے لکھے پڑھے لوگوں نے پروانہ کی۔ (ع۔ص)

8 یہ دونوں صورتیں قدیم زمانے میں مستعمل تھیں۔ (ع۔ص)

9 ھائے مخلوط ل، م، ن، ر، ڑ اور عوامی بول چال میں ی، و اور ز آوازوں کے ساتھ بھی ملا کے بولی جاتی ہے۔ مثلاً دولھا، تمھارا، کنھیا، پڑھ، یھاں، وھاں وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ ان الفاظ میں ہ کی آواز مصمتے کے فوراً بعد جڑواں حالت میں آتی ہے اور کسی حد تک پہلی آواز میں ضم ہو جاتی

اصوات ہیں اور بندشی آوازوں میں مکمل سٹ کی حیثیت سے صرف ہندوستانی زبانوں میں ملتی ہیں۔ گو ہندآریائی اور ہند ایرانی دونوں کا تعلق ہند یورپی خاندان السنہ سے ہے، لیکن ہند ایرانی میں ان کا وجود نہیں۔ اس کے برعکس اردو نے انھیں ہندی کی طرح تمام وکمال محفوظ رکھا ہے۔ اردو نے اپنا رسم الخط چونکہ فارسی سے لیا اور فارسی میں یہ آوازیں نہیں تھیں، اس لیے اردو والے بھی ایک مدت تک ان کی اصلیت سے بے خبر رہے، چنانچہ کربل کتھا میں انھیں ہر جگہ ہ سے لکھا گیا ہے اور اس میں ہائے دوچشمی کا وجود ہی نہیں۔ کربل کتھا کے طرز املا میں دھر اور دہر، کھا اور کہا، پھر اور پہر، اور بھار اور بہار میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ محمد شاہی زمانے تک ہکار آوازوں کے لیے ہائے دوچشمی کا رواج نہ ہوا تھا اور اردو والے انھیں دو آوازوں یعنی ب + ہ اور پ + ہ سے مرکب ہی سمجھتے تھے۔ کربل کتھا میں یہ آوازیں لفظ کے آغاز، وسط اور آخر ہر حالت میں استعمال ہوئی ہیں اور ہر جگہ انھیں ہائے ہوز ہی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ البتہ آخری حالت میں املا کے قاعدے متعین نہیں تھے، مثلاً مجھ کو مجہ بھی لکھا ہے اور مجھہ بھی۔ یعنی آخری حالت میں اکہری ہ اور دوہری ھ دونوں کا استعمال ہوا ہے۔ ھ کے استعمال میں یہ بے قاعدگی اردو میں اب تک چلی آتی ہے۔ کربل کتھا میں سوائے مجہ، تجہ، بوجہ اور دکہ کے تقریباً وہ تمام الفاظ جن میں ہکار آواز آخری حالت میں آئی ہے، دوہری ھ سے لکھے گئے ہیں، یعنی رکھہ، ساتھہ وغیرہ۔ دھ اور ڈھ حروف چونکہ بعد کے حرف سے ملا کے نہیں لکھے جاتے، انھیں دوہری ھ سے لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ان میں ہکار عنصر ہ کی شکل میں ملتا ہے۔

آغاز: بہر 12، کہوے 15، پہنسا تا 29، گہوڑا 30، چہالر 30، چہاتی 5، دہڑ 5، تہا 1، ٹہوکر 35

(جاری) ہے۔ لیکن اس حد تک نہیں جیسا کہ ہکار آوازوں پھ، بھ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ وہاں انضمام کامل ہے اور یہاں جزوی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' (طبع دوم) گوپی چند نارنگ، صفحہ 36-31، بیان ہ، ح۔ (نارنگ)

وسط : اندھیر 35، آنکھوں 35، چکھایا 16، سمجھا 28، بیٹھے 30، ابھی 99، سید ہے 3، کاندھے 3، بچھڑا 51

آخر : کچھ 32، رکھ 34، ساتھ 16، دیکھ 25، بیٹھ 29، اوٹھ 30، مجھ 31، مجھ 30، ہاتھ 3، بوجھ 4، دکھ 3، جیبھ 1، بندہ 99

ہائے زائد کی مثالیں مندرجۂ ذیل ہیں :

کاہہ (کل 52، 69)، آزردہ گی 53، دیدہ ونسے (دیدوں سے 59)، سکھینہ 147۔

مندرجۂ ذیل الفاظ میں ہ کی موجودگی کی وجہ سے ماقبل آواز ہکار ہوگئی ہے۔ نچوڑتے میں چ کی بجائے چھ جدید اردو میں مستعمل نہیں۔ البتہ مادّہ ڈھونڈھ میں آخری حالت میں ڈھ ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں اس کی تصریفی شکلوں میں ڈھ موجود ہے، لیکن جدید اردو میں ان کا تلفظ سادہ بندشی آواز ہی سے کیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ پھوپیوں کا ہے۔

نچھوڑتے	132
ڈھونڈہ تا	87، 127
ڈھونڈہ نے	75، 83
پہو پیوں	122
پہو پہیاں	125

بعض الفاظ میں اس کے برعکس بھی ہوا ہے، یعنی ہکار آوازوں کو سادہ کر دیا گیا ہے یا آخری حالت میں ہ اڑا دی گئی ہے :

سانج	(سانجھ)	120
ہات	(ہاتھ)	2
گرک	(گھرک)	185
پنکڑیوں	(پنکھڑیوں)	105
ہمیش	(ہمیشہ)	58

معکوسی آوازیں :

اردو کی معکوسی آوازیں تین ہیں: ٹ، ڈ، ڑ۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قدیم ہند یورپی زبان میں ان کا وجود نہ تھا اور ہندآریائی نے انھیں قدیم دراوڑی اثرات کے تحت اختیار کیا۔ فارسی رسم الخط میں چونکہ ان آوازوں کے لیے کوئی علامت نہیں، اردو میں انھیں ظاہر کرنے کے لیے شروع میں کچھ دقت کا سامنا رہا اور طرز املا میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہی۔ کربل کتھا کے قلمی نسخے میں انھیں تین نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے، چھوٹے ط کا (یعنی آج کے چلن کا) اس میں کہیں وجود نہیں۔ یہ غالباً وسط اٹھارھویں صدی کے بعد کا ارتقا ہے۔ شروع شروع میں شمالی ہندوستان کی زبانوں میں ڑ کا وجود نہ تھا، ماہرین لسانیات اسے ڈ کا ترقی یافتہ لہجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن پنجابی زبان میں بالعموم اور ہریانی میں بالخصوص ڈ ہی کو ترجیح حاصل ہے۔[10] نوادرالالفاظ میں سراج الدین علی خاں آرزو نے بھی میر عبدالواسع ہانسوی کے تتبع میں اساڑھ کو اساڈھ لکھا ہے۔[11] یہی 'ڈ' کھڑی میں ڑ اور برج بھاشا میں ر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ کربل کتھا کی زبان چونکہ دہلی کے لسانی سنگم سے تعلق رکھتی ہے، اس میں دونوں اطراف کے اثرات کی تاک جھانک دیکھی جاسکتی ہے :

ڑ : ر — دانت میرے تورے 43

ٹ : ت — کہانے کے تین کہاتی تھی جب پہلے چتائی تھی تجھے 132

ڑ : ڈ — بوڈھا 167، بوڈھیا 76، ہاڈوں 146، بڈھاؤں

زائد — مڑوڑی - کنکڑہ 136، ڈاڑہ 155

---

10 تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: گوپی چند نارنگ اور ڈونلڈ بیکر "Generative Phonology and the Retroflex Flaps of Hindi-Urdu" General Linguistics, Vol. 14, No. 3, 1974. Pp. 129-155.

11 نوادرالالفاظ مع غرائب اللغات، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، کراچی، 1951، ص 22

غنائی آوازیں:

کربل کتھا میں غنائی آوازوں کے مطالعے سے اردو کے تشکیلی دور سے متعلق بعض دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اردو میں ناک کی آوازیں دو ہیں، م اور ن۔ یہ دونوں مصمتے ہیں، لیکن ناک کی آوازیں مصوتوں سے مل کر بھی ادا کی جاسکتی ہیں۔ مصمتے کو ادا کرتے ہوئے منہ کا راستہ تقریباً بند ہو جاتا ہے اور ہوا محض ناک سے نکلتی ہے۔ لیکن غنائی مصوتہ (نون غنہ) کو ادا کرتے ہوئے آواز پیدا کرنے والی ہوا منھ اور ناک دونوں سے بیک وقت خارج ہوتی ہے۔ ایسی آوازیں چونکہ اردو میں معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں، اس لیے اہم ہیں۔ اردو رسم الخط میں نون فصلی، نون وصلی اور نون غنہ تینوں کے لیے ایک ہی علامت استعمال ہوتی ہے۔ جدید دور میں نون غنہ کو آخری حالت میں نقطے کے بغیر ظاہر کیا جاتا ہے، جبکہ قدیم زمانے میں یہ تخصیص نہ تھی، چنانچہ کربل کتھا میں نون غنہ کو جگہ جگہ نقطے سے ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ غنائی مصوتوں کو ادا کرتے ہوئے چونکہ ہوا کے راستے میں کم سے کم مداخلت کرنا پڑتی ہے، ایک ایسے رسم الخط میں جہاں حرف وصوت کا رشتہ بہت واضح نہ ہو، ان کا صحیح احساس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کربل کتھا کی زبان میں غنائی مصوتوں کے استعمال کی بعض دلچسپ مثالیں سامنے آتی ہیں۔

کہیں کلمے میں نون غنہ املا کی گرفت میں نہیں آسکا یعنی حذف ہوگیا، کہیں اسے بڑھا دیا گیا ہے اور بعض الفاظ میں اس نے اپنی جگہ بدل لی ہے، یعنی لسانیات کی اصطلاح میں اس کا تبدل (Metathesis) ہوگیا ہے۔ ذیل کی مثالوں کو دیکھتے ہوئے اتنی بات خاطر نشاں رہے کہ اپ بھرنش کے اثرات کی وجہ سے شروع شروع میں اردوئے قدیم میں نون غنہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا، افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی میں بھی ''کو'' کو ''کوں'' لکھا ہے۔ پنجابی اور ہریانی میں یہ خصوصیت اب تک ملتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے اردو کو کھڑی بولی کی خراد پر اتارا جانے لگا، نون غنہ کا حد سے بڑھا ہوا استعمال رفتہ رفتہ اعتدال پر آگیا۔

انحذاف :

اردو میں ضمائر اور اسمائے اشارہ کے ساتھ جب کلمۂ حصر استعمال ہوتا ہے تو دو صورتیں حاصل ہوتی ہیں، مثلاً یہ ہی اور یہی۔ پہلی کو مکمل اور دوسری کو مخفف کہا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ''سندھی'' کے ذریعے 'ہ ہی' کی 'ہ' حذف ہوجاتی ہے یا صوت ماقبل ہکار ہوجاتی ہے۔ بعض ضمائر میں آخری جانب میں نون غنہ بھی بڑھا دیا جاتا ہے، جیسے انھیں، ہمیں، تمھیں وغیرہ۔ جملے میں جب کسی بات پر زیادہ زور دینا ہوتو اب بھی مکمل صورتیں استعمال کی جاتی ہیں، ورنہ اضافی حالت میں مخفف صورتیں ہی رائج ہیں۔ ان مرکب ضمائر میں آخری حالت کی مصوتی غنائیت اردوئے قدیم کی یاد دلاتی ہے۔ کربل کتھا میں درج ذیل الفاظ مخفف صورت میں مع اضافۂ نون غنہ ملتے ہیں :

یونہین : یوں ہین ماں بین کر روتی تھی۔ 114

تونہین : کوئی کہے اے فلک تو نہین ترس کر ہم پر۔ 118

وونہین : وونہین ندائے الٰہی ہوئی (43 نیز 29، 30، 53، 69، 54، 65، 94، 96، 124)

تیون ہین : تیون ہین بعد مرنے کے نظر کسو کی میرے جنازے پر نہ پڑے۔ 53

جدید اردو میں یہ کلمے مخفف صورت میں مع نون غنہ مستعمل نہیں۔ مفعولی حالت میں انھیں کو بہ انحذاف نون غنہ لکھا ہے :

تم انہے مارو۔ 140

انہے تصدیعہ نہ دے۔ 140

نہ پہر حسین کوں وہ دیکھے نے حسین انہے۔ 141

جو کوئی انہے لاوے۔ 86

انہے لے کدھر ہی نکل جاؤں۔ 117

اردو کے اعداد توصیفی میں مصوتی غنائیت خاص عنصر ہے، لیکن کربل کتھا میں دونو 87 اور تینو 117 بہ انحذاف نون غنہ آئے ہیں۔ البتہ گیارھویں 129 اور بارہ ویں 135 میں نون غنہ موجود ہے۔

حرف 'میں' کو اکثر و بیشتر 'موں' لکھا ہے۔ لیکن ایک مقام پر یہ 'مے' کی صورت میں بغیر نون غنہ کے ملتا ہے 44۔

کربل کتھا میں چونکہ املا کی حد تک نون غنہ اور نون کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا، جگہ جگہ 'میں نے' کو 'مینے' لکھا ہے۔ 40، 29، 30، 44، 45، 54

اضافہ :

بعض کلموں میں مصوتی غنائیت کا اضافہ ملتا ہے۔ اب یہ کلمے اس کے بالعکس مستعمل ہیں :

(او) کو : کوں (28، 29، 17، 33، 38، 44، 47، 134، 135)

(اے) سے : سوں (9، 52، 61)

(،،) بیچا : بینچا (90، 94، 108، 79، 38)

(اُو) کوچ : کونچ (93، 94، 187، 50)

(،،) تو : توں (17، 30، 80، 39، 43)

(ای) پائتی : پائنتین (191)

کربل کتھا میں گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد ترتیبی کو بھی نون غنہ کے اضافے سے لکھا گیا ہے (گیارنہ، بارنہ، تیرنہ، چودنہ ...)۔ لہندا اور مشرقی پنجابی میں یہ اعداد اب بھی نون غنہ کے اضافے کے ساتھ بولے جاتے ہیں جبکہ معیاری اردو میں ان کا غنائی لہجہ حذف ہوگیا ہے۔ ان کلموں میں مصوتی غنائیت چونکہ لفظ کے آخری رکن پر حاوی ہے، اس لیے قدیم طریق املا کی گرفت میں پوری طرح نہیں آتی چنانچہ کہیں اسے 'ہ' سے پہلے لکھا ہے اور کہیں بعد میں :

گیارنہ	(22)
بارنہ	(31، 36، 110، 133، 152، 172)
تیرنہ	(58، 69، 93، 153)
چودنہ	(153)
پندرہ نہ	(51)
سترنہ	(58)
اٹھارنہ	(124، 133، 150)

قلب:

دھواں	دھنوا	(46، 87)
پاؤں	پانو	(43، 95)
پہنائے	پنہائے[12]	(133)

---

12 کربل کتھا: آپ زرہ بکتر علی اکبر کوں پنہائے 123
چند برس پہلے اردو رسائل میں یہ بحث جاری رہی کہ پنہانا صحیح ہے یا پہنانا۔ اردو میں دراصل یہ ملتے جلتے تین لفظ ہیں: پنھانا (بروزن فعولن) پہنانا (بروزن مفعولن) اور پن ہانا (بروزن مفعولن)۔ فیلن اور شیکسپیئر دونوں نے پہنانا اور پنہانا کا ذکر کیا ہے۔ نوراللغات اور سرمایۂ زبان اردو میں پنھانا موجود ہے۔ داغ کا شعر ہے:

آڑی زخموں کی جو قاتل نے پنھائی بدھی
آج مقتل میں شہید آئے ہیں دولھا بن کر

جوش ملیح آبادی اس لفظ کو ٹاٹ باہر قرار دیتے ہیں، مگر جب خود انھیں کے کلام سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی گئیں تو انھیں یہ کہتے بنی:

''یہ اس دور کی غلطیاں ہیں جب میں اس لفظ کی اہمیت سے واقف نہ تھا''۔

کربل کتھا میں پنھانا کی موجودگی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لفظ دو ڈھائی سو سال پہلے بھی اردو میں مستعمل تھا۔ (نارنگ)

دوہرا نون :

اردو میں دوہرے مصمتوں کے لیے عموماً علامت تشدید سے کام چلایا جاتا ہے، لیکن ایسے افعال میں جہاں علامت مصدر سے پہلے نون موجود ہو، دوہرا نون لکھا جاتا ہے، مثلاً جاننا، سننا، گننا وغیرہ۔ کربل کتھا میں ایسے موقعوں پر بھی علامت تشدید استعمال کی گئی ہے :

مجھے قوت ان باتیں سوئے کی نہیں۔ 53

یہ مجلس ہے گی تیسری جس میں شہادت اب
شاہ نجف کی ہے جسے سوتا محال ہے 57

وصلی غنائی مصمتہ(13) :

اردو میں لبی آواز ب سے نون کا نہیں، م کا وصل ہوسکتا ہے کیونکہ م اور ن دونوں لبی آوازیں ہیں۔ اردو رسم الخط سے اکثر یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ ب سے پہلے نون استعمال ہورہا ہے، جیسے گنبد، جنبش، انبساط وغیرہ کو ہم لکھتے نون ہی سے ہیں، لیکن بولتے م سے ہیں۔ کربل کتھا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لفظ تھام کو نون اور ب سے لکھتے تھے : تھانب۔ بعد میں ب حذف ہوگیا اور صوتی مناسبت کے لحاظ سے نون کو م سے لکھا جانے لگا۔ لفظ تمبا کو اب 'م' سے لکھا جاتا ہے، لیکن کربل کتھا کے زمانے میں یہ بھی نون سے مستعمل تھا :

---

13 وصلی غناوی مصمت [یا ''صامتہ''] بہتر اور بولنے میں زیادہ آسان ہوگا۔ ن ساکن یا غنہ کے بعد ب جب ایک لفظ میں واقع ہوتو نون میم کی آواز اختیار کرلیتا ہے اور نہ صرف ہندی بولیوں بلکہ فارسی اور عربی میں بھی ان دونوں آوازوں کے ملنے سے م پیدا ہوتا ہے۔

فارسی : انبار، تنبول، تنبولی (تمولی)، دنب (دم)، دمبال (دنبالہ) دنبل، دنبہ (ایک قسم بھیڑ کی جس کی دم بہت چوڑی اور موٹی ہوتی ہے) زنبیل، زنبور، شنبہ، سنبوسہ (سموسہ) گنبد۔

عربی : جنب (اور اس سے جنبیا، ایک طرح کا خنجر جو دکن میں رائج ہے)، عنبر، قنبر، کرنب (کرم کلا) نبی کی جمع انبیا، انبساط (ع۔ص)

'اردو' لفظ 'کنبہ' اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔ (نارنگ)

حضرت اوسے تہا بے نہ تہنبا (147 نیز 132)
آپ ہاتہہ لنبا کر اوس کوزہ کوں اوٹھا (69 نیز 88، 89، 125)

(ب) صرفی

مصادر:

محمود شیرانی نے اردو کی علامت مصدری ''نا'' کو پنجابی سے ماخوذ بتایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مصدری لاحقہ ''نا'' مشرقی پنجابی، ہریانی، اور کھڑی بولیوں میں مشترک ہے۔ برج کا معاملہ جدا ہے، اس میں مصادر بو، اؤ اور نوٗ کے اضافے سے بنائے جاتے ہیں۔ کربل کتھا کی زبان اس لحاظ سے اردوئے قدیم اور کھڑی بولی کے باہمی تعلق کا نیا پہلو پیش کرتی ہے۔ ان افعال میں جن کے مادے حرف صحیح پر ختم ہوتے ہیں، مصدر ''نا'' ہی کے اضافے سے بنتا ہے، لیکن جن مادوں کے آخر میں حرف علت ہو، ان میں بجائے ''نا'' کے ''ونا'' کا اضافہ کیا جاتا تھا، مثلاً جاونا، کھاونا، پیونا، اٹھاونا، بٹھاونا وغیرہ۔ علامت مصدر ''ونا'' کا تعلق لہندا سے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں واؤ کے بعد نون معکوسی ہے اور یہاں سادہ نون استعمال ہوتا ہے۔ واؤ کربل کتھا کے افعال کا اہم عنصر ہے اور مضارع اور دوسرے مشتقات فعل میں بھی برقرار رہتا ہے۔

جاونا 97، پیونا 79، پاونے 15، لاوے 110، چھوڑاوے 110، دیکھلاویں 117، پیوتے 117، رووے 120، کہاوے 121، رولاوے 121، آونے 188، جاوے 45، پہنچاویں 47، دہووے 52، اٹھاویں 28، پاوے 77، لوٹاوے 77، دیوے 16، چمکاوے 17، سمجہاوے 28، ڈراوتا 156، جیوتا 122، جاوتا 93۔

'ہونا' مصدر کے مشتقات میں 'ہوٗ کے بجائے 'ہوے' یا 'ہوئے' ملتا ہے۔ ہوویں کے علاوہ کہیں کہیں ہوئیں کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے اور ہووں کے علاوہ ہوں بھی امدادی فعل کی حیثیت سے آیا ہے:

ہوئے : آج سکینہ میری یتیم ہوئے گی۔ 130
جس کو مینے ستایا ہوئے یا آزردہ کیا ہوئے۔ 44
ہووے : صالح اولاد اون کو ہووے عطا۔ 8
بدل و جان مشغول ہووے۔ 30
ایسا کوئی صاحب شعور ہووے۔ 28
ہوویں : سب کے دل ڈر سے موے ہوویں۔ 37
اس کی مقبول ہوویں سب طاعات۔ 8
بیچ قیامت کے وہ بندے محشور ہوویں ہنستے ہوئے۔ 38
قلم سب شجر ہوویں تو بہی زیاد۔ 19
ہوئیں : دریا خشک ہوئیں گے۔ 129
ہم تو اس پاس جمع ہوئیں گے۔ 161
ایسا مرسل کہ سارے پیغمبر چاہتے اوس کی امت ہوئیں یکسر۔ 1
ہوں : میں رحم کر کے دیوں ہوں جیتی انا کانی۔ 189

امر:

اردو میں علامت مصدر حذف کر دینے کے بعد باقی امر رہ جاتا ہے جیسے بیٹھ، سن۔ لیکن امر مخاطب واحد کو بنظر ادب جمع بھی بولتے ہیں، جیسے بیٹھو، سنو۔ کربل کتھا کے زمانے میں امر کی اس صورت کو یائے زائد سے بولتے تھے، مثلاً بیٹھیو، سنیو وغیرہ۔ بعض ماہرین نے اسے امر دعائیہ کہا ہے اور امر احترامی کی تخصیص 'ے' کے اضافے سے کی ہے، جیسے بیٹھیے، سنیے۔ کربل کتھا میں امر کی یہ تینوں صورتیں یعنی سادہ، دعائیہ، اور احترامی ملتی ہیں لیکن حاوی رجحان دعائیہ ہی کا ہے۔ جن مادوں کے آخر میں یائے معروف ہو، وہاں احترامی 'و' یا 'ے' کے قبل 'ج' بڑھا دیتے ہیں، جیسے کیجیو، کیجیے یا دیجیو، دیجیے۔ یہ ج دراصل یائے زائد کا بدل ہے۔ دیئے میں ی

اپنی حالت پر قائم ہے اور دیجیے میں ج سے بدل گئی ہے۔ مثالیں :

سادہ : لا 30، دو 117، چھوڑو 117، جانو 119، اوٹھہ 45، لے 45، کھول 47، بول 47، دے 47

دعائیہ مع یائے زائد : آئیو 30، بخشیو 34، رکھیو 53، فرمائیو 53، گذریو 55، سونائیو 59، روئیو 59، پہنچیو 79، کھولیو 96، نوچیو 96، جائیو 46، کہیو 47

دعائیہ مع ج : کیجیو 34، ہوجیو 100، دیجیو 105

حال مطلق :

اردو میں حال مطلق مادۂ فعل اور امدادی فعل 'ہے' کی مختلف شکلوں سے پہلے 'تا' کے اضافہ سے بنتا ہے، جیسے جاتا ہے، کرتا ہے۔ کربل کتھا میں مادۂ فعل کا یہ کام مضارع سے لیا گیا ہے، یعنی صیغۂ واحد غائب کے لیے امدادی فعل سے پہلے مادۂ فعل کے آخر میں یائے مجہول بڑھا دی جاتی ہے، جیسے جائے ہے، کرے ہے۔ کربل کتھا میں حال مطلق کی یہ صورت عام ہے۔ مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں اس کے تغیرات یوں بیان کیے ہیں: جاوے، جاوے ہے، جائے ہے، جاوت ہے، جات ہے، اور جاتا ہے۔ فعل حال مطلق جائے ہے، کرے ہے وغیرہ کا استعمال راجستھانی اور ہریانی میں بھی ملتا ہے لیکن یہ کھڑی بولی سے مخصوص ہے اور آج بھی دہلی، بجنور، مرادآباد وغیرہ اضلاع میں اسی طرح بولا جاتا ہے۔ یہ انداز جدید نثر میں متروک ہو چکا ہے، لیکن شعر میں خال خال مروج ہے۔

رولوہو کی زدیدۂ گریاں جاوے تھے۔ 46

حضرت پوچھے کہ کون رووے ہے۔ 135

کلینی پسند ہائے معتبر روایت کرے ہے۔ 157

علی بن ابراہیم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرے ہے۔ 37

کربل کتھا میں 'ہے' کے ساتھ 'گا' بھی حال کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

سبزہ بھی اوگا ہے گا کہیں شور زمیں بیچ۔ 66

الوداع اے دوستو ہے گا ہمارا اب سفر۔ 99

پے بہ پے سب نے کیا ہے گا ظہور۔ 22

کسے ہے گی قدرت جو اوس کی ثنا۔ 19

قدیم اردو میں اس کا رواج تھا اور یہ خصوصیت پنجابی اور کھڑی میں مشترک ہے۔

حالیہ معطوفہ:

کربل کتھا میں حالیہ معطوفہ کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ جدید اردو میں اس کے لیے 'کر' اور 'کے' کے استعمال کو ترجیح حاصل ہے، گو نظم میں اس کے بغیر بھی جائز ہے، جیسے: وہ بات سن چلتا بنا۔

کربل کتھا میں حالیہ معطوفہ کا کام بالعموم مادۂ فعل سے لیا گیا ہے۔ کر اور کے خال خال نظر آجاتے ہیں، ورنہ عام طور پر انھیں استعمال نہیں کیا گیا:

امت نے اس کے فرزندوں کو بھوک پیاس سے بلکا، شربتِ زہر اور خنجرِ قہر سے ہلاک کیا۔ 42

حضرت فاطمہ نے آواز سلمان کی پہچان، جواب دیا۔ 44

حضرت ہوش میں آ، پوچھے کہ کیا ہے۔ 46

آنکھوں سے آنسو پونچھ، کہے۔ 47

اس اندیشۂ عمیق میں سر بہ گریبانِ تفکر ڈال، دریائے اندوہ و تحیر میں غوطہ کھایا۔ 28

بعض جملوں میں حالیہ معطوفہ کے لیے 'کے' کے بجائے 'کہ' بیانیہ فارسی استعمال ہوا ہے جو بظاہر کم سواد کاتب کی نوازش ہے:

فاتحہ ہات اوٹھا کہ با اخلاص۔ 2

مومناں مل کہ بہرِ کسبِ نجات۔ 6
کر کہ تر اوس پانی سے اونگلی شتاب۔ 21
لیجا کہ جو باپ سے ملاوے۔ 94
حال جس کوں کر کہ یاد۔ 59

معاون افعال :

کربل کتھا کے زمانے میں افعال معاون کا استعمال ابھی باقاعدہ نہ ہوا تھا۔ ہے، ہو، ہیں، ہوں اور گا، گے، گی امدادی افعال زیادہ تر حذف کر دیے گئے ہیں اور زمانے کے تعین کے لیے صرف حالیہ ناتمام اور مضارع سے مدد لی گئی ہے:

ہے، ہو، ہوں : اب وہ تیرے باپ سے بدلا مانگتا۔ 44
ایک عرب دروازے پر کھڑا ہے، بصورت مہیب و بشکل عجیب، رخصت مانگتا کہ اندر آوے۔ 46
حسین نے کہا کہ اے نانا میں بھاگتا نہیں بلکہ تمھیں پکڑنے میں گرم کرتا، معشوق کہ عاشق سے بھاگتا ہے، عاشق کوں اپنی اپنی محبت میں تیز کرتا۔ 43
جو اکھٹے بیٹھتے ہو، ہمارا بھی ذکر کرتے یا نہ۔ 39

گا، گے، گی : قاسم کہا ... تجھے بھی شربت مرگ اسی سے چکھاؤں اور تیرے فرزندوں کنے بھجاؤں۔ 111
نہ جانوں بعد میرے کپڑے میرے بچوں کے کون دھووے اور ... نہ جانوں بعد میرے ان کے سر کے بالوں کوں کون دھووے۔ 52
اگر یزید کوں قبول کرے، ملک عراق اور تخت و تاج تیرے تصرف میں آوے اور ملکۂ عالم کہلاوے۔ 66

حالیہ میں جب 'ہوا' صفت کے معنی میں آیا ہے تو اسے بھی حذف کر دیا ہے:

ارزق بد بخت چاروں بیٹے موے دیکھا۔ 110
اے ارزق کہاں روا ہے کہ مرد سپاہی کہلاوے اور
سوار ہوتے گھوڑے کے تنگ کی خبر نہ رکھے۔ 111

ضمائر:

کربل کتھا کے بعض ضمائر سے برج بھاشا کے اثرات کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ یہ کے بجائے یو (80، 81، 19) وہ کے بجائے وو (16، 89، 90، 104، 111، 118، 124) کس کے بجائے کسو (33، 50، 9) اور اُس کے بجائے وِس (120)[14] استعمال ہوئے ہیں۔ ضمیر شخصی مخاطب واحد 'تو' حد سے بڑھے ہوئے غنائی اثرات کے تحت 'توں' ہوگئی ہے (17، 30، 80، 90، 39، 43)

ضمیر موصولہ جس کے علاوہ تس بھی استعمال ہوئی ہے:

میں اکیلا رہ گیا اور بیری ایتے تس پہ ہائے۔ 142
تس پہ ہوتا ہے اب مرن تیرا۔ 113

فاعلی اور غیر فاعلی حالتوں میں ضمیر شخصی اپنا، اپنی، اپنے کے بجائے اپس کا استعمال ہوا ہے۔ یہ ضمیر نواح دہلی کی زبان سے تعلق رکھتی ہے اور افضل جھنجھانوی کی

---

14 کربل کتھا میں وِس کا استعمال زیادہ نہیں۔ لیکن صفحہ 120 پر اس کی موجودگی (آہ، وس ملعون نے وہ ہاتھہ بھی گرایا) سے معلوم ہوتا ہے کہ وسط اٹھارویں صدی کی دہلوی اردو میں یہ ضمیر مستعمل تھی۔ اردو میں یہ غالباً برج بھاشا کے اثر سے آئی۔ کربل کتھا کے بعد وِس کا استعمال اُس مرثیے میں ملتا ہے جسے گل کرسٹ نے ''گرامر آف ہندستانی لنگویج'' میں نقل کیا ہے۔ یہ مرثیہ عبداللہ مسکین سے منسوب ہے جو محمد شاہ (1748-1719) کے زمانے میں ہو گزرا ہے۔ (درگاہ قلی خاں سالار جنگ: مرقع دہلی، ص 51)۔ انڈیا آفس لائبریری لندن کے ایک مخطوطے ''منشات شاکر'' سے بلوم ہارٹ نے نمونے کی جو عبارت نقل کی ہے، وس اس میں بھی موجود ہے (ہندستانی مخطوطات، ص 136) جان پلیٹس نے بھی اسے قدیم اردو میں مستعمل بتایا ہے (ہندستانی گرامر، ص 117)۔ جدید اردو میں وس کی جگہ اُس نے لے لی ہے، لیکن دہلی کی عوامی بولی میں یہ ضمیر اب بھی رائج ہے۔ (ر۔ک۔ اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی، دہلی 1961، گوپی چند نارنگ، ص 71)۔

بکٹ کہانی میں بھی ملتی ہے :

اس کوں کروں گی کیا جو اپس آس گنوائی۔ 115

آسماں لرزا اپس پر ہو گیا نیلہ تمام۔ 121

کہہ اپس دو کہہ کے بچن مجھ سے سچے۔ 128

اعرابی لاحقے :

غنائی آوازوں کی بحث میں یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ کربل کتھا میں کو کے بجائے کوں اور میں کے ساتھ ساتھ موں اور مے استعمال کیے گئے ہیں۔ اسی طرح 'سے' کے ساتھ سوں اور سیتی استعمال ہوا ہے۔ سیتی اور ستی، فائز، حاتم، آبرو اور دیگر متقدمین کے یہاں بھی بار بار ملتے ہیں :

کوں : حاضراں مل کہ اس مطالب کوں۔ 9

اس کوں ظالم نپٹ رکھے بے چین۔ 12

جب حضرت جنگ نہرواں کوں متوجہ ہوئے۔ 57

موں : دیباچۂ کتاب کا دل موں خیال ہے۔ 15

پھرتی تھی خیمہ موں روتی بے قرار۔ 123

دل موں کہا۔ 29

سیتی : ہوا تب یو طوفان سیتی خلاص۔ 19

اے بچے کر اپنے بابا سیتی بات۔ 128

ہو بے بس اوس گھڑی عباس سیتی شہ نے کہا۔ 117

سوں : فاتحہ اب پڑھو دل و جاں سوں۔ 9

ہر طرف اضطراب سوں رو رو نظر کیے۔ 61

ابھی اوس کے ہی ماتم سوں نہ پایا تھا فراغ۔ 52

صلات :

بیچ : یہ ظرفی صلہ ہے اور 'اندر' یا 'میں' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ میں، موں، مے وغیرہ لاحقے بغیر کسی علامت کی وساطت کے آتے ہیں، جبکہ بیچ اضافی علامت کی مدد سے جملے میں استعمال ہوا ہے :

علم ہدایت کا اور نشاں عنایت کا بیچ صحن عالمِ قدس کے بلند کیا۔ 18

ایسا بادشاہ ... کہ ... بندہ نوازی بیچ ملک ہندوستان کے ... قبضہ درایت اوس کے میں آئی۔ 25

لگ، تلک : کربل کتھا میں لگ اور تلک مجروری صلہ 'تک' کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ مندرجۂ ذیل مثالوں میں لگ ظروف اب جب تب کے ساتھ آیا ہے :

اب لگ کہ سن عزیز اوس کے نے ...۔ 26

اب لگ یہیں بیٹھے۔ 30

تب لگ کہ رات آئی۔ 50

اے اخی کب لگ یہ بے آبی سہیں۔ 130

جب لگ کہ خواند میرا نہ پیو چوکے۔ 142

یہاں تلک روئیں۔ 50

کنے :(15) یہ ظرفی صلہ پاس کا ہم معنی ہے اور اسم کی اضافی حالت کے طور پر استعمال ہوا ہے :

تم کوں سونپے حق کنے ہم جاتے ہیں گے اپنے گھر۔ 99

بہ خوشی تمام چچا بزرگوار کنے گیا۔ 106

مینے سونپا خدا کنے دل موں۔ 147

---

15 یہ بڑا اچھا اور بڑے کام کا لفظ تھا جسے ہمارے شاعروں نے متروک قرار دے کر سخت ظلم کیا ہے۔ (ع۔ص)

صفات ضمیری مقداری :

اتنا، جتنا، کے قدیم روپ اتا، جتا کربل کتھا میں ملتے ہیں۔ ان الفاظ میں ن بعد میں اضافہ کیا گیا اور تشدید حذف ہوگئی۔ جان بیمز کا بیان ہے کہ ن لاحقۂ تصغیر ہے جس کے اصلی معنی بعد میں فراموش کردیے گئے، جبکہ جان پلیٹس نے نون کو دوسرے ت کا بدل بتایا ہے۔ کربل کتھا کے دیسی الفاظ میں چونکہ اظہار کسرہ کے لیے ی استعمال ہوئی ہے، اتا، جتا میں یائے زائد بھی ملتی ہے :

جیتا کہ حضرت تازیانہ مارتے تھے۔ (95 نیز 83، 127)

اے حرا ایتے دن توں کہاں تھا۔ 101

ایتے بیگانوں میں کوئی آشنا میرا نہیں۔ (142 نیز 94، 111، 119، 142)

حرف استفہام 'کتے' تعداد کے لیے آیا ہے اور غیر منصرف ہے :

اے فرزند اس مہینے سے 'کتے' دن گذرے۔ 58

ظرف زماں 'جب' کے لیے 'جدہاں' بھی استعمال ہوا ہے :

جدہاں کہ کونچ بہ کونچ اوس طرف وو شاہ چلا۔ 187

کربل کتھا میں 'کبھو' بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ظرف زماں 'کب' اور کلمۂ حصر 'ھی' سے مخفف 'کبھی' حاصل ہوتا ہے۔ برج کے اثر سے قدیم اردو کے کلمات میں 'ھی' کا دوسرا روپ 'ھو' بھی رائج تھا جس سے مرکب 'کبھو' بنا۔

لیٹ جانا کبھو بچے کوں لے اوٹھنا کبھو۔ 130

ہائے اب کبھو نہ دیکھوں گی۔ 50

وحدت و جمع :

فاعلی حالت میں مذکر و مونث دونوں کی جمع کے لیے زیادہ تر لاحقہ ''اں'' استعمال کیا گیا ہے :

بیچاریاں اور محروم دو کہیاریاں بے وارث۔ 130

وہ بھی دو کہیاں۔ 124

ہائے بابا کیا کریں گیاں ہم دو کہیاریاں تیرے بعد کس کوں کہہ بابا پوکاریں ہم بچاریاں تیرے بعد۔ 62

نیز حاضراں (9، 10، 14) مومناں 12، قدماں 30، گھاواں 78، شتراں، اسپاں، اونٹاں 149۔ پنجابی اور ہریانی میں یہ طریقہ عام تھا۔ قدیم اردو میں بھی مذکر مونث دونوں کی جمع ''اں'' سے آتی تھی، فائز اور حاتم کے زمانے تک اس کی مثالیں مل جاتی ہیں:

دو بھواں تیغ جنوبی سی دراز (فائز)

لب پر گلوں کے مہر کرے ان لباں کا رنگ (حاتم)

کربل کتھا میں عربی لفظوں کی جمع الجمع بھی ملتی ہے، مثلاً مصائبوں، اصحابوں، بلغاؤں۔ اصحاب اور اقربا کو واحد بھی استعمال کیا ہے، مثلاً عجایب وقت دیکھتا ہوں، ... خویش اقربا میرا نہیں۔

تذکیر و تانیث:

بعض الفاظ جو اب مونث بولے جاتے ہیں، کربل کتھا میں مذکر استعمال ہوئے ہیں:

اے پدر جان میرا قربان تیرے۔ 46

جان[16] اپنا جان دینے والے کوں سونپا۔ 103

ایک جگہ جان کو مونث بھی لکھا ہے:

کیا گلی میں محبت کی اپنی جان نثار۔

بعد تیرے پناہ ہمارا کون ہوے گا۔ 47

جوں یہ فریاد و فغاں لڑکی کا گھر سے بلند ہوا۔ 94

---

16 اودھ کے قصبات میں عورتیں آج بھی جان (بمعنی جسم) بولتی ہیں۔ جیسے بچے کا سارا جان نیلا ہو رہا ہے یا اُس کے سارے جان میں دانے پڑ گئے ہیں۔ (ع۔ص)

قتل علی پر کمر باندھا۔
ملعون نے قبول کیا اور سوگند کہایا۔
غرض میرا بدلے سے نہ تہا۔

اسی طرح کنٹھ، راہ، اصل اور پرواز جواب مذکر استعمال ہوتے ہیں، کربل کتھا میں مونث ملتے ہیں۔

(ج) نحوی

فعل جمع مونث:

اردو میں فعل تذکیرو تانیث اور واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق آتا ہے۔ کربل کتھا کی زبان اس سلسلے میں دو خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ ایک یہ کہ مفرد فعل مونث کی جمع ''ں'' سے نہیں ''یاں'' کے اضافے سے بنائی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ علامت مستقبل بھی اس اصول کے تحت 'گی' سے 'گیاں' ہوجاتی ہے:

اندر سے کئی عورتیں نکلیاں۔ 57

اے کاش مدینہ میں دادا کی قبر پر ہوتیاں تا درد دل اپنا اوس قبر سے کہتیاں۔ 62

رو رو بانو کے تیئں دیکہلاتیاں۔ 124

بہنیں بہی تیری بلکتیاں پانی بن۔ 125

خاک سر پر اوڑاتیاں تہیں۔ 115

ہم بغیر تیرے دنیا میں کیوں کر پہریں گیاں اور بغیر تیرے دیدار کے کیوں کر زندگی کریں گیاں۔ ہائے بابا کیا کریں گیاں ہم دو کہیاریاں۔ 62

اسی طرح فعل مونث مرکب میں فضلی دونوں جزو کو جمع کرکے لکھتا ہے، مثلاً چھوڑتی تھیں کے بجائے چھوڑتیں تھیں، کہتی تھیں کے بجائے کہتیں تھیں، اڑاتی تھیں کے بجائے اوڑاتیاں تھیں وغیرہ۔

اعرابی حالتیں :

اضافی حالت : اردو میں حرف اضافت عموماً مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان واقع ہوتا ہے لیکن کربل کتھا میں عربی فارسی کی تقلید میں یہ وضع قائم نہیں رہی اور مضاف و مضاف الیہ ایک ساتھ لائے جاتے ہیں اور حرف اضافت ان کے بعد آتا ہے۔ یہ صورت حال فارسی عبارت کے لفظی ترجمے سے پیدا ہوئی ہے اور اس کا اثر بعد کے نثری نمونوں میں بھی مل جاتا ہے۔ کربل کتھا میں جہاں توصیفی حالت میں یا فاعل و مفعول کے اظہار کے لیے حرف اضافت دو بار آیا ہے، وہاں دونوں حروف مضاف اور مضاف الیہ کے بعد ایک ساتھ آئے ہیں، جیسے کے کی، کی کی، کا کے وغیرہ۔

ایسا شکور بے زوال کہ عام ہیں عطیات اوس کے۔ 16
آگ عشق اوس کے کی بیچ انگیٹھی سینۂ پر کینہ میں روشن ہوئی۔ 19
ایسا احد کہ دلیل احدیت اوس کی لم یلد ولم یولد ہے۔ 16
جب لگ خواقین بیچ میدان مملکتِ لایزال اوس کی کے پانو سکونت سلوک راہ بندگی کا نہ رکھیں۔ 17

فارسی اور دیسی لفظوں میں اضافت بھی ملاحظہ ہو :

بحرِ دوکھہ۔	مانند کھیل۔
کپڑۂ حریر۔	سیسِ فرزند۔
صحنِ گھر۔	سمِ گھوڑا۔

اضافی و مجروری : اسی طرح اگر اضافی اور مجروری حالت کسی جملے میں ایک ساتھ واقع ہو تو حرف اضافت 'کے' اور حرف جار 'سے' ایک ساتھ آتے ہیں :

بعد از واقف ہونے سب احوالِ شہادت آلِ جگر گوشہ ہائے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سے۔ 27
ایک فرزند فرزندانِ بزرگوار اوس کے سے ... دشتِ کربلا میں شربت

شہادت کا چکھے گا۔ 26
آواز اس کی سے ڈرے اور لرزے۔ 46

اضافی و فاعلی : جب مشیتِ بے علت اوس کی نے بیچ تمشیت امور ایجاد و تکون کے تعلق پکڑی۔ 16
ابتدائے سنِ رشد اور تمیز سے تا اب لگ کہ سنِ عزیز اوس کے نے حدودِ عشرین سے دو تین منزل تجاوز کیا ہے۔ 27
سپاہ اوس کی نے جس طرف منہ دیکھایا۔ 25

اضافی و ظرفی : ایسا بادشاہ ... کہ ... عناں ... عدالت بیچ ملک ہندوستان کے ... قبضۂ درایت اوس کے میں آئی۔ 25
ہمیشہ ... تصریح کرنے حکایتوں اخبار حضرت امام حسین علیہ السلام کی میں مائل و راغب رہتا تھا۔ 27

مفعولی حالت : مفعولی ثانوی حالت میں جہاں ''کے لیے'' کے بجائے ''کے واسطے'' کا استعمال ہوا ہے وہاں 'واسطے' اسم یا ضمیر سے پہلے آیا ہے، یعنی بطور لاحقے کے نہیں بلکہ سابقے کے:

واسطے اس خون کے کہ ہمارے تن سے گرا ہے۔ 37
بہشت واسطے اس کے ہے۔ 40

ظرفی حالت : ظرفی حالت میں دو خاص حروف بیچ اور اوپر استعمال ہوئے ہیں، جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ یہ بھی لاحقے کی حیثیت سے نہیں بلکہ سابقے کے طور پر آئے ہیں:

جب مشیتِ بے علت اوس کی نے بیچ تمشیت امور ایجاد و تکون کے تعلق پکڑی۔ 16
جب لگ خواتین بیچ میدان مملکت لایزال ... 17
اوپر ضمیر اربابِ فضل اور اصحابِ دانش کے مبین اور مبرہن ہوجیو۔ 31

ذیل کے جملے میں اوپر کے تقریباً تمام نکات کی مثالیں مل جائیں گی:

حمد بے غایت اور بے نہایت شائستہ و سزاوار اوس کبریاے واجب الوجود کوں کہ بزرگی صفات کمال اوس کی کی درک افہام سے مبرا ہے، اور ... کمال صفات جلال اوس کے کا احاطۂ اوہام سے معرا، عقل عقلاؤں کی درک کرنے حقیقت ذات اور صفات اوس کی سے بیچ مضیق عجز و قصور کے اور فہم بلغاؤں کے پاونے بھید بلاغت اور فصاحت اعجاز کلام مجید اوس کے سے بیچ مقام حیرت و فتور کے، ذات پاک اوس کی بیچ ہر جہت کے یہ حقیقت موجود ہے، اور حقیقت ہر موجود کی بیچ پر تو نور وجود اوس کے کے نابود۔ 15

حذف حروف :

اضافی کی	: جہان روشن اوس آنکھوں آگے اندھیرا ہوا۔ 110
مفعولی کو	: یہ کہہ جان جان آفرین سونپا۔ 128
مفعولی ثانوی کے	: ایک فاتحہ مخفی اس کام با نظام لیے ہی پڑھا۔ 29
	حق تعالیٰ بہشت میں مکان نیک اوس لیے برہا کرے۔ 39

سببی سے : سببی حالت میں 'سے' کے حذف سے اسم میں ''وں'' کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ خصوصیت کھڑی اور پنجابی میں مشترک ہے :

ہم بے کسوں کوں پیاسوں مت تپا۔ 108

پیاسوں آوتی ہے مجہ آنہکوں میں اندھیاری۔ 118

یہ انداز بیان جدید اردو میں بھی ملتا ہے۔ میں نے اسے آنکھوں دیکھا۔ وہ بھوکوں مر گیا۔

فاعلی نے : اردو میں قاعدہ ہے کہ اکثر فاعلی حالت میں فعل متعدی کے ماضی مطلق، تمام، احتمالی اور حال قریب کے ساتھ علامت فاعلی 'نے' استعمال ہوتی ہے۔ کربل کتھا میں 'نے' کا وجود تو ملتا ہے، لیکن اس کا استعمال خاصا بے قاعدہ ہے اور اکثر و بیشتر اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ شمالی ہند کی جن بولیوں سے اردوئے قدیم کا خمیر اٹھا تھا،

ان میں علامت فاعلی 'نے' پنجابی اور کھڑی بولی سے مخصوص ہے۔[17] پوربی ہندی اور برج بھاشا میں اس کا وجود نہیں۔ ہریانی اور گجراتی میں 'نے' مفعولی اور فاعلی دونوں حالتوں میں آتا ہے مگر اردو میں یہ فاعلی حالت سے مخصوص ہے۔ کربل کتھا میں 'نے' کے استعمال میں جو بے ضابطگی ملتی ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خود کھڑی بولی میں وسط اٹھارھویں صدی تک 'نے' نے علامت فاعلی کی شکل میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔

ماضی مطلق میں 'نے' کے استعمال سے اصل فعل لازم ہی کے طریقے پر آتا ہے، یعنی مادۂ فعل پر اضافۂ الف کی شکل میں، جیسے اس نے کہا، انھوں نے فرمایا، لیکن کربل کتھا میں جہاں جہاں 'نے' استعمال نہیں ہوا، مادۂ فعل پر اضافۂ الف کے بجائے اضافۂ ''ے'' یعنی مضارع سے کام چلایا گیا ہے، جیسے وہ فرمائے، وہ کہے، وغیرہ۔ چنانچہ پہلی حالت میں وحدت و جمع اور تذکیر و تانیث کا فعل پر کوئی اثر نہیں ہوتا جبکہ دوسری حالت میں مندرجۂ ذیل صورتیں حاصل ہوتی ہیں :

غائب	واحد	جمع
مذکر	وہ فرمایا	وہ فرمائے
مونث	وہ فرمائی	وہ فرمائیں

یعنی 'نے' کے حذف سے واحد، جمع، مذکر و مونث کی صورتیں مختلف ہوگئیں۔ کربل کتھا میں یہ سب استعمال ہوئی ہیں، لیکن زیادہ تر جمع مذکر ہی ملتی ہے جو بنیادی طور پر مضارع سے مختلف نہیں :

جمع مذکر : پھیر فرمائے اوس آگے۔ 3

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرمائے۔ 37

جوں نظر حضرت کی مجھ پر پڑی، فرمائے۔ 40

پاس اپنے بٹھلا فرمائے۔ 40

---

17 'نے' کے بارے میں میرا خیال ہے کہ پنجابی لفظ ''نوں'' اصل تھی جس نے اردو میں داخل ہوکر ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ (ع۔ص)

حضرت امیر دروازۂ مسجد کوفہ میں پہونچ، گھوڑے سے اتر، قدم مسجد میں رکھے اور نماز ادا کر منبر پر سدھارے اور ایک خطبۂ الٰہی اور نعتِ رسالت پناہی ادا فرما، حاضروں کو عذابِ الٰہی سے ڈرائے اور ثوابِ جاودانی سے امیدوار کیے پھر منبر کے داہنی طرف دیکھے، حضرت امام حسن کوں دیکھ پوچھے۔ 58

حضرت نگاہ دوڑا دیکھے۔ 128

سلام کہے۔ 54

پھر پیشانی دونوں کی چوم رخصت کیے اور فرمائے۔ 45

واحد مونث: تب حضرت فاطمہ فرمائی۔ 43

جوں دولہن وہ آوازِ جاں نواز سونی، خیمہ سے باہر دوڑ کہی۔ 108

فاطمہ کہی۔ 53

کچھ جواب نہ سونی، پھر رو کر کہی۔ 53

جمع مونث: زینب کہیں۔ 132

شہر بانو اوٹھیں اور ایک خلعت قیمتی شیریں کو پنہائیں۔ 165

سکینہ کہیں۔ 132

حضرت فاطمہ یہ خبر وحشت اثر سن رونے لگیں اور کہیں۔ 46

استعمال نے: شاہزادوں نے کہا اے اسما کبھو دیکھا ہے توں نے کہ بغیر ماں کھانا کھائے ہیں۔ 53

جوں حضرت فاطمہ نے یہ بات سونی۔ 44

حضرت نے فرمایا۔ (45، 46، 39، 43)

کربل کتھا میں استعمال 'نے' کی مثالیں کم ہیں اور عام طور پر اسے حذف کردیا گیا ہے۔ حذف 'نے' کا یہ انداز قدیم اردو اور دکنی زبان میں مشترک تھا۔ حامد حسن قادری نے کربل کتھا کی اس لسانی خصوصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فضلی کو ''دکنی

الاصل'' قرار دیا ہے۔[18] اوپر کی بحث سے واضح کیا جا چکا ہے کہ متعدی افعال کی ماضی مطلق میں جمع مذکر کے لیے مضارع کا استعمال دکنی سے مخصوص نہیں، یہ نتیجہ ہے محض علامت فاعلی 'نے' کے استعمال میں بے قاعدگی کا جو دہلوی اردو میں بھی میر و سودا کے زمانے یعنی شروع انیسویں صدی تک پائی جاتی تھی۔ حاتم کی ایک غزل کی ردیف ہے: 'ہیں ہم' اور قوافی کیے، دیے، پیے ہیں۔ فائز کہتے ہیں: ایک دیکھی میں بھنگیرن دلربا۔ میر کا مصرع ہے: گل کو محبوب میں قیاس کیا۔ چنانچہ کربل کتھا میں حذف 'نے' کی بنا پر یہ قیاس کرنا کہ فضلی دکنی الاصل تھے یا ان کا بچپن دکن میں گزرا تھا، خلاف واقعہ ہے۔

یہی معاملہ مراثی میں متحرک حروف کو ساکن کر لینے، نون کو تقطیع میں حذف کر دینے، ہائے ہوز کو دبا دینے اور مشدد حروف کو سہل کر لینے کا ہے۔ ان امور میں دکنی کی تخصیص نہیں۔ فضلی کا زمانہ شمالی ہند میں اردو شاعری کے دور اول کا ہے اور اس وقت شاعری میں یہ عجز زیادہ قابل اعتراض نہیں سمجھے جاتے تھے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ فضلی نے مراثی لکھے ہیں اور ''بگڑا شاعر'' یوں بھی ان پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

ضمائر:

بعض حالتوں میں ضمائر کی منصرف صورتوں میرے، ہمارے، تمھارے وغیرہ کے بجائے مجہ، تجہ، اور ہم استعمال ہوئے ہیں:

تجہ جود سے عرش و فرش آئے بوجود۔ 15

تجہ لطف اگر مدد نہ کرتا یارب۔ 15

مردوں سے جو کوئی کہ پہلے حوض کوثر پر مجہ پاس پہونچے، توں ہوے گا۔ 45

مسندِ جنت بنی ہے ہم لیے۔ 60

مجہ لئے مرے گا۔ 106

---

18 داستان تاریخ اردو، بیان فضلی، ص 50-49

ہم ساتھہ محشور ہو۔ 39

کربل کتھا میں اضافی حالت میں ضمیر چونکہ مضاف کے بعد آتی ہے، اس لیے جمعیت سے متاثر ہوکر لاحقہ ''وں'' یا ''یں'' اختیار کرتی ہے۔

دریغ ان مونہوں تمہاروں سے کہ گرد غریبی سے بھریں گے اور افسوس
ان بالوں تمہاروں سے کہ غبار یتیمی سے آلودہ ہوویں گے۔ 47
باتیں میریں گرنہیں سونیں سن لو پھر پچھتاوگی۔ 137
پس قائم رکھو حکم ہماروں کوں۔ 39
نعمتوں اپنیوں کو تمہارے اوپر تمام کیا۔ 42

واو عاطفہ و اضافت :

کربل کتھا میں عربی فارسی اور دیسی الفاظ کے درمیان واوٗ عاطفہ اور اضافت بھی خوب خوب استعمال کی گئی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے :

بے جدو ماں۔ غم و دوکھہ۔ گور و گڑھا۔ یہ جان و یہ تن۔ عقل و سدہ۔

کہیں کہیں جملوں اور مصرعوں کے دو اجزا کو واوٗ عاطفہ سے جوڑا ہے مثلاً : بعدِ آں حرو اس کا بھائی شہید۔ لایا ہے وو ران تلے و بیچ ہاتھہ۔

اضافت کی مثالیں دیکھیے : دھارِ اشک۔ صحنِ گھر۔ ارادۂ لڑائی۔ بھالِ نیزہ۔ اونٹانِ بے پالان۔ بعض ترکیبیں بھی دلچسپی سے خالی نہیں : صاحبِ بھیدِ سیدالبشر۔ دکھہ کشیدہ۔ آنکھیں مبارک۔

ترتیب الفاظ :

کربل کتھا کی زبان اگرچہ عام طور پر بول چال کی زبان ہے، لیکن کہیں کہیں جملوں میں الفاظ کی ترتیب عام ہندستانی ترتیب سے قدرے مختلف ہے اور بہت کچھ عربی و فارسی کا انداز لیے ہوئے ہے۔ ہندستانی میں اسم یا ضمیر جملے کے شروع میں اور فعل ہمیشہ آخر میں آتا ہے۔ لیکن کربل کتھا میں اکثر فعل جملے کے وسط میں اور اسم یا ضمیر اس کے بعد لائی جاتی ہے۔ عربی فارسی کی تقلید میں مضاف، مضاف الیہ اور

جار مجرور کی ہندستانی ترتیب بھی الٹ گئی ہے، جس کی مثالیں اعرابی حالتوں کے ذیل میں اوپر پیش کی جاچکی ہیں۔ شمالی ہند میں یہ انداز بیان مرزا رفیع سودا، میر محمد حسین عطا خاں تحسین، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دہلوی کی نثر میں بھی ملتا ہے۔ دکنی اردو چونکہ عربی فارسی کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات سے نسبتاً آزاد تھی اس میں بخلاف شمالی ہندوستان کی نثر کے، یہ ترتیب نہیں ملتی، بلکہ وہاں فعل اکثر جملے کے آخر ہی میں آتا ہے۔ ہندستانی میں عام قاعدہ ہے کہ پہلے مبتدا، پھر خبر اور بعد میں فعل ربط، اور متعدی افعال کی صورت میں اول فاعل، اس کے بعد مفعول اور اس کے بعد فعل خبر ہوتا ہے۔ کربل کتھا کے جملوں میں یہ ترتیب اکثر قائم نہیں رہتی، کبھی خبر پہلے اور مبتدا بعد میں اور کبھی خبر بعد میں اور فعل ربط پہلے آتا ہے۔ اسی طرح فعل متعدی کا مفعول بھی اس کے متصل قبل نہیں، مابعد بھی آسکتا ہے۔ نیز صفت اور تمیز بھی موصوف، اسم صفت یا فعل سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں لائی جاتی ہے:

پیش ازیں کوئی اس صفت کا نہیں ہوا مخترع اور اب لگ ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوئی مستمع۔ 38

کس سن ہجری میں تصنیف یہ کتاب ہوئی۔ 31

ادب چوکھٹ ہماری کا بجا لایا۔ 46

خواب میں دیکھا میںنے۔ 45

روز عاشورا حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت موں گیا میں۔ 40

المسمیٰ بفضل علی و المتخلص بہ فضلی ...... کہ خوشہ چیں سب سخن فہموں کے کھلیان کا ہے۔ 26

یا الٰہی مجھ سے کیا واقع ہوئی خطا۔ 35

تجھے بھی اوس درد کا شریک کیا ہم نے۔ 35

ایسی خبروں خوشی افزا سے بوجھہ غم کا دل سے تیرے نہیں اوٹھتا۔ 48

(د) الفاظ و املا

کربل کتھا کا متن نسخۂ اشپرنگر کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کی بعض خصوصیات املا کی طرف حروف علت اور غنائی، معکوسی اور ہکار آوازوں کے ذیل میں اشارے کیے جا چکے ہیں، یعنی یہ کہ ہ اور ہائے مخلوط میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ نون اور نون غنہ میں آخری حالت میں بھی کوئی فرق نہیں۔ ٹ ڈ ڑ معکوسی آوازوں کو تین نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ت اور ٹ میں فرق نہیں۔ دیسی الفاظ میں کسرہ کے لیے یائے معروف اور ضمہ اور فتحہ کے لیے بالترتیب واؤ اور الف کا استعمال کیا گیا ہے یعنی اعراب بالحروف ظاہر کیے ہیں۔

کاتب کم سواد ہے۔ اس نے الفاظ کو کہیں توڑ کر علاحدہ علاحدہ (ڈھونڈہ تا۔ پیٹ تی۔ پہن نا) اور کہیں بلا ضرورت ملا کر لکھا ہے [آ ہمارے (آہ مارے) ظلمکی (ظلم کی)]۔ 'کے' کے بجائے 'کہ' بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔ مرکزوں اور نقطوں میں بھی کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق غشائی مسموع اور غیر مسموع آوازوں یعنی ک اور گ میں، اور یائے معروف و مجہول میں امتیاز نہیں کیا۔ اس کے علاوہ بعض دیسی الفاظ میں صفیری آواز س کو ث سے ظاہر کیا ہے۔

ذیل میں کربل کتھا سے بعض ایسے لفظ درج کیے جاتے ہیں جو موجودہ مروج املا سے مختلف انداز میں لکھے گئے ہیں:

اثی 80، 119 (اسی) ثات 7، 79، 85، 93 (سات)

مثیں 113 (مسیں)، ڈھارث 130 (ڈھارس) خواوند 86، 88 (خاوند) خانہ دان 61 (خاندان) توباہ 173 (توبہ) مردانہ گی 120 (مردانگی) سکھینہ 119 (سکینہ) دعوا 108 (دعویٰ) پیٹ تا 112 (پیٹتا)، پیٹ تی 113 (پیٹتی)، کوملہا 112 (کملا) ہیہاتہہ 4 (ہیہات) وسلچہ 163 (وصلچہ) معن 29 (معاً) خانی 28 (خوانی)۔

غریب الفاظ:

ترپہنا: 70، 91، 95، 112، 120، 128 (تڑپنا)

کہوکرا: 180 (کھوکھلا)

چھنالی: 88، 89، 102، 162 (چھین لی)

اندھلا: 67 (اندھا)

ہلکم : میں خرابوں میں خراب ہوتا پھروں ہوں ھلکم 87۔
[ہلکم: تہلکہ، ہلچل، اودھم (فرہنگ آصفیہ جلد 4، ص 724)]

ابرن : اب رنڈاپا ملے ہے دلہن کوں
نوچتی ہے وہ اپنے ابرن کوں 113

[ابرن: زیور]

پتھن : دیکھ قاسم توں اوس کی پتھن کوں
یاد کرتی ہر ایک سخن تیرا 113

[پتھن : بے قراری، اضطراب]

اوکنا : اوکتا قے کرتا رہا۔ 67
[قے کرنا، استفراغ کرنا، زمین دیکھنا، جی برا کرنا، آصفیہ، جلد اول، ص 218]

پلچنا : ایدھر قاسم کی ماں لاش سے پلچی اور مونہہ سے مونہہ مل کہتی تھی۔ 113
[گتھنا، لپٹنا، چمٹنا، آصفیہ اول ص 411]

الچھوں : تجھہ کوں پائی تہی دو کہیا اے بچے
ھائے کن الچھوں کن مرادوں سے 114

تل اوپر کرنا: تمام لشکر کوں تل اوپر کر پراگندہ کیا۔ 102
لشکر کوں تل اوپر کر پھرا۔ 126 [تلے اوپر کرنا]

کاھلا : اسمانے کہا ماں کا جیو کاھلا ہے۔ 53 [کاھلا شاید کاہل سے ہے، بمعنی بیمار]

نجھانا : میرا شفیق پدر مر گیا نجھاتی قبر۔ 51
سبھوں نے جو نجھا کر دیکھا۔ 167

اس سرکوں تنور سے نکال نجھا کر دیکھی۔ 154
جب خوب نجھا کر دیکھا تو سر امام حسین ہے۔ 158
نجھاتی ہوں وہ مچھاتی جوانی۔ 150
جو تیری لوتہہ مچی کوں نجھا۔ 113
[نجھانا: غور سے دیکھنا، تکنا (پلیٹس 1125)]

مچھاتی : اوس بھتیجے نوجوان کی مچھاتی لاش جب ...۔ 112
میرے بنے کی مچی لاش دیکھائی۔ 114
[مچھانا: مستی کے جوش میں آنا، گرمانا، آصفیہ جلد 4، ص 300]

بہونڈ پیری: اے لوگو میں بہونڈ پیری تہی کیا جو میرے آتے دولہا موا۔ تہی مجہ قدم ہی کی یہ بورائی۔ 114
[(واو لکھا جاتا ہے پڑھا نہیں جاتا)۔ لکھنؤ۔ منحوس، سبز قدم (نوراللغات ج اول، ص 703)]

ھتھواسنا : ڈھال ھتھوانسے کر پہر اوس ... پر حملہ کیا۔ 110
[تلوار سونتنا، قبضے پر ہاتھ ڈالنا۔ آصفیہ جلد 4، (ص 700)]

ھڑکنا : دودہ بن اس شیر خوارے کا ھوڑکنا دیکھیے۔ 130
[بچوں کا کسی چیز کو یاد کرنا، کسی چیز کی جدائی میں بچوں کا مغموم اور افسردہ ہونا۔ آصفیہ، ج 4، ص 714]

گہگیانا : مظلوموں نے گہگیا کر کہا 89
[(الف) گھگی بندھ جانا۔ خوف یا ڈر کے مارے سکتہ کا عالم ہونا۔
(ب) گڑگڑانا۔ عاجزی کرنا۔ منت سماجت کرنا۔ (آصفیہ، جلد چہارم، ص 133)]

ڈاک لگنا: تمام رات ڈاک سے بے قرار رہے۔ 67
درد پیٹ کا امام کوں شروع ہوا، زمین پر لوٹنے لگے اور ڈاک نے غلبہ کیا۔ 70

[متواتر قے ہونا، آصفیہ، جلد دوم، ص 318

کیا پیوں میں ہجر میں ساقی کہ لگ جائے گی ڈاک
بس گلو میرا بھی شیشے کا گلو ہوجائے گا

ناسخ

(سرمایۂ زبان اردو، جلال لکھنوی)

معاون الشعرا میں پہلا مصرع یوں ہے:
ع کیا پیوں میں ہجرِ ساقی میں کہ لگ جائے گی ڈاک
لیکن اصل شعر یوں ہے:
کیا پیوں مے ہجرِ ساقی میں کہ لگ جاوے گی ڈاک
بس گلو میرا بھی شیشے کا گلو ہوجائے گا

(دیوان ناسخ دوم، ص 32، طبع کانپور، 1907)

تیرہ تیزی: تیرہ تیزی کی بیسویں تاریخ کہ وہ دن حضرت کے چہلم کا تھا (191، 29، 71) [تیرہ تیزی: ماہ صفر جس کی تیرھویں تاریخ بری مانی جاتی ہے]

ھٹ پٹانا: پڑے گا چین تبھی جب کہ باپ کی گودی
مجھے ملے گی میرا جیو ھٹ پٹا تا ہے 186

سار : توں سار پیاسے کی کیا جانے ھے کمار فرات 119 [سار: قدر، قیمت، منزلت، آصفیہ 3، ص 6]

انا کانی دینا: میں رحم کرکے دیوں ھوں جیتی انا کانی
یہ باز آتے نہ میرا غضب ھی بہاتا ہے 189
[اغماض کرنا، جان کر انجان بننا، سنی ان سنی کرنا، ٹال جانا]
دل میں کیا ہے کیا نہیں پر کان سے غیروں کا ذکر
سن کے اس نے اے ظفر کچھ آنا کانی دے تو دی

(آصفیہ، جلد اول، ص 150)

نال : اس مجلس نویں میں شہادت پڑھوں ھوں میں

عباس علی محمد انس کی کہ نال ہے 116
[پنجابی، نال بمعنی ساتھ: آصفیہ 4، ص 534]

خرفت ہونا: مرد پیر ھے اور خرفت ھوا ھے۔ 154
[خرفت: (ع) صفت۔ وہ شخص جو پیرانہ سالی سے بدحواس ہوگیا ہو۔ مہمل، بے ہودہ۔ (فقرہ) یہ خرف گفتگو مجھے پسند نہیں۔ (نوراللغات، ج دوم، ص 489)]

کلکلانا: ام کلثوم نے کلکلا کہا۔ 162
[بدمزاج اور ترش رو ہونا، آصفیہ، جلد سوم، ص 543]

الہا: لوھو کے الہے میں مونہہ اپنا چھو پایا۔ 162
[آلہا: طاقچہ]

اوٹنا: ایک اصغر طرف اوٹے تہا جگر 123 [جوش کھانا، غصہ میں جلنا، آصفیہ اول، ص 234]

ایانی: اب آئی ھوں گی عقل وسدہ سے ایانی۔ 152
[ایانی: سیانی کی ضد]

گہکنا: ... کہ دوڑے گہک شامی سب ایک باری۔ 152
[گہکنا: تیز آواز سے بولنا، نہایت تپاک اور گرم جوشی سے کلام کرنا، آصفیہ 4، ص 133]

بوھارنا: پلکوں سے تج کوں بوھارے جا بہ جا
تیری اب جاروب مجہ مژگان ھے 123
[بہارنا: جھاڑنا، جھاڑو دینا، صاف کرنا، آصفیہ 1، ص 320]

چیتا ھونا: دشمنوں کے ھوئے ھیں اب چیتے
شیر نر باپ کے کہاں گیا تو 127
[چیتا: فہم، عقل، خیال۔ آصفیہ 2، ص 149]

کلول ٹلنا: ھاں ماں جایا ھمارا ھم سے کل

بچھڑے گا کیوں کر یہ کلول جاوے ٹل 98
[آفت و بلا رفع ہونا، مصیبت دور ہونا:
ہمیں غش آ گیا تھا وہ بدن دیکھ
تری کلول ٹلی ہے جان پر سے
(آصفیہ 3، ص 545]

انچ : کربل کتھا میں یہ لفظ کھینچ کے معنی میں 38 بار استعمال ہوا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے: ''کھینچنا، کشش کرنا، گھسیٹنا، تاننا، کسنا، اپنے ذمّہ لینا، ضامن ہونا، اوٹنا'' (جلد اول ص 242)۔ دو مرکب الفاظ، اینچا تانا: ''ایک طرح کا بھینگا'' اور اینچا تانی: ''کشاکش، لڑائی جھگڑا'' میں بھی یہ جزو اول کے طور پر آتا ہے۔ جدید اردو میں اینچنا یعنی کھینچنا مستعمل نہیں، گو علاقۂ جامع مسجد دہلی کی عوامی کرخنداری بولی میں یہ ابھی تک اس معنی میں بولا جاتا ہے اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع میں 'کھینچنا اینچنا' یعنی بطور تابع مہمل استعمال ہوتا ہے۔ کربل کتھا سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

جواہر الفاظ چون کر بیچ رشتہ بیان کے اینچے۔ 15
پانوں میری زیارت سے نہ اینچیو۔ 53
سلام مجہ، دل جلے کا اور غم و دوکھہ اینچے ہووے کا عرض کیجیو۔ 54
آگ دشمنی اس کی نے شعلہ اینچا۔ 58
آہ دردناک اپنے جگر جلے سے اینچے۔ 136
یحیٰ ذوق محبت سے شمشیر اینچا۔ 163

کربل کتھا میں پراکرتوں کے مندرجۂ ذیل الفاظ بھی ملتے ہیں جو اب اردو میں متروک ہو چکے ہیں:

جیو، 53 (جی) بہیتر 97 سٹ، 8 (چھینک) چنگے: ''جو ہیں بیمار چنگے ہوویں سب'' 8 نپٹ، 12 (بہت، پوری طرح سے) تج 4 سیس 5 نین 2 موندنا 46 بسرام 12

جگ 22 نت 27 لوتھہ، 151 (لاش) رن 121 جیبھہ 118 ندان، 117 (بعد میں، پیچھے) رن سینگی 99 (جنگ کا نقارہ) اندھیار، 117 (اندھیرا) انجو 118 (آنسو) گہنیرا، 120 (بہت، گھنا) بہوئین، 120 (زمین) دوھاگن 105 (ضد سہاگن) سوھائی، 114 (راس آئی)۔

(1961) (طبع اردو کراچی، اپریل 1968)

O

اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی

اردو کا آغاز کہیں سے بھی ہوا ہو، لیکن اس امر پر سب ہی متفق ہیں کہ اردو نے عوامی زبان کی حیثیت سے دہلی میں پرورش پائی اور یہیں اس کی مقبولیت کو چار چاند لگے۔ شہر دہلی جسے تاریخ کے ہر دور میں مختلف مذہبوں، زبانوں اور تہذیبوں کے سنگم ہونے کا شرف حاصل رہا، اردو زبان کا بھی گہوارہ بنا۔ ملک کے مختلف حصوں اور دور دراز علاقوں میں اردو کی ترویج کا سہرا بھی اہل دہلی ہی کے سر رہا ہے، جہاں یہ ہر دور میں حالات سے مطابقت پیدا کرتی اور پھلتی پھولتی رہی ہے۔ ملک کے دور دراز علاقوں اور مختلف طبقات میں استعمال کے باعث اردو کی بہت سی علاقائی اور طبقاتی شکلیں پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً اردوئے معلیٰ، دہلوی اردو، دکنی اردو، لکھنوی اردو، بیگماتی اردو، کرخنداری اردو وغیرہ۔

معیارِ زبان کے تعین کا عمل دراصل دہرا عمل ہوتا ہے۔ مقامی بولیاں ادبی زبان کو ذخیرۂ الفاظ فراہم کرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے بعض مسلسل استعمال کی بنا پر معیاری حیثیت حاصل کرلیتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ اردو کی بولیوں کا ابھی تک تعین نہیں ہوسکا۔ ابھی یہ مسئلہ ادبی زبان اور علاقائی بولیوں کے لین دین کے درمیان ہی اٹکا ہوا ہے۔ کسی بھی خطے میں زبان کے علاقائی اختلافات غیر محسوس نہیں رہے، لیکن ان اختلافات کی اہمیت کا صحیح تعین نہیں کیا جاسکا۔ اس کا واضح سبب ہے اور وہ یہ کہ ابتدا سے ہی اردو زبان کی باگ ڈور معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے ہاتھ میں رہی۔ غلط یا صحیح، یہ بھی تسلیم کیا جاتا رہا کہ صحیح یا معیاری زبان وہ ہی ہے جو بادشاہ، امرا اور علما استعمال کرتے ہیں۔ اردو کی پہلی لغت ''غریب اللغات'' میر عبدالواسع نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد (1707-1658) میں مرتب کی۔

فاضل اجل سراج الدین علی خانِ آرزو نے اس کو محض اس لیے شدید اعتراضات کا نشانہ بنایا کہ اس میں ''اصل'' زبان کی نمائندگی نہیں کی گئی تھی، اور خود 1751 میں ''نوادرالالفاظ'' کے نام سے اسی لغت کو ترمیم وتخذیف و اضافہ کے ساتھ مرتب کیا۔ اس میں خانِ آرزو نے میر صاحب کے بعض مندرجات کو ازراہِ حقارت ''زبان جہال'' اور ''زبانِ وطنِ صاحبِ رسالہ'' کے الفاظ سے یاد کیا۔ اس میں شک نہیں کہ خانِ آرزو نے بڑی کاوش سے ''نوادرالالفاظ'' میں بہت سے مزعومہ معیاری الفاظ شامل کیے لیکن یہ امر بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اردو بولنے والوں میں یہ الفاظ مسترد ہوکر زبان باہر ہوگئے۔

بلاشبہ اٹھارویں صدی کے دہلوی شعرا کا رجحان اس سلسلے میں بڑا عوام پسند تھا کیونکہ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات کے لیے عوامی زبان ہی کو ذریعہ بنایا۔ شاہ حاتم نے اپنے مجموعۂ کلام ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں اس بات کی وضاحت کی کہ انھوں نے روزمرہ دہلی کا استعمال کیا ہے، جو خواص پسند اور عام فہم ہے:

> ''روزمرۂ دہلی کہ میرزایانِ ہند و فصیح گویانِ رند در محاورہ آرند منظور داشتہ ...... فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار کردہ''۔

اگرچہ سودا، میر، درد، حاتم، تاباں، فغاں، یقین، سوز، میر حسن اور ان کے ہم عصر دیگر شعرا نے بعض قدیم الفاظ کو ترک کردیا، لیکن انھوں نے اپنے تخیل کی پرواز کے باوصف اپنے قدم زمین سے نہ اکھڑنے دیے اور عوامی زبان ہی کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ میر کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ سعدی و خاقانی کو بغیر لغت کے سمجھنا دشوار ہے، مگر میرے کلام سے ہر وہ شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جو جامع مسجد کے روزمرہ سے واقف ہو۔ لیکن زبان کے سلسلے میں یہ عوام پسند رجحان زیادہ عرصے تک قائم نہ رہا۔ اردو شاعری کے دبستان لکھنؤ کے آغاز کے ساتھ زبان عوامی ڈگر سے دور ہونے لگی اور زبان کی لچک ختم ہوکر جمود طاری ہوتا گیا۔ انشا کی ''دریائے لطافت'' (1808) ہندوستانی نژاد مصنف کی اردو قواعد پر پہلی تصنیف ہے۔ انشا دہلی ہی سے لکھنؤ پہنچے تھے لیکن انھوں نے ہی سب سے پہلے ''دریائے لطافت''

میں دہلی کی عام بول چال کی زبان کے مقابلے میں فارسی زدہ اردو کی تائید وحمایت کی۔ دہلوی زبان کے معاشرتی اور مقامی تنوع نے انشا کے اوچھے تمسخر کے لیے کافی مواد فراہم کیا اور انھوں نے دہلی کے سادات، پنجابیوں، افغانوں، کشمیریوں اور دوسرے طبقات کی زبان پر بے دردی کے ساتھ نکتہ چینی کی۔ دہلی کے ایک خاص علاقے کی زبان کا بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسا جانور ہے جو آدھا کتا ہے اور آدھا ہرن (اورنگ آباد ایڈیشن ص 33)۔ مقامی اور طبقاتی بولیوں کے بارے میں اس حقارت آمیزی اور مرصع زبان کی پسندیدگی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کی معراج ناسخ اور اس کے شاگردوں — رشک، بحر، برق، قلق، اختر، سحر، اسیر، منیر، تسلیم وغیرہ اور اس دور کے دوسرے اساتذہ کے یہاں ملتی ہے۔ اس رجحان کی بدترین مثال رجب علی بیگ سرور (فسانۂ عجائب) خواجہ فخرالدین حسین (سروشِ سخن) جعفر علی شیون (طلسمِ حیرت) وجاہت حسین (اختلاف اللسان) سید احمد دہلوی (محاکمہ مراکزِ اردو) اور سجاد مرزا بیگ (تسہیل البلاغت) کی حریفانہ تحریروں میں ملتی ہے۔

اردو کے شیدائیوں میں یوپی اور پنجاب کا تنازعہ بھی دراصل زبان کے مقامی اور علاقائی تغیرات اور خصائص کو نظرانداز کردینے ہی کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان کی تاریخ کا یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے کہ اہل لکھنؤ نے دہلوی زبان کی مذمت کی، لیکن پنجابی اردو پر یورش کرنے میں دہلوی اور لکھنوی دونوں ہی دبستاں ہم آواز ہوگئے۔ زبان کے ان دونوں مراکز (پنجاب اور دہلی و لکھنؤ) کے درمیان ایک عرصے تک لفظی جنگ چلتی رہی۔

آزادیِ ہند نے ان تنازعات اور اختلافات کو ایک حد تک دبا دیا۔ جدید ہندستانی زبانیں صدیوں کی نیم خفتگی کے بعد اب کروٹ لے رہی ہیں، بیدار ہورہی ہیں۔ اردو بھی اس عمل میں شریک ہے۔ ادبی میدان میں کافی چہل پہل نظر آتی ہے۔ لیکن زبان کے سائنٹفک مطالعے اور معروضی تفہیم کی ابھی تک کمی ہے۔ اردو کی علاقائی بولیوں کا تفصیلی جائزہ لینا ابھی باقی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے

دکنی اردو کا صوتیاتی مطالعہ کیا اور اپنی اس علمی تحقیقات کو 1930 میں پیرس سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس وقت سے علاقائی زبانوں کی طرف توجہ نہیں دی گئی، اور یہ ابھی تک بے توجہی کا شکار ہیں۔ عام طور پر ان کو زبان کی ادنیٰ شکل تصور کیا جاتا ہے۔ ادبی اردو کے مقررہ قوانین اور ضابطوں سے سرِ مو انحراف بھی سخت ترین اعتراضات کا نشانہ بنتا ہے۔

وقت آگیا ہے کہ مصلحین اور ہمدردانِ اردو علاقائی بولیوں کی اہمیت کو محسوس کریں۔ زبان کا ماخذ کچھ بھی رہا ہو، لیکن اگر اس زبان کو زندہ رہنا ہے تو اس کی جڑیں کسی نہ کسی علاقائی بولی میں ضرور پیوست ہونی چاہئیں۔ سی ایف ہاکٹ کے الفاظ میں ''علاقائی بولی (Dialect) کا محل استعمال یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگ 'علاقائی بولی' بولتے ہوں اور کچھ دوسرے اصل زبان۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی علاقائی بولی بولتا ہے''۔ اس خیال کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں کہ ادبی تحریریں زبان کو وجود بخشتی ہیں، بلکہ زبان کا عوام سے رابطہ ہی زبان کی زندگی اور شادابی کا ضامن ہے اور زبان کو محاورات کے لامحدود خزانے سے مالا مال کر دیتا ہے۔

اردو کی یہ بدقسمتی ہے کہ معیار سازی کے جوش میں اس کے ہمدردوں نے اس رشتے کو نظر انداز کر دیا جو زبان اور اس کے بولنے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ صدیوں پرانے قواعد کے ضابطے آج بھی مسلمات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ نثر و نظم کی زبان کو آج بھی انھیں فرسودہ ضابطوں پر پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علاقائی اثرات کے اختلافات کو خلافِ قواعد اور خلافِ محاورہ کہہ کر رد کیا جاتا ہے۔ ہم محض زبان کی خاطر عصری تقاضوں اور زمانے کے رجحانات کو پس پشت ڈالتے رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ زبان کے ضابطوں کی تنقیح کی جائے، ضرورت ہے کہ فرسودہ اور بے جان ضابطوں کو مسترد کیا جائے اور ضرورت ہے کہ نئے تقاضوں کے مطابق نئے اصول معروضی طور پر وضع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں سر جارج گریرسن کا قول قابل ذکر ہے:

''زبان کو قواعد کے سانچوں میں نہیں ڈھالا جاسکتا، بلکہ قواعد کی ترتیب زبان

کے مطابق ہونی چاہیے۔ اصلاح پسندی کا یہ رجحان بہت غلط ہے کہ کسی مناسب محاورے کو خواہ وہ اسی ماحول کی پیداوار ہو، محض اس لیے مسترد کردیا جائے کہ سابق مصنفین نے اس کا استعمال نہیں کیا''۔

ہم اردو والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ ذہن انسانی ترقی پذیر اور متحرک ہے۔ اور ''ادبی زبان میں جو کچھ غلط خیال کیا جاتا ہے، 'گنوارو' بولی میں بلاپس و پیش قابل قبول ہوسکتا ہے اور آج جس چیز کو 'گنوارو' خیال کیا جاتا ہے کل وہ ہی صحت کا درجہ حاصل کرسکتی ہے''۔ (آئی جے ایس تاراپوروالا)

مدعا یہ نہیں کہ قواعد اور ضابطوں کو یکسر ختم کردیا جائے اور معیار بندی کو بالکل ترک کردیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ علاقائی بولیوں کی طرف معقولیت کے ساتھ اور سائنسی انداز میں توجہ کی جائے تاکہ زبان عوامی جڑوں سے دور نہ ہونے پائے۔ یہی جذبہ کرخنداری اردو کے اس مطالعے کا محرک ہے جسے میں نے اپنی انگریزی کتاب میں پیش کیا ہے۔[1]

کرخنداری پرانی دلی کی گلیوں میں بولی جاتی ہے جس کا انداز اور روزمرہ کچھ اپنی ہی شان رکھتا ہے۔ کرخنداری اردو صرف کارخانوں میں کام کرنے والوں کی زبان نہیں بلکہ ہاتھ کا کام کرنے والے یا مختلف پیشوں میں مصروف لوگ اکثر و بیشتر اس بولی میں بات کرتے ہیں۔ اسے اگر پرانی دہلی کی عوامی بولی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نیچہ باندھنے والا، سقے، بہشتی، کنجڑے، ٹھٹھیار، سنار، لوہار، معمار، بڑھئی، نان بائی، قصائی، دُھنیے، رفوگر، گاڑی بان، تیل والے، جھلّی والے، جلد ساز، ٹھیلے والے، تانگے والے، رکشا والے، تنبولی، حلوائی، چمڑا فروش، چوڑی فروش، پرانی دہلی میں سبھی اسے نوازتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی سماجی بولی ہے کاریگر اور محنت کش طبقے کی۔ پچھلے دو تین دہوں میں دہلی کی دنیا بدل گئی ہے۔ آبادی کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ لیکن اب بھی فصیل کے اندر کی دہلی کی گلیوں میں جائیے تو کرخنداری کی کھنک سنائی

1۔ Karkhandari Dialect of Delhi Urdu، منشی رام منوہر لال، دہلی 1961

دے گی۔ کرخنداری کے علاقے کی موٹی حدبندی یہ ہے۔ شمال میں چاندنی چوک، جنوب میں آصف علی روڈ، مشرق میں فیض بازار اور مغرب میں لاہوری دروازے والی سڑک۔ اس بولی کے بولنے والوں کا زیادہ جماو جامع مسجد اور لال کنواں کے علاقوں میں ہے یعنی چتلی قبر، کوچہ چیلان، کلاں محل، ٹمیا محل، بھوجلا پہاڑی، چوڑی والان، پہاڑی املی، ٹوکری والان، سوئی والان، پھاٹک تیلیان، بلبلی خانہ، محلّہ قبرستان، گلی شہ تارا، کوچہ پنڈت، محلّہ رود گراں، فراش خانہ، گلی بتاشاں۔ لال کنواں کے شمال مشرق میں گلی قاسم جان، بازار بلی ماران، حویلی حسام الدین حیدر، بارہ دری شیر افگن خاں اور احاطہ کالے صاحب اور کھاری باولی سے آگے پھاٹک حبش خاں۔ فصیل سے باہر کے علاقوں میں محلّہ کشن گنج، شیش محل، قصاب پورہ، بیری والا باغ اور باڑہ ہندو راؤ کی کچھ گلیوں میں بھی کرخنداری بولی جاتی ہے۔

اردو زبان کے احترامی لہجے کا اثر کرخنداری میں بھی جھلکتا ہے۔ کچھ لفظ ایسے ہیں جو اپنے لغوی معنی سے قطع نظر آزادانہ آداب و القاب کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر خلیفہ، پیارے، میاں، وئی جو بھائی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مثلاً:

خلیفہ، کل کاں جا ریا تھا پیارے؟
وئی میرے آگو تو وس کا نام ای نہ لو
وئی جتنا مزا ٹر میں ہے عید میں کاں
وئی نیا سرکش دیکھا تم نے؟

اردو میں اخذ و تصرف کا سلسلہ تو صدیوں سے جاری رہا ہی ہے مثلاً حور (صیغۂ جمع) کو واحد قرار دے کر اس کی جمع حوروں اور حوریں بناتے ہیں۔ ارواح، روح کی جمع ہے۔ ہم کہتے ہیں اس کی ارواح خوش ہوئی۔ گوبر گنیش اور صلواتیں سنانا بھی اردو کے محاورے ہیں۔ شمس ہم نے عربی سے لیا لیکن بقول دتا تریہ کیفی اردو نے اسے عورت سے مرد بنا دیا۔ کرخنداری میں تو تصرفات اس سے بھی بڑھ کر ہوئے ہیں، اور یار لوگ لفظ کی اصل سے سرے سے مطلب ہی نہیں رکھتے۔ مثلاً بے فضول کی دھونس

نہ جماؤ، بے غافل ہو رہے ہو کیا، بے ناق (ناحق) کو بگڑ رہے او، چشم دید آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے۔ ازغیب سے کام بن جائے، برلب سڑک کے کنارے بیٹھا وا تھا۔ اسی طرح فصیل کا صفیل، یا لطف کا لُفط، لعنت کا نعلت، تجویز کا تزویج، مزاج کا مجاز، قفل کا قلف جس سے کلفی نکلا ہے۔ اجازت سے ازاجت، لکھنؤ سے نکھلؤ، زوجہ سے جوزہ، پتھر کا پھتّر، مطلب کا مطبل۔ جامع مسجد پر آج بھی فتّر والے سنائی دیتا ہے حالانکہ پتھر والوں پر فتّروں کا نام ونشان بھی نہیں۔

اسی طرح انگریزی لفظوں کی بھی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ Bulb کو بَلَب، Silk کو سِلِک، Park کو پارَک کہنا تو عام ہے۔ Time کو یار لوگ ٹیم، Note کو لوٹ، Minute کو ملٹ، Programme کو پولوگرام، Doctor کو ڈانگدر، Suit کو سوٹ، Boot کو بونٹ کہتے ہیں۔ اسی طرح پالٹی، ڈالیور، ٹھیٹھر، انسپٹر، ہوڈل۔ لچکر Lecture کے لیے، پچر Picture کے لیے اور مُلٹیا Militaryman کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

کرخنداری کے کچھ خاص لفظ سنیے جو معیاری اردو میں عام طور پر استعمال نہیں ہوتے۔ ٹِپنا بمعنی دیکھنا، ہلہلا بمعنی جوش، ڈھوڈھا بمعنی بدصورت، اگاڑو بمعنی آگے، پچھاڑو بمعنی پیچھے۔ اسی طرح اندرخوائی، بیوی کی عزت کے لیے، پیلم پار، سب سے پہلے، چِچیا، جھگڑالو اسی طرح چخلس بازی، منادگی (منع کے لیے)، بدنامگی (بدنامی کے لیے) حریان گتی، (حیرانی کے لیے)، رسانگی (نرمی کے لیے)، دھیانگی (دن بھر کا کام)، جمادگی (جمعہ کی خرچی)، لالم لال، کیے کوتک (کرتوت)، جمتوَل (بھرپور)، ٹپّو (ٹوپی)، مخریض بازی (ہنسی مذاق)، بازوان (بعد ازاں)، فَراوَٹ (فٹافٹ)، چانک اچانک کو، بے ویدت پنا اجنبیت کو، لپکا جھپکی لڑنے کو، بیچار بیل کو، گمّاں بڑے کو، لمڈا لڑکے کو، لپیٹا تھپڑ کو، کولکی چھوٹے کمرے کو، تڑی تکبّر کو، جناور جانور کو، جھانپڑ تھپڑ کو، لگ ماتر ساتھی کو اور ناواں روپے کو کہتے ہیں۔ ان میں کئی لفظ بول چال کی اردو میں شامل ہوگئے ہیں۔

اب کرخنداروں کی کچھ کہاوتیں اور امثال بھی سنیے۔ سمجھے سوگدھا اور اناڑی کی

جانے بلا؛ لکڑی کے بل مکڑی ناچتی ہے۔ بار میاں ہفت ہزاری گھر میں جورو فاقوں مَاری، دم نہ درود لڑنے کو میجود، مالک کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے بچنا چہیئے۔ قَسم ہے اڑان جھلّے کی۔

محاوروں کی مثالیں یہ ہیں: سُرتی نہ ہونا یعنی مشکل سے نباہ کرنا، ہوائی دیدہ ہونا، باجرہ پڑنا یعنی پھوہار پڑنا۔ حامی کاری بھرنا، یادآوری کرنا، دھیانگی پھیلانا یعنی دن کا کام شروع کرنا، دیدے پٹم ہونا یعنی اندھا ہونا، کانا گوشی کرنا بمعنی ڈانٹنا، پھولی پھولی کھانا بمعنی مزے اڑانا۔

کرخنداری کا مزہ اس کے مکالموں میں ہے۔ مثال کے طور پر کرخنداری کے یہ جملے سنیے۔

خلیفہ شمّو : یے بات عقل میں نہیں آتی کہ تم سب چانک یاں کیسے چلے آئے؟

مُنتیاز : بس یوی آج جمّے کے مارے دھیانگی تو پھیلائی نیں۔ بوت دِنا سے دل چا ریا تھا کہ قطب صاحب کی لاٹھ پر چڑھیں۔ اتفاخ کی بات شبو پَیلوان اپنا تانگا لے کر آگئے۔ ہم نے وِن سے کیا کہ وئی آج تو قطب چلو۔ وہ تماری مَہروانی سے مان گئے۔

بَندو : مگر شبو پیلوان ہیں کاں؟ ابے لے ایل لے: تو نے اوی تک وِن کو نیں دیکھا۔ وہ دیکھ اوپر بُرجی پے تاوند سکھا رے ہیں۔

مُنتیاز : میں رَکیا نیچو آ وَنا پیلوان۔

شبو : آریا ہوں پیارے۔ آریا ہوں، ایک مِلٹ میں۔

کرخنداری کے بارے میں یہ سوال کچھ کم دلچسپ نہیں کہ دہلی میں کرخنداری کا رواج کب سے ہے۔ ان پڑھ اور غریب طبقے کی بولی ہونے کی وجہ سے اس میں پرانی تحریریں نہیں ملتیں۔ محمد سرفراز حسین کے ناول ''شاہد رعنا'' میں جو 1932 میں شائع ہوا تھا دو کرخنداروں اور ننھی جان کی گفتگو البتہ کرخنداری بولی میں ہے۔ ایم اے مغنی نے اس بولی میں کئی مزاحیے، خاکے اور انشائیے لکھے تھے جن کا مجموعہ ''نرالی اردو'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ سید یوسف بخاری کی کتاب ''یہ دلی ہے'' میں بھی

دہلی کے کرخنداروں پر ایک باب ہے، جس میں ان کی بولی کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ حضرت آوارہ کرخنداروں کی نقل اتارنے میں کمال رکھتے تھے۔ ''اپنی موج میں'' ان کا ایک خاکہ 'کرخندار' شامل ہے۔

کرخنداری کے کچھ گراموفون ریکارڈ بھی موجود ہیں۔ ان میں مزاحیہ اور ڈرامائی مکالمے ہیں۔ ''پردہ باغ''، ''ہمسائے کی بلی''، ''عیدو کا کبوتر''، ''نظام الدین کی سیر''، ''کبڈی'' دہلی کے میلوں ٹھیلوں میں اکثر بجائے جاتے ہیں۔ ''دو دیوانے'' اور ''رمضان کا چاند'' نظام ریکارڈ کمپنی نے بنائے تھے اور ''روشن آرا باغ'' ایروفون ریکارڈ کمپنی نے بنایا تھا۔ لیکن یہ سارا مواد بیسویں صدی کا ہے جبکہ یہ بولی کئی سو سال سے چلی آرہی ہے۔ اس کے بعض صوتی اور صرفی ونحوی خصائص کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسے عناصر آج تک موجود ہیں جو تین چار سو سال پہلے کی اردو میں تو موجود تھے لیکن بعد میں معیاری زبان سے زائل ہو گئے جبکہ کرخنداری میں آج تک مروج ہیں۔

کرخنداری میں دو ضمیریں خاص طور پر رائج ہیں۔ وِس بمعنی اُس اور وِن بمعنی اُن۔ معیاری اردو میں ان ضمیروں کا چلن نہیں۔ لیکن محمد شاہ کے عہد کے ایک شاعر عبداللہ مسکین کے ایک مرثیے میں جسے جان گلکرسٹ نے ''گرامر آف دی ہندستانی لنگویج'' میں نقل کیا ہے، وِس اور وِن آزادانہ استعمال ہوئے ہیں۔

یہ سن کے وِس لعیں نے شمشیر پھر چھنالی
وِس لون کے بِلے کی گردن اتار ڈالی
دکھلا کے وِن بچوں کو وِس کے لہو کی نالی
تیغے کو لاکے وِن پر قبضے کو پھر سنبھالا (کذا)
بچوں نے دیکھا گردن کاٹے گا اب ہماری
بھائی بڑے نے پہلے کی وِس کنے یہ زاری

اٹھارویں صدی میں منشات محمد شاکر کے مخطوطے میں بھی جس کا ذکر بلوم ہارٹ نے انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں کیا ہے، یہ دونوں ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔

پلیٹس نے اپنی گرامر میں ان ضمائر کے بارے میں لکھا ہے کہ معیاری اردو میں اب یہ رائج نہیں۔ اس کے برعکس کرخنداری میں غائب کے لیے نہ صرف یہ ضمیریں آج تک رائج ہیں بلکہ ان کے علاوہ ان معنی میں کوئی دوسری ضمیر استعمال ہوتی ہی نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس زمانے میں اردو دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں کے سائے میں پرورش پا رہی تھی، اس میں اور کرخنداری میں گہرا رشتہ تھا۔ یا یوں کہا جائے کہ کرخنداری شمالی ہندوستان میں اردو کی قدیم ترین شکل سے بے حد قریب تھی اور آج بھی اس میں پُرانی اردو کے اجزا دیکھے جاسکتے ہیں۔ اردو کا جو گہرا رشتہ دہلی اور دہلی کی بولیوں سے ہے اس کا خاصا ثبوت کرخنداری میں مروج قدیم شکلوں کے مطالعے سے مل جاتا ہے۔

میر کے زمانے میں امر کے احترامی لہجے کا آئیو، جائیو، دیکھیو، لیجیو، کیجیو والا انداز خاصا مقبول تھا۔ کربل کتھا اور باغ و بہار سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن غالب و ذوق و ظفر تک آتے آتے دیجیے، کیجیے، لیجیے والا کھڑی کا انداز، غالب آچکا تھا اور کبھو کے ساتھ ساتھ آئیو، جائیو، سنیو بھی کم کم سنائی دینے لگا تھا۔ /اِو/ والا انداز برج کا تھا جو قدیم اردو سے مخصوص تھا۔ یہ انداز کرخنداری میں آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح لفظ 'اینچ' جو کرخنداری بولی میں کھینچ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کربل کتھا میں ملتا ہے:

''آہِ حسرت اینچ کہتی تھی''

''جواہرِ الفاظ چون کر بیچ رشتۂ بیان کے اینچ''

کرخنداری میں ہ کی آواز کو دبانے یا زائل کرنے کی خصوصیت بھی پرانی اردو کی یاد دلاتی ہے۔ کیٹلر نے اپنی ہندستانی گرامر اورنگ زیب کے زمانے میں لکھی تھی۔ اس میں اردو کے کئی لفظ بغیر 'ہ' کے ملتے ہیں مثلاً پہلے کو پیلے، نہیں کو نئیں، رہا کو ریا، گہرا کو گیرا، جگہ کو جگے، لہو کو لوہ لکھا ہوا ہے۔ نظامی دکنی، محمد قلی قطب شاہ، ابن نشاطی، وجہی سب کے ہاں 'ہ' کو دبانے کا انداز ملتا ہے۔ اس کا اقرار ''دیوان زادہ'' میں حاتم نے بھی کیا ہے اور انشاء اللہ خاں نے بھی دریائے لطافت میں 'ہ' کے حذف

کی مثالیں دی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اردو میں یہ انداز عام تھا۔ معیاری اردو میں ہائے مختفی اب بھی اکثر Vowel سے بدل جاتی ہے لیکن بیچ کی 'ہ' واضح طور پر بولی جاتی ہے۔ مثلاً انھوں، جنھوں، جنھیں، تمھیں، تمھارا۔ پرانی اردو میں یہ انو، جنو، جنیں، تمیں، تمارا تھے۔ کرخنداری بولی میں آج تک یہی انداز چلا آتا ہے جو اس کی کئی سو سال پرانی بولی ہونے کی دلیل ہے۔

کرخنداری کا شمار اردو کی قدیم بولیوں میں ہونا چاہیے۔ اس میں ایک خاص طرح کی شیرینی اور بے تکلفی ہے۔ اس کے بولنے والے زیادہ تر ہاتھ کا کام کرنے والے محنت کش اور مزدور ہیں۔ اس کے روزمرہ اور محاورے سے یک گونہ بے فکرے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں لفظوں کی معیاری شکلوں سے گریز اور معیار کی پٹری سے ہٹی ہوئی جو لے ہے، اس سے قدرتی طور پر ایک خاص طرح کے لطف و مزاح کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ مغل دور کی بہت سی یادگاریں ہیں جنھیں ہم عزیز رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک کرخنداری بولی بھی ہے۔ اور ایسی یادگار جو آج بھی دہلیِ قدیم کی گلیوں میں زندہ ہے۔

○

انجمن ترقی اردو کی کل ہند اردو کانفرنس

میں اردو کے بارے میں جب جب جذباتی تقریریں سنتا ہوں تو مجھے بڑا تعجب ہوتا ہے۔ زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اردو کے مسئلے پر سوچتے ہوئے میرا یہ احساس روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے کہ یا تو ہم اپنی زبان سے سچی محبت نہیں کرتے یا پھر سچائی سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اردو کی گتھی نہایت ہی پیچیدہ طور پر الجھی ہوئی ہے اور جو حضرات بھی اس کے آسان حل کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صرف ایک ہی زاویے یا ایک ہی سطح سے سب چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ اردو کا مسئلہ عجیب وغریب تضادات اور پیچیدگیوں کا شکار ہے۔ مثال کے طور پر اس کی زیادہ تر مشکلات انھیں علاقوں میں پیدا ہوئی ہیں جو اس کی جنم بھومی ہیں اور جہاں یہ زبان پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہے۔ یعنی اردو کا علاقہ وہی ہے جو ہندی کا ہے۔ یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں کوئی بھی زبان ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے، جتنا اشتراک ان دو زبانوں میں ہے شاید ہی کسی دو زبانوں میں ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ جتنا افتراق ان دو زبانوں میں ہے اس کی دوسری نظیر بھی کہیں نہیں ملتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جتنی خدمت اس زبان نے مشترک ہندستانی تہذیب اور سماجی اختلاط و ارتباط کے لیے کی ہے اتنی کسی دوسری زبان نے نہیں کی۔ لیکن جیسا نشانہ علاحدگی پسندی اور لسانی عصبیت کے لیے اس بیچاری زبان کو بنایا جاتا ہے شاید ہی کسی زبان کو بنایا جاتا ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہندوستان میں شاید ہی کسی زبان کی ایسی حق تلفی ہوئی ہو جیسی اردو زبان کی۔ (اپنا علاقہ یا خطہ تو کجا اس کو ثانوی یا دوسرا درجہ بھی ٹھیک سے حاصل نہیں۔ تیس سال کسی بھی زبان کو ختم کردینے کے لیے کچھ کم عرصہ نہیں ہوتا) لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اردو ہندوستان میں

اب بھی اپنی زندگی کا ثبوت دے رہی ہے۔ یہ تو ہے لسانی صورت حال، اب لیجیے سیاسی صورت حال کو۔ حکومت اِس کی رہی ہو یا اُس کی، میں نے تو آج تک کوئی قومی لیڈر یا قومی نیتا ایسا نہیں دیکھا جس نے اردو کی تعریف نہ کی ہو، اسے خوبصورت زبان نہ کہا ہو اور اسے ہندوستان کا قومی سرمایہ نہ قرار دیا ہو، اور اس زبان کا حق دلانے کا وعدہ نہ کیا ہو۔ اس کے باوجود اردو کا حق آج تک اس کو نہیں ملا۔ ان امور پر غور کیجیے تو خیال ہوتا ہے کہ کہیں پر تو کوئی ایسی پیچیدگی ہے، یا ایسی گانٹھ ہے کہ بات بنتے ہوئے بھی نہیں بنتی اور ہماری سادہ لوحی اور خوش فہمیوں کا یہ عالم ہے کہ ہم بات کو سمجھتے ہوئے بھی بات کو سمجھنا نہیں چاہتے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اردو کو زیادہ مشکلات کا سامنا ان ہی علاقوں میں ہے جو ہندی کے بھی علاقے ہیں اور جہاں کی سرکاری زبان ہندی ہے۔ ان علاقوں کے لوگ اردو کی مخالفت کیا صرف اس لیے کرتے ہیں کہ اردو زیادہ ترقی یافتہ، شستہ اور بالیدہ زبان ہے یا اس لیے کہ وہ اردو کو ہندستانی زبان نہیں سمجھتے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ اس ذہنیت کو کس طرح ختم کیا جائے۔ ہم پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ اردو پر غیر ملکی زبان کا الزام لگانے والے اُسی سانس میں یہ بات بھی کہتے ہیں کہ اردو دراصل ہندی ہی کی شیلی ہے۔ منطقی طور پر اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندی بھی غیر ملکی زبان ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو والے اپنا رسم الخط بدل دیں کیونکہ یہ غیر ملکی ہے۔ اس سلسلے میں عرض کروں گا کہ اردو کی تیس بتیس آوازوں میں سے چودہ آوازیں ایسی ہیں جو نہ عربی میں ہیں نہ فارسی میں مثلاً ٹ، ڈ، ڑ یا بھ، پھ، تھ، دھ، جھ، چھ، کھ، گھ اور ٹھ، ڈھ، ڑھ۔ یہ آوازیں سو فیصد ہندستانی ہیں۔ ان آوازوں کے اظہار کے لیے ہم نے اپنے رسم خط کو 'ہندوستانیایا' ہے (میں یہاں ہندیایا نہیں کہوں گا) اب یہ رسم خط عربی اور فارسی رسم خط سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور اسے ہمیں اردو رسم خط کہنا چاہیے۔ صحیح ہے کہ یہ رسم خط عربی، فارسی سے اردو نے لیا لیکن اب اس کا ایک صفحہ یا ایک پیرا ایران، عراق، مصر یا سعودی عرب لے جایئے تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں کے

لوگ جن سے ہم نے یہ رسم خط لیا تھا اس کو صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا رسم خط اپنے ارتقا کے دوران میں کیا سے کیا ہوگیا۔ اب اسے محض عربی یا فارسی رسم خط کا چربہ کہنا غلط ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندی دوستوں کو اس حقیقت سے واقف کرائیں۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی بیس سے زیادہ زبانوں میں کم سے کم پندرہ زبانوں کا رسم خط ناگری یا ناگری کی بدلی ہوئی شکلوں کو پیش کرتا ہے۔ جب یہ زبانیں اپنا اپنا الگ رسم خط چھوڑنے کو تیار نہیں تو بیچاری اردو ہی سے یہ تقاضا کیوں؟

رہی یہ بات کہ ہم عربی اور فارسی لفظوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ دوسری زبانوں سے الفاظ لینے سے زبانوں کی دولت بڑھتی ہے، وہ امیر ہوتی ہیں غریب نہیں۔ پھر اردو کی دولت تو ہندی کی دولت بھی ہے، اپنی دولت کو کھونا شدید نادانی ہے۔ نیز یہ کہ یہ دولت اب ہمارے خون کا حصہ بن چکی ہے۔ ان چند ہزار لفظوں میں سے بہت سے تو پہلے ہی سے ہندی کا حصہ بن چکے ہیں۔ زبان ایک زندہ رَو ہے۔ وہ وقت اور عصر کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اردو کے شاعروں اور مصنفوں کی کتابیں جب ناگری میں چھپتی ہیں تو ان کے کئی کئی ایڈیشن نکلتے ہیں اور یہ ہزاروں کی تعداد میں چھپتی ہیں۔ عام طور پر اردو کتابوں کو ہندی میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ جوں کی توں ناگری حروف میں چھاپ دی جاتی ہیں اور ان کے پڑھنے والوں کو دقت نہیں ہوتی۔ اگر زبان ترسیل کی چیز ہے، جو وہ یقیناً ہے تو اردو ادب کا ہندی میں قابلِ قبول ہونا اور شائع ہوکر مقبول ہونا اردو کی عوامی جڑوں کا کھلا ثبوت ہے۔

غرض ایک طرف تو ہندوستان میں اردو کی یہ بنیادیں ہیں جو جمالیاتی بھی ہیں، تہذیبی بھی اور لسانی بھی، جو اردو کو ہندوستان کے عوامی لسانی تقاضوں سے قریب کردیتی ہیں، اور دوسری طرف اردو کے حقوق سے کھلم کھلا بے اعتنائی کا نقشہ ہے۔ کیا کچھ لوگ اردو کی اس مقبولیت اور ہردلعزیزی کی وجہ سے اردو کو غیرملکی زبان تو نہیں کہتے؟ یا کیا اس جذبے کے پیچھے کسی گہرے لسانی احساس کمتری کا ہاتھ تو نہیں؟ اردو زبان کا مسئلہ دراصل صرف زبان کا مسئلہ نہیں، یہ ایک تہذیبی نظر، ایک اندازِ

زندگی، گنگا جمنی کیفیت اور دو بڑے فرقوں کے مابین ذہنی و جذباتی اشتراک کا مسئلہ بھی ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی کی شہادت اور تہذیبی اختلاط اور مشترک ہندستانی نظر کے تحفظ کی کوشش میں جو رشتہ ہے، وہ غور طلب ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح کا ہندوستان چاہتے ہیں؟ ہم کس طرح کی ہندستانی قوم چاہتے ہیں؟ ہم ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہتے ہیں کہ نہیں؟ ہم ایک بڑی تہذیب کی ذیلی تہذیبوں یا اس کے چھوٹے بڑے تمام رنگوں کے حُسن کو دیکھنا چاہتے ہیں یا ان سب کو سیاہ یا سفید میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟ ہمارا ایمان جمہوریت پر ہے تو ہمیں ایک کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی سماج میں اشتراک و ارتباط و اختلاط کے رشتوں کو مضبوط کرنا ہوگا، ہم اس نکتے کو ازخود سمجھ لیں تو خوب، ورنہ وقت کے تھپیڑے ہمیں بالآخر اسی راہ پر لے آئیں گے۔ جواہر لال نہرو یہی چاہتے تھے۔ گاندھی جی کا بھی یہی خیال تھا۔ پنڈت نہرو کی کوشش رہی کہ اردو کے لیے رائے عامہ بیدار ہو، لیکن سیاست نے ضرب ایسی لگائی تھی کہ ایک دو دہوں میں نارمل جذباتی کیفیت پیدا نہ ہوسکی۔ یہ نارمل کیفیت شاید اب تک پیدا نہیں ہوئی، قوموں کی زندگی میں تیس سال کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اگر ہندوستان کا اصل مزاج جمہوری ہے تو ایک نہ ایک دن اسی راہ پر، تہذیبی اشتراک کی راہ پر، اردو کو گلے لگانے کی راہ پر آنا ہی پڑے گا۔ عظیم ہستیاں ختم ہوجاتی ہیں، لیکن ان کی آواز کی گونج کبھی نہیں جاتی۔ ہندوستان کے لسانی حل کے لیے جو کچھ گاندھی جی نے کہا تھا، وہ ایک روشن ضمیر انسان کی آواز تھی؛ ہندوستان کی قومی زبان کی گتھی کا اگر کبھی کوئی حل نکلے گا تو وہ گاندھی جی کے خیالات اور اردو کی گنگا جمنی راہ سے دور ہٹ کر نہیں ہوگا۔ ہندی اور اردو صرف دو لسانی لیبل ہیں۔ سیاستِ وقت اپنے مفادات کے لیے اس لیبل کو لسانی حقیقتوں پر اپنے اپنے طور پر چپکاتی رہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ آئندہ کے ہندوستان کی جو ہندی قومی زبان بنے گی، وہ اردو سے بے نیاز ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے کہ اردو اس کی سب سے بڑی تاریخی اور تہذیبی حقیقت ہے، اس حقیقت کو ایک نہ ایک دن قبولنا ہی ہوگا۔

پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تک وہ دن نہ آئے اردو والوں کو اپنی زبان کے تحفظ کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ کیا یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے کھول دینے سے ہمارے مسائل حل ہوجاتے ہیں؟ کیا اردو اخباروں کو اشتہارات ملنا کافی ہے؟ کیا چند اکاڈمیوں کو فنڈ دے دینے سے یا چند ادیبوں کے منہ انعاموں سے بھر دینے سے اردو زبان کے مستقبل کو ہندوستان میں تابناک سمجھ لینا چاہیے؟ کیا یہ سب اشک شوئی کی کوششیں نہیں؟ کیا یہ ایسی ہمدردی نہیں جس سے ہماری توجہ اصل مسئلے سے ہٹ جائے؟ ہم ناشکرے نہیں کہ ان اقدامات کا اقرار نہ کریں، لیکن ان اقدامات کے پیچھے اگر نفسیات وہ ہو جس کی طرف اشارہ کیا گیا تو اس کا احساس بہرحال ضروری ہے اس لیے کہ خوش فہمی جدوجہد کی راہ سے ہٹانے میں سب سے کارگر حربہ ثابت ہوتی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ مادری زبان کی تعلیم، اسکولوں میں اردو پڑھنے کی سہولتوں، انتظامیہ اور عدلیہ میں اردو کے سرکاری چلن (خواہ وہ ثانوی حیثیت سے ہو یا کسی اور حیثیت کے تحت) اور اس چلن کے قانونی تحفظات کا ہونا ہے کہ ہم بدلے ہوئے سیاسی نقشے یا آتی جاتی حکومتوں یا ووٹ بٹورنے والی پارٹیوں کے رحم وکرم پر نہ رہیں۔ اس مقصد کے لیے اردو تحریک کی ضرورت تو ہے ہی، یعنی حکومت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی، اپنا حق مانگنے کی، اس حق کے لیے آئینی جد وجہد کرنے کی اور اس کے لیے فضا تیار کرنے کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے احتساب کی بھی ضرورت ہے، اور اپنی نفسیات پر نظر رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں، اول یہ کہ ہندوستان کے سماجی اور تہذیبی نقشے میں اردو کا جو رول ہے، اس کو ادا کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں، یعنی اپنے اعتماد کو مضبوط کریں اور دوسرے یہ کہ ہندی دوستوں اور دوسری زبان والوں کی زیادہ سے زیادہ ہمدردی حاصل کریں، اور اردو کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ کسی جمہوریت میں کوئی ناانصافی ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتی اس کا حل ایک نہ ایک دن نکلنا ہی ہے لیکن اگر ہم ہمت ہار دیں یا اگر اردو سے ہماری محبت اور وابستگی میں فرق آنے لگے تو اس سے دہرا نقصان ہوگا اور اردو کے زوال

کے ذمّے دار ہم بھی ہوں گے۔ اردو کی بقا کے مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قطع نظر اس کے کہ حکومت اردو کے لیے کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی، ہم خود اردو کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں ضرور کریں۔ اس کے لیے کسی آسمانی حکم کا انتظار نہ کرتے رہیں۔ اس بات کو ہرگز نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی بھی زبان صرف حکومت کی مدد سے زندہ نہیں رہتی۔ حکومت کی مدد کی اہمیت ہے اور ضرور ہے لیکن زیادہ اہمیت زبان بولنے والوں کے ولولے، ان کی لگن اور اپنی زبان سے ان کی محبت کی ہے۔ اگر حکومت متوجہ نہیں ہوتی تو کچھ نہ کچھ نقصان تو ہوتا ہی ہے، لیکن اگر ہم ہی اپنی زبان کو بھولنے لگیں تو سمجھیے کہ نقصان پورا ہوا۔ لسانی قدر کے علاوہ اردو ایک تہذیبی قدر بھی ہے اور اس لحاظ سے بھی اردو کا زندہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ بی اے تک کی تعلیم کا عام نقشہ Liberal Education کا ہے جس میں کئی کئی مضمون پڑھنے لازمی ہیں۔ اس کا مقصد بنیادی ذہنی تربیت ہے۔ روزگار کا مسئلہ یوں بھی پیچیدہ ہے اور اس کی کئی وجہیں ہیں لیکن پڑھنے والوں کا معاشی مستقبل ہر ہر مضمون سے وابستہ نہیں ہوجاتا۔ یہی معاملہ اسکول کی تعلیم کا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر ٹھیک ہے کہ اردو کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے لیکن جہاں جہاں اردو تعلیم کا انتظام ہے وہاں اردو والے اپنے بچوں کو اردو کیوں نہیں پڑھاتے۔ پوچھا جائے تو جواب ملتا ہے روزگار۔ جبکہ آرٹس یا سماجی علوم میں جو دوسرے مضامین پڑھائے جاتے ہیں ان میں سے بھی ہر ہر مضمون سے روزگار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تو پھر اردو کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ ہمارے اپنے احساس کمتری کے علاوہ کیا ہے۔ ابھی تک اردو کا اپنا کوئی صوبہ نہیں، اور اس حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ ہندوستان تو ہندوستان، پورے برصغیر میں کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں کی واحد زبان اردو ہو۔ جب یہ صورت حال ہے تو اردو بجائے لسانی قدر، ایک تہذیبی قدر کے زیادہ اہم نظر آتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو کے ذریعہ روزگار نہیں ملتا۔ تاہم اگر یہ بات ذہنوں میں واضح ہوجائے کہ اردو کی بے حد ضرورت تہذیبی شخصیت کی تکمیل کے لیے ہے۔ یہ ضرورت کسی اور زبان سے پوری نہیں ہوسکتی۔ اس احساس سے خوداعتمادی کی ایک نئی لہر پیدا ہوگی اور حکومت کی

بیساکھیوں کے انتظار میں بیٹھے رہنے کی فضا ختم ہوگی۔ اس کے لیے ایک عملی اقدام یہ ہوسکتا ہے کہ ہم لوگ شبینہ مدرسوں اور غیر سرکاری اردو جماعتوں پر زیادہ سے زیادہ زور دیں اور اردو علاقوں میں گلی گلی، محلے محلے ان کا انتظام ہو۔ انتظامی سطح پر اردو کا جتنا بھی چلن بڑھایا جاسکے اچھا ہے، اور دس فی صد آبادی پر اردو جماعتوں کا انتظام ہونا چاہیے، یہ ذمہ داری سرکار کی ہے۔ لیکن تہذیبی سطح پر اردو کا چلن باقی رکھنے کی ذمے داری خود ہماری ہے اور اس کی طرف اگر پوری توجہ نہ کی گئی تو آنے والی نسلوں کے سامنے ہم سب جواب دہ ہوں گے۔

(پٹنہ، مارچ 1979)

بہار کا تاریخی اقدام

حال ہی میں حکومت بہار نے اعلان کیا ہے کہ بہار میں اردو کو ہندی کے بعد دوسری زبان کا درجہ حاصل ہوگا۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اس بارے میں گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے ایک آرڈی ننس جاری کردیا ہے۔ اس آرڈی ننس کی رو سے حکومت بہار کو مجاز کردیا گیا ہے کہ وہ اپنے آفیشیل لنگویجز ایکٹ 1950 میں ترمیم کرکے ایک مد کا اضافہ کرے کہ ہندی کے بعد اردو زبان کو ان علاقوں میں سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے گا جنھیں حکومت مناسب خیال کرے گی۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ اعلان قومی ایکتا ہفتہ کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ اردو سے انصاف کی راہ میں یہ ایک تاریخی قدم ہے جس کے لیے ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا اور ان کی سرکار مبارکباد کی مستحق ہے۔

ہندوستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر زبانوں کے اپنے اپنے خطے اور اپنے اپنے علاقے ہیں لیکن اردو کا معاملہ اس لحاظ سے بالکل مختلف اور الگ ہے کہ اردو کا چلن پورے ملک میں ہے، اور چلن کے لحاظ سے یہ زبان اگرچہ ہندوستان گیر ہے لیکن خطّے کے اعتبار سے یہ ہر جگہ اقلیت میں ہے۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس کی مہتم بالشان لسانی روایت ہے، جس کی پشت پر ملی جلی تہذیب کا تصور ہے، جس کا شعری و ادبی سرمایہ بہت وقیع ہے اور جس نے ہندستانی تحریک آزادی کی بیش بہا خدمت کی ہے اور جو آج بھی پورے ملک میں رابطۂ عامہ کی زبان سے قریب ترین ہے۔ کون ہے جو اس کی قدر افزائی میں شریک نہیں ہوگا اور اس کے ہندستانی زبان ہونے سے انکار کرے گا۔ اس کے باوجود اردو کا مسئلہ کئی برسوں سے بحث کا موضوع ہے اور اردو کے تحفظ کا خاطر خواہ انتظام ہونا باقی ہے۔

اردو کا زیادہ چلن شمالی ہندوستان کی ان ہی ریاستوں میں ہے جو ہندی کی ریاستیں بھی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو والوں نے ہندی کو تسلیم کرلیا ہے۔ وہ ہندی کو اپنی قومی زبان مانتے ہیں اور ہندی پڑھنا لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہندی اور اردو کی بول چال میں بہت کم فرق ہے چنانچہ جہاں جہاں مادری زبان کا سوال اٹھتا ہے، اردو کو اگر ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے تو بہت سی سماجی الجھنیں دور ہوسکتی ہیں اور محبت کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

ہندستانی دستور کی رو سے اردو آٹھویں شڈول میں درج شدہ زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ آرٹیکل 350، آرٹیکل 120 اور آرٹیکل 210 کی رو سے ان قومی زبانوں کو ابتدائی تعلیم، درخواستوں وغیرہ سے متعلقہ کاموں اور قانون ساز اسمبلیوں میں اظہار خیال کے لیے استعمال کرنے کے حقوق حاصل ہیں۔ اردو کے بارے میں وزارت داخلہ حکومت ہند نے 1958 میں ریاستوں کے نام ایک علانیہ بھی جاری کیا تھا اور 1961 میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس میں اس پر عمل درآمد کی تاکید بھی کی تھی لیکن اردو کے مسائل کا کوئی حل سامنے نہیں آیا تھا۔ دستور کے آرٹیکل 347 کی رو سے صدرِ جمہوریۂ ہند کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی اقلیتی زبان کے تحفظ کے لیے حکم جاری فرمادیں۔ اردو والے برسوں اس بارے میں کوشاں بھی رہے لیکن کوئی خاطرخواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس مشکل کے حل کا ایک اور راستہ آرٹیکل 345 ہے۔ وہ یہ کہ ریاستوں کے آفیشیل لنگویج ایکٹ میں ریاستیں خود ترمیم کریں اور اردو کے حقوق کے تحفظ کی گنجائش نکالیں۔ جموں وکشمیر میں تو اردو کو خاص حیثیت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش، ہماچل پردیش، مہاراشٹر اور بعض دوسری ریاستوں میں اردو کے تعلیمی انتظامات اسی آئینی تحفظ کے لیے کیے گئے ہیں۔ اب بہار میں ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی سرکار نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ بہار سرکار کے اس فیصلے کے پیچھے ایک لمبی داستان ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ 1977 میں انتخابات سے پہلے ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کی وزارت نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے

کے بارے میں اعلان کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں حکومت ہی بدل گئی مگر وہ اسی زمانے سے اردو کے لیے اپنے وعدے پر قائم ہیں، چنانچہ ابھی چند ماہ پہلے نئی سرکار کی تشکیل ہوتے ہی ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے بہار کے چار ضلعوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی خاصی تعداد موجود ہے، اردو کے سرکاری سطح پر استعمال کے لیے احکام جاری کیے تھے اور اعلان کیا تھا کہ بہت جلد اردو کو ریاست میں قانونی حیثیت دینے کا انتظام کیا جائے گا۔ اردو کی تعریف سب کرتے ہیں، اس کے حسن اور کشش کا ذکر بھی سب کرتے ہیں، اس کے ہندستانی ہونے کا اعتراف بھی عام ہے لیکن اردو کے بارے میں بالعموم جو وعدے کیے جاتے ہیں انھیں نبھاتا کوئی نہیں۔ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے اس سلسلے میں پہلی مثال قائم کی ہے اور جو کہا تھا کر دکھایا ہے۔ چنانچہ اردو والوں میں اس سے خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ دلوں میں وسعت ہو، اور محبت کے رشتوں کی اہمیت پیش نظر ہو تو کسی مسئلے کا حل ڈھونڈنا مشکل نہیں، اور بہار نے اس سلسلے میں پیش قدمی کر کے دوسری ریاستوں کو راہ دکھا دی ہے۔ امید ہے اسمبلی کے اگلے اجلاس میں اس آرڈی ننس کو قانونی شکل دی جائے گی اور بہار آفیشیل لنگویج ایکٹ میں ترمیم منظور کرلی جائے گی۔ اس کامیابی کے لیے انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ بھی مبارکباد کی مستحق ہے جس نے انجمن ترقی اردو بہار اور اس کی اردو تحریک کو سمت و رفتار دینے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اردو کے مسائل انھیں ریاستوں میں شدید نوعیت اختیار کر چکے ہیں جو ہندی ریاستیں ہیں۔ مثال کے طور پر اتر پردیش، دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش وغیرہ۔ ان کے مقابلے میں مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور کرناٹک پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان ریاستوں میں اردو بولنے والوں کو اتنے سنگین مسائل درپیش نہیں ہیں۔ آندھرا پردیش اس کی بہترین مثال ہے کہ وہاں کی سرکار نے آفیشیل لنگویج ایکٹ میں تلگو کے بعد اردو کے لیے گنجائش نکالی ہے۔ اگرچہ مہاراشٹر اور کرناٹک میں یہ بات نہیں، لیکن اردو تعلیم کے انتظام کی سہولتیں ان حکومتوں نے فراہم کر دی ہیں۔ ان انتظامات کو مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ

حقیقت ہے کہ جنوب میں حکومتوں کا رویہ معاندانہ یا مخاصمانہ نہیں۔ ہندی ریاستوں میں اردو کے تئیں وسیع القلبی اور رواداری کے جذبات کی کمی کیوں ہے؟ شاید اس کے پیچھے ہندی اکثریت کی کچھ غلط فہمیاں ہیں، جو پینتیس برسوں میں بھی پوری طرح دور نہیں ہو پائیں۔ لیکن اردو والوں کو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ دلوں کو جیتنے کی برابر کوشش رہنی چاہیے۔ ہماچل پردیش پہلی ریاست تھی جس نے اردو کا قانونی تحفظ کر کے اردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ اب بہار سرکار نے واضح طور پر آرڈی ننس کے ذریعے اعلان کر کے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے تو لامحالہ اتر پردیش اور دہلی کی حکومتوں کو اس مسئلے پر غور کرنا پڑے گا۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ نئے ہندوستان میں ایک کثیر لسانی سماج نمو پذیر ہو رہا ہے، مختلف علاقائی زبانوں کو کچھ نہ کچھ سرکاری درجہ اور تحفظ حاصل ہو چکا ہے۔ بعض علاقائی زبانوں کا فروغ نہایت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اگرچہ اردو ان میں بہتوں سے زیادہ ترقی یافتہ، وسیع اور متمول زبان ہے لیکن ہر جگہ اقلیت میں ہے۔ نئے ہندوستان کی اس لسانی حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں کہ اردو جہاں جہاں بھی بولی جاتی ہے، اس کو وہاں کسی نہ کسی دوسری زبان سے مفاہمت کرنی ہے اور نئے لسانی اور سماجی رشتے استوار کرنے ہیں۔ گویا اردو کو آج کے حالات میں خود اپنی خدمت نئے انداز سے کرنی ہے۔ اردو کی وسعت اور ہمہ گیری اس بات کی ضامن ہے کہ اردو دوسری علاقائی زبانوں کو بہت کچھ دے سکتی ہے۔ اردو تمام زبانوں میں قومی زبان ہندی سے قریب ترین ہے اور آج بھی ہندی کی خدمت کر سکتی ہے۔ جہاں تک اخذ و قبول کا سوال ہے، اردو کے دروازے ہمیشہ دوسروں پر کھلے رہے ہیں۔ اسی طرح دوسری زبانوں کی خدمت اور ان سے ہم کلامی کی راہیں بھی برابر کھلی رہنی چاہئیں۔ اس سے فائدہ اردو ہی کا ہے۔

سرکاری فیصلے اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان کے کامیاب ہونے یا ناکام ہونے کا دارومدار عوام کے تعاون پر ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنی خوش دلی سے ان فیصلوں پر عمل ہوتا ہے۔ اس بارے میں اکثریت کی بھی ذمہ داریاں ہیں اور

اقلیت کی بھی۔ اکثریت کو تو فیاضی اور اعتماد سے کام لینا ہی چاہیے۔ اقلیت کا بھی فرض ہے کہ غلط فہمیوں کو دور کرے اور علاحدگی پسندی کے رجحانات کا شائبہ پیدا نہ ہونے دے۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ جس طرح اپنے مذہب میں یقین رکھنا اور اس سے محبت کرنا مستحسن ہے، اسی طرح اپنی زبان کو چاہنا اور اس سے محبت کرنا بھی مستحسن ہے۔ لیکن جس طرح مذہب سے وابستگی دوسرے سے نفرت کا روپ اختیار کرکے فرقہ پرستی میں تبدیل ہوجاتی ہے، اسی طرح ایک زبان کی محبت اگر دوسری زبان کے خلاف عصبیت کا روپ اختیار کرلیتی ہے تو یہ لسانی خودپسندی بھی فرقہ پرستی کی طرح ایک منفی رجحان ہے جو قومی اتحاد کے چشموں کو خاک ریز کردیتا ہے۔ اردو کی ہردلعزیزی اور کشش کا بڑا راز یہی ہے کہ اس نے ہر طرح کی فرقہ پرستی اور لسانی عصبیت کی مخالفت کی ہے۔

(ہماری زبان دہلی، یکم مارچ 1981)

کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس

ادھر کچھ مدت سے یہ بات برابر محسوس کی جارہی ہے کہ اردو کے لیے ملک میں فضا سازگار ہورہی ہے۔ جب سے حکومتِ بہار نے اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا ہے اور اپنے آفیشیل لنگویجز ایکٹ میں ترمیم کرکے اردو کو تعلیمی اور انتظامی سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے، دوسرے صوبوں میں بھی اردو کے مسئلے پر توجہ ہونے لگی ہے۔ یوں تو ان دنوں ملک میں جگہ جگہ اردو کانفرنسیں اور مذاکرے منعقد ہورہے ہیں جن میں جموں و کشمیر، پٹنہ، علی گڑھ، حیدرآباد اور احمد آباد کے اردو اجتماع بالخصوص قابلِ ذکر ہیں، تاہم اس بارے میں جو خدمت لکھنؤ کی کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس نے انجام دی ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ اہمیت رکھتی ہے۔ پچھلے دنوں دو سو سے زیادہ غیر مسلم ادیب لکھنؤ میں جمع ہوئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ اردو کے معاملے میں اگرچہ وہ کسی مذہبی تفریق کے حامی نہیں ہیں، اور الگ سے کوئی پلیٹ فارم بنانا نہیں چاہتے، لیکن چونکہ اردو زبان کو بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے کسی ایک مذہب یا فرقے سے وابستہ کیا جاتا ہے، اس لیے وہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اردو بلاتخصیصِ مذہب و ملت سب کی زبان ہے۔ زبان کو مذہب سے وابستہ کرنا ایک زبان دشمن اور ملک دشمن عمل ہے جس کی وہ پرزور مذمت کرتے ہیں۔ اس کانفرنس کے ڈیلیگیٹ سیشن کا افتتاح انجمن ترقیِ اردو (ہند) کے صدر پنڈت آنند نرائن مُلا نے اور کھلے اجلاس کا افتتاح اردو کے ممتاز شاعر جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے فرمایا۔ وزیراعلیٰ بہار ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا اور وزیراعلیٰ اترپردیش شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بھی کانفرنس سے خطاب کیا۔ کانفرنس میں ''ہندوستان کی قومی زندگی میں اردو کا حصہ'' کے موضوع پر ایک فکرانگیز مذاکرہ بھی ہوا جس میں اترپردیش سرکار کے وزیرِ قومی یکجہتی ڈاکٹر عمار رِضوی اور بہار سرکار کے وزیر جناب

شمائل نبی نے بھی شرکت کی۔ اِن کے علاوہ جناب اندرکمار گجرال، جناب مالک رام، جناب علی جواد زیدی، جناب ضیا فتح آبادی، بیگم حامدہ حبیب اللہ اور متعدد قومی کارکنوں، دانشوروں اور ادیبوں نے کانفرنس میں شرکت کی اور بحثوں میں حصہ لیا۔ اس کانفرنس کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ اردو کے مسلمان ادیبوں، یونیورسٹی پروفیسروں اور شاعروں نے بھی بہت بڑی تعداد میں شرکت کی اور اردو زبان کے سیکولر کردار کی پرزور حمایت کی جس کے لیے کانفرنس کے جنرل سکریٹری جناب رام لال اور اُن کے رفقا تمام اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

وزیراعلیٰ بہار ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کو جگہ جگہ استقبالیے دیے گئے اور اردو کا حق دلانے کے لیے ان کی خدمات کا پرجوش طریقے سے اعتراف کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مشرا نے بہار کے پندرہ اضلاع میں اردو کے استعمال کے لیے جو نوٹیفکیشن جاری کیا ہے وہ بھی پیش کیا اور فرمایا کہ اس نوٹیفکیشن کے ذریعے ریاست کے پندرہ اضلاع میں ہندی کے علاوہ اردو میں بھی درخواستیں قبول کی جائیں گی اور ان کا جواب بھی اردو میں دیا جائے گا۔ تمام ضروری سرکاری اعلانات، اطلاعات، نوٹسیز اور گزٹ کی اشاعت ہندی کے علاوہ اردو میں بھی ہوگی۔ اخبارات کو اشتہارات بھی اردو میں جاری کیے جائیں گے۔ انتظامی کاموں کے علاوہ اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر بھی بڑے پیمانے پر کیا جائے گا۔

اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اترپردیش کے وزیراعلیٰ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اردو کے بارے میں جو بیان دیا، وہ بے حد اہم ہے۔ انھوں نے صاف صاف الفاظ میں فرمایا کہ اس سال کے آخر تک اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا۔ وزیرِاعلیٰ اترپردیش کی اس بات کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا کہ اردو اِسی سرزمین کی زبان ہے، یہیں پیدا ہوئی اور اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ انھوں نے کہا کہ اس زبان کی ترقی کے لیے بعض اقدامات کیے جاچکے ہیں اور ابھی مزید کئی کام کرنے ہیں۔ انھوں نے اردو دوستوں کو یقین دلایا کہ اس سلسلے میں کارروائی کا آغاز کیا جاچکا ہے اور موجودہ سال کے اختتام سے

پہلے پہلے اتر پردیش میں اردو کو ضروری کاموں کے لیے دوسری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا کے ہاتھوں میر اکاڈمی ایوارڈز کی تقسیم بھی عمل میں آئی اور صدرِ اکاڈمی جناب مقبول احمد لاری نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔

اس کانفرنس کے کھلے اجلاس کا خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ زبان کا مذہب نہیں ہوتا، البتہ زبان کا سماج ہوتا ہے اور ہندستانی سماج اردو کا سماج ہے۔ اردو ایک ہندآریائی زبان ہے اور ہندستانی زبان ہے، اس کی زلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں، اس کی جادو اثری میں 'شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی' تینوں کا ہاتھ ہے۔ جب دلوں کے دروازے وا ہوتے ہیں، وصل کے در کھلتے ہیں، ایسے میں زبان قوموں اور نسلوں کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے اور محبت و یگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ ہندستانی تاریخ کے ایسے ہی لمحے میں اردو زبان وجود میں آئی تھی۔ اردو محض ایک زبان نہیں، ہماری ایک ہزار برسوں کی تہذیبی کمائی بھی ہے۔ اس کی پشت پر ملی جلی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے، ہندی اور اردو میں اٹوٹ رشتہ ہے۔ اردو رسم خط کو بدیسی کہنا مناسب نہیں کیونکہ اردو نے اس کو اپنی ہندآریائی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا ہے۔ محبت سے محبت اور اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اردو کو حق ملے گا تو ہندی کا احترام بڑھے گا، سیکولرزم میں یقین، مشترک تہذیب سے وابستگی اور جمہوریت میں اعتماد پختہ ہوگا۔ بہار نے اس راہ میں پہل کی ہے۔ اب حکومت اتر پردیش بھی اس راہ پر بڑھے گی تو لکھنؤ کی اس کانفرنس کا کردار تاریخی ہوگا کیونکہ اس نے اردو کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے میں ضروری آواز اٹھائی اور اردو کے سیکولر، جمہوری اور ہندستانی مزاج پر اصرار کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔

(20-18 اپریل 1981)

اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت

نوام چومسکی کا نظریۂ تشکیلی گرامر

زبان کے تعلیمی کام میں لسانیات[1] کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اس نے زبان کی ماہیت کے شعور کو عام کیا ہے۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ زبان ہے کیا۔ مغرب میں زبانیں پڑھانے کے طور طریقوں میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر کی وجہ یہ ہے کہ لسانیات نے زبان کو فسانہ وفسوں (Myth) کی دنیا سے نکال کر سائنس کی معروضی روشنی میں پیش کیا ہے اور اس کی اصلیت سے نقاب اٹھائی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اہم نکتے یہ ہیں:

1 زبان آوازوں کا مجموعہ ہے۔ (Language is vocal)

2 زبان بنیادی طور پر بول چال ہے۔ تحریر اس کا ثانوی اور ملفوظی روپ ہے۔ (Language basically is speech; writing is its secondary and derivative manifestation)

3 زبان تغیر پذیر چیز ہے۔ (Language is dynamic, changing thing)

4 زبان کا اپنا نظام ہوتا ہے۔ (Language has a system)

سب سے پہلے اس کو لیجیے کہ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے اور صوت حرف پر

---

1 لسانیات سے زبان کے مطالعے میں جو مدد مل سکتی ہے، اس بارے میں بعض بنیادی باتیں ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' (دہلی 1963) کے پہلے حصے میں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں انھیں دہرایا نہیں گیا البتہ صوتیات کی گفتگو میں بعض حقائق کی تکرار ناگزیر تھی۔ گرامر کی بحث میں کوشش کی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے، نئی معلومات کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔

مقدم ہے۔ ہمارے یہاں عام روایت اس کے برعکس رہی ہے یعنی حرف ہی کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ حرف کا تصور بری طرح ذہنوں پر مسلّط ہے۔ زبان کی کوئی بھی بحث ہو، حرف سے ہٹ کر کی ہی نہیں جاتی۔ اتنی بات سب جانتے ہیں کہ اردو ہندآریائی زبان ہے اور اس کا رسم الخط سامی خاندان سے ماخوذ ہے۔ اس سے اردو کے پھیلاؤ اور اس کے ثقافتی رابطوں کا پتا چلتا ہے لیکن حرف اور صوت کے رشتے کو صحیح طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے کام میں دشواریاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اردو میں ان دشواریوں کی طرف آج تک پوری توجہ نہیں کی گئی۔

مثال کے طور پر بالعموم لوگ اس بات سے واقف نہیں کہ اردو میں بنیادی مصوتوں کی تعداد دس ہے۔ بظاہر اردو میں مصوتوں کے لیے صرف تین علامتیں ہیں۔ ا، و، ی۔ ی کے دو روپ ہیں ی اور ے۔ ان میں سے واؤ اور یائے دوہری علامتیں ہیں، یعنی مصوتوں کے علاوہ یہ نیم مصوتوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً وہاں، یہاں، وہ، یہ وغیرہ کے شروع میں۔ باقی رہا الف یہ خالصتاً مصوتوں کے لیے وقف ہے۔ اردو میں تین اعراب خاص ہیں زیر، زبر اور پیش جن کا استعمال ابتدائی جماعت کے قاعدوں تک محدود ہے۔ اس کے بعد پڑھنے اور لکھنے میں ان کا چلن نہ ہونے کے برابر ہے۔ غرض اتنی کم علامتوں سے اردو میں ہم دس بنیادی آوازوں کا کام لیتے ہیں۔ بحث اس سے نہیں کہ یہ ہماری زبان کی قوت ہے یا کمزوری بلکہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ زبان کے مطالعے میں سب سے پہلی بات جس پر لسانیات زور دیتی ہے، یہی ہے کہ اس کی آوازوں کے بارے میں پوری واقفیت و آگہی حاصل کی جائے، تبھی صحیح معنوں میں معلوم ہوگا کہ ہم جو موقع ومحل کی رعایت سے دین کو کبھی دہِن اور کبھی دَین، پیر کو کبھی پِیر اور کبھی پَیر، تو کو کبھی تو اور کبھی تُو یا میل کو مِیل یا مَیل، یا پھر مول کو مؤل یا مَول پڑھتے ہیں تو وہ بلاوجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے آوازوں کا ایک پورا نظام ہے جسے ذرا سی کوشش سے سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک مثال اور لیجیے۔ مصوتوں کے معاملے میں آپ نے دیکھا کہ اردو میں آوازیں زیادہ ہیں اور علامتیں کم ہیں، لیکن مصمتوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان

میں بعض آوازیں ایسی ہیں کہ ان کے لیے دو دو نہیں بلکہ تین تین چار چار علامتیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر /h/ کے لیے ہ اور ح، /t/ کے لیے ت اور ط، /s/ کے لیے س، ث اور ص؛ یا پھر /z/ کے لیے ذ، ز، ظ اور ض موجود ہیں۔ یہ علامتیں اردو کے لیے ناگزیر ہیں[1] لیکن حرف کی اندھی غلامی کو قبول کرتے ہوئے بعض اوقات اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ اردو میں ذ، ز، ظ اور ض الگ الگ آوازیں ہیں تو اس کا جواب صرف یہی ہے کہ ایسا سمجھنا دن کو رات کہنے پر اصرار کرنا ہے۔ اگر تابع، طابع، ثواب، صواب، یا زن، ظن جوڑوا میں ایک لفظ کے معنی دوسرے سے مختلف ہیں یعنی ت اور ط، ث اور ص، یا ز اور ظ آوازیں معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں تو اردو میں ایسا ازروئے صوت نہیں بلکہ ازروئے اصل ہے۔ اصل سے یہاں مراد ان الفاظ کی اصل زبان ہے۔ اردو میں یہ مستعار الفاظ ہیں۔ ان کی اصل زبان میں ث اور ص یا ز اور ظ میں فرق ہے، اس لیے یہ آوازیں وہاں معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں۔ اگر اردو میں معنی کا فرق قائم رہا تو وہ اس لیے کہ یہ فرق اصل زبان سے چلا آتا ہے، اس لیے نہیں کہ اردو میں بھی ث ص، یا ز ظ الگ الگ آوازیں ہیں۔ یہ بات صوت کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے کہ حرف کی سطح پر کچھ قبول کرنا ایک چیز ہے اور صوتی سطح پر کچھ قبول کرنا دوسری۔ اردو نے ایک چیز لے لی ہے، دوسری کو رد کر دیا ہے۔ لسانیات کے پاس عقیدے کی آنکھ نہیں ہے، نہ ہی اس کے پاس جذبے کی دھڑکنیں ہیں۔ یہ سائنس ہے اور اس کا کام حقائق سے بحث کرنا ہے۔ اردو میں اس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہم ماضی کے بوجھ سے نڈھال ہیں۔ ماضی کا شعور اچھی چیز ہے، لیکن اگر یہ پاؤں کی زنجیر بن جائے تو ترقی کی راہیں مسدود ہو سکتی ہیں، لسانیات قدر (Value) سے نہیں، حقائق (Fact) سے بحث کرتی ہے۔ روایت کے صالح اور بے جان حصے میں فرق کرتی ہے اور زبان کے عناصر کو جیسے وہ ہیں اصلی روپ میں پیش کرتی ہے۔

اردو میں علامتوں ہی کو زبان سمجھنے کی ایک اور دلچسپ مثال اس صوتی

---

1 اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون ''اردو رسم الخط: تہذیبی اور لسانیاتی مطالعہ''

خصوصیت کی ہے جسے ہم ہمزہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اردو میں صدیوں سے ایک رسم چلی آتی ہے کہ اٹھئے، کیجئے، چاہئے، لئے، دئے، کئے وغیرہ الفاظ کو ہمزہ سے لکھتے ہیں، سو سب آنکھیں بند کیے اسی لکیر کو پیٹے چلے جارہے ہیں۔ ابتدائی اسکولوں کا کیا ذکر ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کتنے لوگ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ ہمزہ آخر استعمال کس لیے کیا جاتا ہے؟ اردو کے صوتیاتی نظام میں وہ کون سی آواز ہے جس کے لیے ہم اس علامت کو استعمال کرتے ہیں؟ عربی میں ہمزہ کی حیثیت ایک مصمتے کی ہے جبکہ اردو میں یہ مصمتہ نہیں۔ یہ دو مصوتوں کے جوڑ کو ظاہر کرتا ہے جیسے گئی، کوئی، آؤں، جاؤں میں ə اور i کا جوڑ یا کوئی میں o اور i کا جوڑ۔ دوسری طرف لیے، دیے، کیے وغیرہ الفاظ ہیں، جن میں عام لوگ تو کیا اردو کے اچھے اچھے ادیب بھی اوپر ہمزہ لکھتے ہیں اور نیچے دو نقطے بھی لگا دیتے ہیں۔ اردو میں اس کا رواج اب ''غلط العام'' کا درجہ حاصل کرچکا ہے۔ ہمارے ہاں اتنا سر کھپانے کی ضرورت کسے ہے کہ یہ سوچے کہ کیا لیے، دیے، کیے اور آئے، جائے، گئے میں درمیانی آواز ایک جیسی ہے یا اس میں کوئی فرق ہے! یہ مضمون اردو رسم الخط پر نہیں، ورنہ اس موضوع پر اظہار خیال کیا جاتا کہ اردو میں ہمزہ کے استعمال کے اصول کیا ہونے چاہئیں۔[1] اس وقت جس بات پر زور دیا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ حرف اور صوت کے باہمی رشتے سے بے توجہی کی جیسی مثالیں اردو میں پائی جاتی ہیں، کسی دوسری زبان میں کم ملتی ہیں۔ اس میں عام پڑھنے والوں کا کیا قصور جب خود پڑھانے والوں کو خبر نہیں کہ جس علامت کو وہ استعمال کرتے ہیں، اسے کیوں استعمال کرتے ہیں۔ لسانیات زبان میں رسم و رواج یا روایت کے خلاف جہاد کا نام نہیں، لیکن اس لحاظ سے یہ بُت شکن ضرور ہے کہ یہ زبان کے پڑھنے اور پڑھانے والے کو ایک نئی نظر اور نیا ذہن دیتی ہے۔

ہم نے اس مضمون کے شروع میں کہا تھا کہ زبان کی تعلیم کے نقطۂ نظر سے ہم صرف خاص خاص باتوں کو لیں گے۔ ایک یہ کہ زبان آوازوں کا مجموعہ ہے

1 اس مسئلے پر ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون ''ہمزہ کیوں''

اور صوت حرف پر مقدم ہے۔ اس کی طرف کچھ اشارے کیے گئے۔ دوسری بات یہ کہی گئی تھی کہ Language has a system یعنی زبان کا اپنا نظام ہوتا ہے۔ یہ نظام زبان کی ہر سطح پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ماہرین لسانیات نے زبان کی تین سطحوں (Hierarchies) کو تسلیم کیا ہے۔ ایک Phonology یعنی صوتیات دوسری Morphology یعنی لفظیات اور تیسری Syntax یعنی نحو۔ زبان کے نظام کی کارفرمائی ان سب سطحوں پر دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں مثال کے لیے ہم صرف Syntax یعنی جملے کو لیں گے۔ لیکن اس سے پہلے دو ضمنی باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

پہلے یہ کہ جدید لسانیات میں گرامر کا تشکیلی (Transformational) نظریہ پیش کرنے والے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جملے کی نحوی صحت (Grammaticalness) کا کوئی تعلق معنی (Meaning) سے نہیں ہے۔ یہ بحث خاصی پیچیدہ ہے لیکن اسے مختصراً ان دو جملوں کی مدد سے سمجھایا جاسکتا ہے۔

بے رنگ سُرخ پہاڑ بے تحاشا ناچتے ہیں۔

بے ناچتے رنگ پہاڑ تحاشا بے ہیں سُرخ۔

بظاہر یہ دونوں جملے بے معنی ہیں لیکن اردو جاننے والا کوئی بھی شخص یہ بتا سکتا ہے کہ پہلا جملہ نحوی طور پر صحیح یعنی Grammatical ہے اور دوسرا غلط، یعنی Ungrammatical ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبان کا ڈھانچہ (Structure) معنی سے الگ اپنی آزادانہ حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح گرامر اور معنیات (Semantics) زبان کے اندر دو الگ الگ سطحیں (Hierarchies) ہیں، اسی طرح گرامر اور اسٹائل یعنی اسلوب بھی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ زبان میں الفاظ کس طرح بنتے ہیں اور وہ کس ترتیب سے جملے میں واقع ہوتے ہیں، یہ گرامر ہے اور ہزاروں الفاظ میں سے کن کو لیا جائے اور کس موقع پر کس طرح استعمال کیا جائے، یہ اسٹائل ہے۔ اسٹائل میں گرامر کی پابندی لازمی ہے ورنہ جملہ غلط ہوکر رہ جائے گا جبکہ گرامر میں اسٹائل کا عمل دخل نہیں۔ گرامر کا تعلق زبان کے نظام سے ہے جبکہ اسٹائل نام ہے اس نظام کے اندر رہتے

ہوئے اپنی پسند، اپنے ذوق اور اپنی تخلیقی حِس کے ثبوت دینے کا۔ اردو میں یہ فرق پوری طرح نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی تہذیبی اور سماجی وجوہ ہیں، یعنی ہماری زبان نے شاعری کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ جس سماج میں یہ پروان چڑھی تھی وہ داستانیں سنتا اور شعر میں خط لکھتا تھا۔ ہمارے ہاں یہ روایت رہی ہے کہ شاعری ادب ہے اور ادب زبان ہے۔ علمی اردو نثر کی عمر ایک ڈیڑھ صدی سے کم نہیں، لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہمارے ہاں افسانے کی زبان، ناول اور ڈرامے کی زبان، اور تو اور ہماری تنقید اور تحقیق کی زبان ہنوز شعر کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوسکی۔ ہمارے نثر نگاروں کی ایک بڑی تعداد آج بھی شعر کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتی اور محض رنگینیِ بیان ہی کو اچھی نثر سمجھتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں زبان اور اسٹائل کو خلط ملط کیا جاتا ہے۔ ہمارا ادیب زبان پر قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اسٹائل کا احساس ضرور رکھتا ہے۔ اکثر و بیشتر اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا میدان یا موضوع کیسی نثر کا تقاضا کرتا ہے لیکن وہ اسٹائل اڑانے یا اپنانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ نتیجہ ژولیدگیِ بیان ہے اور تضییعِ اوقات۔ یوں اس کی بڑی ذمہ داری ہمارے ابتدائی نصاب پر ہے۔ اردو کے ابتدائی انتخابات اٹھا کر دیکھ جائیے، زیادہ تر اقتباسات ایسے ملیں گے، جن کو محض اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ ان کی نثر حسین ہے۔ حسین نثر اور اچھی نثر میں جو فرق ہے، اسے نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے انتخابات نہ ہونے کے برابر ہیں، جن میں زبان کو محض زبان کی حیثیت سے یا نثر کو اچھی نثر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔

اس وضاحت کے بعد سب سے پہلے مروجہ گرامروں کو لیجیے، جنھیں لسانیات کی اصطلاح میں روایتی گرامریں (Traditional Grammars) کہا جاتا ہے۔ ان گرامروں میں زبان کے نظام کو جامعیت اور قطعیت کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ایسی گرامروں کا ایک بنا بنایا فریم پہلے سے موجود ہوتا ہے اور جس زبان کی گرامر لکھی جانی مقصود ہو، اس کو اس فریم میں فٹ کرکے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کا دار و مدار بعض تصورات (Concepts) پر ہوتا ہے۔ مثال

کے طور پر، ''جملہ الفاظ کے ایسے مجموعے کا نام ہے جس سے بات پورے طور پر سمجھ میں آئے''۔[1] اس تعریف سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں ''بات'' سے کیا مراد ہے۔ جواب میں کہا جائے گا، وہ چیز جو ایک ''جملے'' میں بیان ہو یعنی جملے کی تعریف بات کی تعریف کے بغیر ممکن نہیں اور بات کی تعریف بغیر جملے کی تعریف کے ممکن نہیں۔ اس سے دلیل کی تدویر (Circularity) ظاہر ہے جو منطق میں قابل قبول نہیں۔ ایسی تعریفیں (Definations) کبھی جامع و مانع نہیں ہوسکتیں۔ مثال کے طور پر ابھی کہے گئے جملے کو لیجیے۔ یہ لفظ ''ایسی'' سے شروع ہوا ہے۔ ظاہر ہے ''ایسی'' کا ربطِ معنوی اس پیراگراف میں کسی دوسرے جملے یا جملوں سے ہے۔ گویا جو بات اس جملے میں کہی گئی ہے وہ ''پورے طور پر'' تبھی سمجھ میں آئے گی جب اس سے پہلے کا جملہ یا جملے بھی پڑھے جائیں۔ چنانچہ اگر مندرجۂ بالا تعریف کو صحیح مان لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس مضمون میں ایک جملے یا پیراگراف کا دوسرے جملے یا پیراگراف سے کوئی معنوی ربط نہیں ہے۔

یا پھر فعل کی تعریف لیجیے۔ ''فعل وہ ہے کہ جس سے کسی شے کا ہونا یا کرنا ظاہر ہوتا ہے''۔[2] اگر یہ صحیح ہے تو پھر رفتار، چال، اٹھان، آوارگی، اُچھل کود وغیرہ الفاظ کو بھی فعل قرار دینا ہوگا کیونکہ ان میں بھی تو کسی شے کا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

نیز صفت کی تعریف دیکھیے۔ ''صفت وہ (الفاظ) ہیں جو کسی کی حالت یا کیفیت ظاہر کریں''۔[3] اس تعریف کی رو سے ''خالی گھر'' میں خالی صفت ہے اور گھر اسم۔ اسی طرح ڈاک گھر میں پہلا لفظ صفت ہے اور دوسرا اسم۔ لیکن ادنیٰ تامل سے ہم محسوس کرسکتے ہیں کہ دونوں ترکیبوں کی ساخت میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ یعنی خالی گھر، اجاڑ گھر، نیا گھر تو ایک طرح کی ترکیبیں ہیں اور ڈاک گھر دوسری طرح کی۔ مگر مندرجۂ بالا تعریف کی روشنی میں ان سب میں پہلا لفظ ''اسم کی حالت

---

1 مولوی عبدالحق : اردو صرف و نحو، طبع 1957، ص 107

2 ایضاً، ص 44

3 ایضاً، ص 27

کیفیت یا کمیت کو ظاہر کرتا ہے''۔ صفت کا یہ تصور زبان کے ڈھانچے سے پورا انصاف نہیں کرسکتا۔ روایتی گراموں کی اصطلاح میں ترکیب ''ڈاک گھر'' کے بارے میں یہ پوچھنا کہ اس میں لفظ ڈاک اسم ہے یا صفت ایسے ہی ہوگا جیسے پوچھا جائے کہ فلاں جلسے میں لوگ کتنے تھے اور مرد اور عورتیں کتنی؟

پرانے انداز کی روایتی گراموں پر لسانیات کی دنیا میں ایک مدت سے اعتراض کیے جا رہے ہیں۔ جن ماہرین نے جملے کے تجزیے کے نئے طریقے اور نظریے پیش کیے ہیں ان میں Lamb, Hockett, Harris, Wells, Block, Pike کے کام کی بڑی اہمیت ہے لیکن حال ہی میں میسوچوسٹس کے ادارۂ ٹیکنالوجی کے لسانیات کے پروفیسر Noam Chomsky نے Transformational Grammar یعنی تشکیلی گرامر کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے[1] اس سے لسانیات کی دنیا میں انقلاب سا آگیا ہے۔ چامسکی اپنے سے پہلے کے ماہرینِ لسانیات کی گراموں کو مجموعی طور پر Phrase Structure Grammars کا نام دیتا ہے۔ چامسکی کو ان گراموں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ Structure یعنی لسانی ڈھانچے کی صرف ظاہری سطح پر کام کرسکتی ہیں۔ اس کی اندرونی پیچیدگی کا ساتھ دینا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے برعکس چامسکی جملوں کی ساخت کے اندرونی باہمی ربط کو سمجھنے کے لیے بعض واضح اور آسان تشکیلی قوانین (Transformational Rules) کو استعمال کرتا ہے جن کی بنیاد علامتی منطق (Symbolic Logic) پر رکھی گئی ہے۔

چامسکی کے نزدیک جملے دو طرح کے ہوتے ہیں Kernel یعنی اصلی اور Derived یعنی ماخوذ۔ سادے بیانیہ جملوں کو وہ Kernel جملے کہتا ہے اور باقی سب کو ان سے ماخوذ بتاتا ہے۔ Kernel جملوں کا تجزیہ وہ ترکیبی قوانین (Phrase Structure Rules) کی مدد سے یعنی Y ⟵ X سے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ Kernel جملہ لیجیے:

وہ لڑکا نئی کتاب پڑھتا ہے۔

---

1 Noam Chomsky, Syntactic Structures, The Hague, 1962

X ⟵ Y کی مدد سے اس کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے: ظاہر ہے کہ جملے میں نحوی تقسیم کی پہلی لکیر لڑکا اور کتاب کے درمیان کھینچی جائے گی، گویا:

1. S ⟶ NP + VP
2. NP ⟶ M + N
3. VP ⟶ NP + V
4. M ⟶ وہ، نئی، ایک وغیرہ
5. N ⟶ لڑکا، کتاب، عمر، زید، بکر وغیرہ
6. V ⟶ پڑھتا ہے، لکھتا ہے، دیکھتا ہے وغیرہ

اس تجزیے کو زیادہ واضح طور پر اس خاکے کی مدد سے پیش کیا جاسکتا ہے:

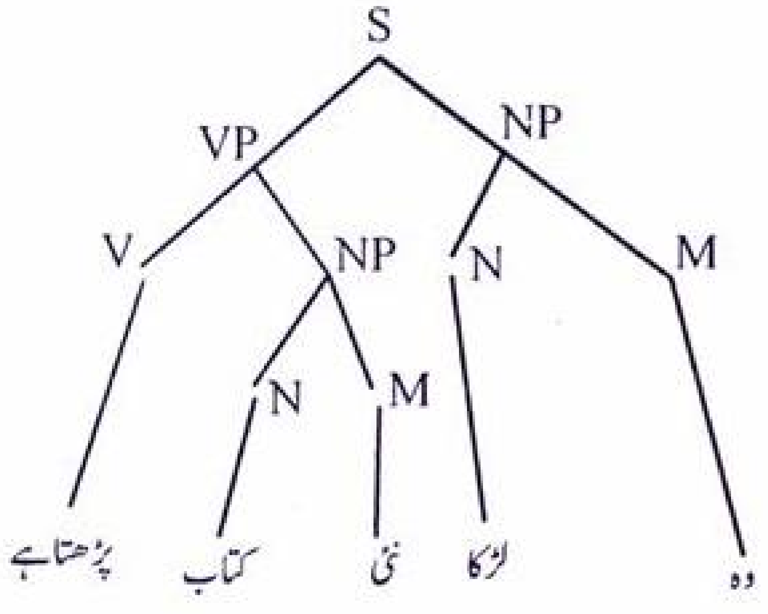

اب ان Phrase Structure Rules کے ایک سٹ کی مدد سے ان گنت Kernel جملے وضع کیے جاسکتے ہیں۔ (اتنی بات واضح رہے کہ زبان میں جملوں کی ساخت (Structure) کے انداز (Patterns) متعین ہیں۔) لیکن ان میں جو جملے وضع کیے جاسکتے ہیں، ان کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ زبان میں جملوں کی تعداد ان گنت ہے کیونکہ زبان میں طویل ترین جملہ کوئی نہیں۔ سادہ جملوں کی حد تک ترکیبی قوانین (Phrase Structure Rules) نہایت کامیاب ہیں لیکن اگر ماخوذ (Derived) جملوں کا تجزیہ بھی ان کی مدد سے کیا جائے تو گرامر کا کام سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ ان کے لیے چامسکی نے

Transformational Rules یعنی تشکیلی قوانین کا نیا تصور پیش کیا ہے جن کی مدد سے Kernel جملوں کے اجزا کو گھٹایا بڑھایا یا تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر W + X + A اور W + Y + A دو جملے ہوں اور X اور Y ان جملوں کے باہم مختلف لیکن ماخذ کے اعتبار سے ایک جیسے اجزا ہوں تو مندرجۂ ذیل طریقے سے ایک نیا جملہ وضع ہو سکتا ہے۔

W – Y + اور + X – A ← W – Y – A + W — X — A

فرض کیجیے، وہ دو جملے یوں ہیں :

(1) زید — انگریزی — پڑھ سکتا ہے (W + X + A)

(2) زید — عربی — پڑھ سکتا ہے (W + Y + A)

اب مندرجۂ بالا تشکیلی قانون (T. Rules) کی مدد سے تیسرا جملہ یوں بن سکتا ہے :

(3) زید — انگریزی اور عربی — پڑھ سکتا ہے (W – Y+ اور + X – A)

اسی طرح منفی، غیر منفی اور سوالیہ، غیر سوالیہ جملوں میں جو اندرونی ربط ہے، اسے بھی تشکیلی قوانین کے ذریعے پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ Kernel جملہ لیجیے :

زہرہ نے آئس کریم کھائی۔

فرض کیجیے کہ ہم اس کے اجزا کو Z + Y + X سے ظاہر کریں گے۔ اب اس سے ہاں یا نہیں کے جواب والا سوالیہ جملہ وضع کرنا ہے جو ''کیا'' کے اضافے سے بنتا ہے۔ اگر ''کیا'' کو A فرض کرلیا جائے تو سیدھا سا تشکیلی قانون یوں ہوگا :

Z + Y + X + A ← Z + Y + X

زہرہ نے + آئس کریم + کھائی ← کیا + زہرہ نے + آئس کریم + کھائی

غرض اس طرح قانون کی مدد سے ہزاروں ماخوذ جملے وضع کیے جا سکتے ہیں لیکن کیا آم نے آئس کریم کھائی یا کیا پتھروں نے دودھ پیا وغیرہ ماخوذ جملے ناممکن ہیں کیونکہ اردو میں ''آم نے آئس کریم کھائی'' یا ''پتھروں نے دودھ پیا'' وغیرہ اصل

(Kernel) جملوں کا وجود ہی نہیں۔

غرض زبان کا تجزیہ تشکیلی نظریے (Transformational Theory) کی مدد سے منطقی طور پر اور سائنسی صحت سے کیا جاسکتا ہے۔ بعض ابتدائی اور بنیادی تشکیلی قوانین کی مثالیں پیش کی گئیں۔ اس طرح کی گرامر پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہوسکتا ہے کہ یہ جب تیار ہوگی تو اچھا خاصا الجبرا معلوم ہوگی جسے پڑھتے ہوئے سر چکرائے گا اور ذہن پریشان ہوجائے گا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ نیا ریاضی بھی شروع میں خاصا پیچیدہ معلوم ہوتا تھا۔ معاملہ چلن کا ہے۔ بنیادی طور پر تشکیلی گرامر کے اصول اور قوانین نہایت سادہ ہیں اور ان میں نئے دور کے برقیاتی ذہن کا ساتھ دینے کی صلاحیت بھی ہے۔

چامسکی کے نظریے کی رُو سے تشکیلی گرامر کے تین حصے ہوں گے۔ پہلا ترکیبی قوانین (P. S. Rules) کے لیے وقف ہوگا، دوسرے میں تمام تشکیلی قوانین (T. Rules) درج کیے جائیں گے اور تیسرے میں صوتیات (Phonological) اور لفظیات سے متعلق (Morphological) قوانین ہوں گے۔ بلوم فیلڈ کے زمانے کی لسانیات میں گرامر کی بحث آواز سے شروع کی جاتی تھی اور جملے پر ختم ہوتی تھی۔ چامسکی کے ہاں اس کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔ یعنی اب زبان کی بحث S یعنی جملے سے شروع ہوا کرے گی اور آوازوں پر ختم ہوگی۔

تشکیلی گرامر کا نظریہ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے لیکن زبان کے اسکالروں کو ایک بار تو اس نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دور مشین اور برقیاتی ذہن کا دور ہے۔ لسانیاتی تجزیہ اب صرف ماہرِ لسانیات کے تصرّف میں نہیں رہا بلکہ ریاضی داں، منطق داں اور طبیعیات، برقیات اور سمعیات کے ماہرین بھی اس میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان تمام شعبوں میں تشکیلی نظریے (Transformational Theory) پر خاصی بحث ہورہی ہے۔ اس کی روشنی میں بعض زبانوں کے تجزیے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں اس کی تکمیل سے خاصا فائدہ ہوگا۔ اس کے امکانات کا تصور یوں کیا جاسکتا ہے کہ اس

کی مدد سے زبان کے پیچیدہ نظام کو تھوڑے سے قوانین میں پوری جامعیت اور قطعیت کے ساتھ سمیٹا جاسکتا ہے۔ یہ قوانین اس انداز سے مرتب کیے جائیں گے کہ برقیاتی ذہن (Electronic Computer) کو "ہضم" (Feed) کرائے جاسکیں، جن کی بدولت علامتیں الفاظ میں ڈھلیں گی اور الفاظ خود بخود آوازوں میں تبدیل ہوتے جائیں گے۔ آخر میں انھیں مشین ٹائپ کر کے پیش کردے گی۔ اس سے مشینی ترجمے کا خواب بھی رفتہ رفتہ شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا یعنی زبانوں کے کامیاب تجزیے کے بعد انگلی کے ایک اشارے سے ایک زبان کے جملے خود بخود دوسری زبان کے ہم معنی جملوں میں ڈھل سکیں گے۔ یہ سوچنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کے بعد زبانوں کی الگ الگ حد بندی کس قدر قابل تسخیر معلوم ہوگی اور لسانی سطح پر ہم آہنگی کے امکانات کس قدر بڑھ جائیں گے اور خود ہندوستان میں علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں مدد ملے گی۔ شاید یہ منزل ابھی دور ہے لیکن تبدیلیاں نہایت تیزی سے رونما ہورہی ہیں۔

لسانیات میں روز بروز معلومات کے نئے افق سامنے آرہے ہیں۔ لسانیات کی دنیا تجربے کی دنیا ہے۔ اس سے زبان کے مطالعے میں بیش بہا مدد لی جاسکتی ہے، جس کے صرف چند پہلوؤں کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اگر اردو جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتی ہے تو اس کو مستقبل میں لسانیات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا ہوگا۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا لسانیات کی روشنی عام ہوگی۔

(نقوش 1968)

ہمزہ کیوں؟

یہ غلط فہمی عام ہے کہ لسانیات اُردو رسم الخط میں ہمزہ کو گردن زدنی سمجھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی اردو صوتیات کی بحث ہوتی ہے، ہمزہ کو ''علامتِ بے صوت'' کہا جاتا ہے، اور یہ غلط بھی نہیں۔ اپنے کتابچے ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' (دہلی 1963) اور اپنی دوسری تحریروں مین بھی جہاں ہمزہ کا ذکر آیا ہے، میں نے یہی عرض کیا ہے؛ لیکن ان سب میں بحث آواز کی تھی، علامت کو باقی رکھنے یا نہ رکھنے کی نہیں۔ جنوری 1966 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب پر جو سمینار ہوا تھا، اس میں بھی ہمزہ کا ذکر برسبیل تذکرہ آیا تھا:

> ''اُردو میں صدیوں سے ایک رسم چلی آتی ہے کہ اٹھئے، کیجئے، چاہئے، کئے، دئے، لئے وغیرہ الفاظ کو اکثر ہمزہ سے لکھتے ہیں، سو سب آنکھیں بند کیے اسی لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ابتدائی اسکولوں کا کیا ذکر، ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کتنے لوگ یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ ہمزہ آخر استعمال کس لیے کیا جاتا ہے؟ اردو کے صوتیاتی نظام میں وہ کون سی آواز ہے جس کے لیے ہم اس علامت کو استعمال کرتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ عربی میں ہمزہ کی حیثیت ایک مصمتے کی ہے جبکہ اُردو میں یہ مصمتہ نہیں۔ اُردو میں اس کی اپنی الگ سے ایسی کوئی آواز نہیں، جیسی کسرہ یا فتح کی ہے؛ اس لیے اسے علامتِ بے صوت کہنا مناسب ہوگا۔ بعض الفاظ میں عام لوگ تو کیا اُردو کے اچھے اچھے ادیب بھی اوپر ہمزہ لکھتے ہیں اور نیچے دو نقطے بھی لگا دیتے ہیں۔ اردو میں اس کا رواج اب 'غلط العام' کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یہ مضمون اردو رسم الخط پر نہیں، ورنہ ہم اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے کہ اُردو میں ہمزہ کی علامت گردن زدنی ہے کہ نہیں۔ اس وقت جس بات پر زور دیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ حرف و صوت کے باہمی رشتے سے بے توجہی کی جیسی مثالیں اردو میں

ملتی ہیں، کم زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں عام پڑھنے لکھنے والوں کا کیا قصور، جب خود پڑھانے والوں کو خبر نہیں کہ جس علامت کو وہ استعمال کرتے ہیں، اُسے کیوں استعمال کرتے ہیں''۔

اس بیان سے یہ غلط نتیجہ نکالا گیا کہ لسانیات ہمزہ کے خلاف ہے اور ایک صاحب نے تو ''ہماری زبان'' میں مفصل مضمون بھی لکھا، لیکن جیسی کہ ان سے توقع تھی، انھوں نے نہ تو لسانیات کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور نہ ہی موضوع سے پورا انصاف کیا۔ مندرجۂ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ اعتراض اس پر نہیں تھا کہ ہمزہ اردو میں کیوں استعمال ہوتا ہے، بلکہ اعتراض اس پر تھا کہ اردو لکھنے والوں پر حرف وصوت کا رشتہ پوری طرح واضح نہیں، اس لیے ہمزہ کا استعمال کئی لفظوں میں غلط ہوتا ہے۔ زیرِنظر مضمون کا مقصد یہی ہے کہ ہمزہ کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کیا جائے، صوتیات کی مدد سے ہمزہ کا صحیح منصب معلوم کیا جائے اور اردو رسم الخط میں اس کے استعمال کے اصولوں اور حدود کا پتہ چلایا جائے۔ اس کے بعد یہ آسانی سے معلوم ہو سکے گا کہ ہمزہ اردو رسم الخط میں کیوں ناگزیر ہے اور یہ کہاں کہاں صحیح استعمال ہوتا ہے اور کہاں کہاں غلط۔

حرف ہمزہ اصلاً عربی ہے۔ یہ بعد میں فارسی میں رائج ہوا اور فارسی کے توسط سے اردو میں آیا۔ عربی میں ہمزہ دو طرح کا ہے: ہمزۃ القطع اور ہمزۃ الوصل۔ اول کو ہمیشہ ظاہر کیا جاتا ہے، دوسرا بعض حالتوں میں حذف کر دیا جاتا ہے۔ ہمزۃ القطع لفظ کے شروع، درمیان اور آخر میں ہر جگہ آتا ہے۔ لفظ کے شروع میں اسے ہمیشہ الف کے ساتھ لکھتے ہیں۔ عربی کے املائی تصور کے مطابق مصوتہ (vowel) سے شروع ہونے والا ہر لفظ حلقی بندشی (glottal stop) آواز سے ادا ہوگا جسے الف سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہمزہ مصمتہ (consonant) کا درجہ رکھتا ہے، لیکن عربی میں الف سے شروع ہونے والے ہر لفظ کا املائی مطلب یہ ہے کہ اس لفظ کے شروع میں مصوتہ (vowel) ہے۔[1]

1 فارسی گرامر، حصہ دوم، عربی، این لیمبڈن، کیمبرج یونیورسٹی، 1961، ص 185-182

(آغاز = أمر ، إبل ، أُفق
درمیان = رأس ، مؤمن ، سؤال
آخر = ضوء ، شیء ، سوء)

قواعد دانوں نے ہمزہ اور الف کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور ہمزہ متحرک۔ مگر ہمزہ اور الف کا یہ فرق بھی دراصل عربی ہے، فارسی نہیں۔

فارسی میں ہمزہ کی حلقی بندشی آواز برائے نام کہیں کہیں ادا ہوتی ہے اور ہمزہ کا استعمال زیادہ تر درمیانی حالت میں اور شاذ و نادر آخری حالت میں ہوتا ہے۔ بقول ایل ول سٹن کے فارسی میں ہمزہ کا درجہ ایک کمزور مصمتہ کا ہے۔[1] ڈاکٹر نذیر احمد کا بیان ہے: ''اگر یہ کہا جائے کہ ہمزہ فارسی میں صرف عربی لفظوں تک محدود رہا تو غلط نہ ہوگا''۔[2]

اردو میں تجزیے کے لیے سب سے پہلے ان دیسی اور مستعار الفاظ کو دیکھیے:

آشنائی، پائے، آئیں، کھاؤ، جاؤں، غائب، ہیئت

تلفظ کے اعتبار سے ان الفاظ کو صوتیاتی رسم الخط میں یوں لکھا جاسکتا ہے:

[āšnā + ī] [pā + ē] [ā + ẽ] [khā + ō] [jā + ũ] [gā + ɛb] [hai + at]

ان الفاظ میں جہاں جہاں بھی اردو رسم الخط میں ہمزہ آیا ہے، صوتیاتی رسم الخط میں اسے جمع کے نشان سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اب ان الفاظ میں جن دو آوازوں[3] کے درمیان جمع کا نشان ہے، وہ بالترتیب یوں ہیں:

[ā + ī] [ā + ē] [ā + ẽ] [ā + ō] [ā + ũ] [ā + ɛ] [ai + a]

ان چند الفاظ کے اس تجزیے کی روشنی میں مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے

---

1 دستور زبان فارسی، کیمبرج یونیورسٹی، 1963، ص 2، 20، 47۔

2 ''ہمزہ کا املا''، ہماری زبان، یکم اکتوبر 1956، ص 7

3 یہ مضمون چونکہ عام پڑھنے والوں کے لیے لکھا گیا ہے، اس میں جڑواں اور غیر جڑواں مصوتوں کا سوال عمداً نہیں اٹھایا گیا، کیونکہ اس سے ہمزہ کے استعمال میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

جا سکتے ہیں :

(1) بخلاف عربی کے اردو میں ہمزہ حلقی آواز نہیں ہے۔ اردو میں ہمزہ محض دو ساتھ ساتھ آنے والے مصوتوں (Conjunct Vowels) کے جوڑ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ الگ سے لکھے ہوئے دو دو مصوتوں کے جوڑ سے ثابت ہوتا ہے۔

(2) بخلاف عربی اور فارسی کے اردو میں ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں۔ مثلاً جاؤں میں پہلے مصوتے / ā / کے لیے الف اور دوسرے مصوتے / ũ / کے لیے واؤ موجود ہے۔ اسی طرح کھاؤ میں / ā / کے لیے الف اور / ō / کے لیے واؤ؛ آئیں اور پائے میں / ā / کے لیے الف اور / ɛ / کے لیے یائے مجہول؛ اور آشنائی میں / ā / کے لیے الف اور / ī / کے لیے یائے معروف موجود ہے۔ جب ہر جگہ مصوتوں کے لیے اپنی اپنی علامتیں موجود ہیں تو ہمزہ کی آواز کیا ہوئی؟ چنانچہ ثابت ہے کہ اردو میں ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں بلکہ یہ دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان کرتا ہے۔ گویا ہمزہ اردو میں علامت بے صوت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بے مصرف علامت ہے۔ اوپر کے تجزیے سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمزہ علامت بے صوت ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں ہمزہ کو املائی سہولت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اوپر کی مثالوں میں الف کے بعد واؤ یا یے کی آوازیں بغیر ہمزہ کے ادا ہو ہی نہیں سکتیں۔ البتہ آخری دو لفظوں یعنی ہیئت اور غائب سے شبہ ہوسکتا ہے کہ ان میں ہمزہ کی اپنی آواز ہے۔ ہیئت میں پہلا مصوتہ /ai/ یعنی یائے لین ہے اور دوسرے یعنی /a/ کے لیے سوائے ہمزہ کے کچھ بھی نہیں؛ اسی طرح غائب میں پہلا مصوتہ /ā/ یعنی الف ہے اور دوسرا یعنی /ɛ/ کے لیے سوائے ہمزہ کے کچھ بھی نہیں۔ تو کیا ان لفظوں میں ہمزہ بالترتیب /a/ اور /ɛ/ کی آواز دے رہا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ محض نظر کا دھوکہ ہے۔ /a/ اور [ɛ] دونوں چھوٹے مصوتے ہیں اور اُردو میں رواج ہے کہ چھوٹے مصوتوں کی

علامتیں یعنی فتح، کسرہ وغیرہ اکثر لگائی ہی نہیں جاتیں۔ یہی حال ان دونوں الفاظ کا ہے، ہیئت دراصل ہیَءَت ہے اور غائب دراصل غائِب ہے، یعنی ہیئت میں جہاں /a/ ہے وہاں دراصل ہمزہ پر فتح ہے اور غائب میں جہاں [ɛ] ہے وہاں ہمزہ کے نیچے کسرہ ہے لیکن چونکہ اردو میں /a/ اور [ɛ] بالترتیب فتح اور کسرہ کی آوازیں ہیں، اس لیے ہمزہ تو پہلے پانچ الفاظ کی طرح ان دو الفاظ میں بھی محض دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان ہے؛ آوازیں حسبِ سابق دوسری علامتوں کی ہیں۔ اُردو میں ہمزہ کی اپنی کوئی منفرد آواز نہیں، اور یہ ایک املائی علامت محض کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

(3) ہمزہ دیسی الفاظ اور عربی فارسی سے مستعار دونوں طرح کے الفاظ میں استعمال ہوتا ہے۔ اوپر کی مثالوں میں پہلے چار لفظ دیسی ہیں اور آخری تین مستعار۔

(4) یہ جان لینے کے بعد کہ بخلاف عربی اور فارسی کے اردو میں ہمزہ مصمتہ کا درجہ نہیں رکھتا، اور مستعار الفاظ کے علاوہ ہم اسے دیسی الفاظ میں بھی استعمال کرتے ہیں، یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو نے ہمزہ کو اپنی ضرورتوں کے لیے اپنا لیا ہے، یعنی ہم نے ہمزہ کی بقول برجموہن دتاتریہ کیفی ''تارید'' کرلی ہے۔

دیسی الفاظ

(5) اس وضاحت کے بعد اب ہم پہلے دیسی الفاظ کو لیں گے۔ جن دیسی الفاظ میں ہمزہ کا استعمال ہوتا ہے، ان میں نظر سب سے پہلے افعال پر پڑتی ہے۔ ان کی کئی تصریفی صورتوں کو اردو میں ہمزہ کے بغیر لکھنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر دیکھیے:

جانا سے جاؤں، جائیں، جاؤ، جائے
کھانا سے کھاؤں، کھائیں، کھاؤ، کھائے
آنا سے آؤں، آئیں، آؤ، آئے، علیٰ ہذالقیاس۔

جانا کی ماضی واحد مذکر 'گیا' ہے لیکن اس کی جمع مذکر 'گئے' واحد مونث 'گئی' اور جمع مونث 'گئیں' تینوں کو ہمزہ سے لکھا جاتا ہے۔ گیا میں نیم مصوتہ ي /y/ سے پہلے زبر ہے اور بعد میں الف؛ اس صوتی ماحول میں تو نیم مصوتہ اپنی آواز کو برقرار رکھتا ہے، جبکہ ی /i/ اور ے /e/ سے پہلے یہ اُن میں ضم ہوجاتا ہے۔ یہی حال کھانا، آنا وغیرہ دوسرے افعال کا ہے۔ ان کی ماضی واحد مذکر تو ي /y/ ہی سے لکھی جاتی ہے، لیکن ان کی تصریفی صورتیں یعنی کھائی، کھائیں، کھائے؛ آئی، آئیں، آئے ہمزہ سے لکھی جاتی ہیں۔

(6) اوپر ہم نے جانا، کھانا، آنا جن مصادر کو لیا، ان میں مادۂ فعل یعنی جا، کھا، آ الف پر ختم ہوتا ہے۔ اب ان افعال کو لیجیے جن کے مادۂ فعل واؤ پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً سونا، رونا، دھونا۔ ہمزہ کے استعمال کے سلسلے میں یہ افعال بھی الف پر ختم ہونے والے افعال کی شِق میں رکھے جاسکتے ہیں اور ان کی تصریفی صورتوں میں بھی ہمزہ اسی طرح آتا ہے جس طرح جانا، کھانا، آنا میں، مثلاً سوؤں، سوئیں، سوؤ، سوئے، سویا، سوئی، سوئیں وغیرہ۔ (البتہ ہونا کی ماضی ہوا اس اصول سے مستثنٰی ہے۔[1] اردو میں واؤ اور الف کے جوڑ پر ہمزہ نہیں لگتا، یعنی ہوٗا میں ہمزہ استعمال عام کے خلاف ہے؛ باقی ہوئی، ہوئیں، ہوئے سب ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں۔)

(7) یائے معروف اور مجہول پر ختم ہونے والے افعال کا معاملہ برعکس ہے۔ ان کی تصریفی صورتوں میں ہمزہ کا استعمال نہیں ہوتا؛ اس لیے کہ ان میں جہاں جہاں نیم مصوتہ ي آیا ہے، اس سے پہلے /i/ یعنی کسرہ ہے اور اس صوتی ماحول

1 برجموہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب منشورات میں ہوا کو جگہ جگہ ہمزہ کے ساتھ لکھا ہے (بعض اور حضرات کے ہاں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں) شاید اوّل تو اس لیے کہ ہوا (بمعنی باد) سے التباس نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ہوئے، ہوئی، ہوئیں، سب ہمزہ سے لکھے جاتے ہیں اور غالباً وجدانی طور پر یہ احساس کام کرتا ہے کہ جہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں گے انھیں ہمزہ سے ظاہر کیا جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہوا میں چلن اس کے خلاف ہے۔

میں نیم مصوتہ /y/ اپنی آواز برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کا صحیح املا نیم مصوتہ ي /y/ ہی سے ہے، مثلاً :

(یائے معروف) پینا سے پیوں، پئیں، پیو، پیے، پیا۔

اسی طرح جینا، سینا وغیرہ۔

کرنا سے کیا، کیے۔

(یائے مجہول) لینا سے لیا، لیے) علیٰ ہذا القیاس۔

(8) اسی طرح وہ تمام افعال جن کے مادۂ فعل مصمتہ پر ختم ہوں، مثلاً بیٹھ، لکھ، سن، دیکھ، ان کی محولہ بالا تصریفی صورتوں میں ہمزہ کے استعمال کا محل نہیں، اس لیے کہ ان میں دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(9) ہمزہ کا استعمال امر میں بھی ہوتا ہے، مثلاً جمع مخاطب جاؤ، کھاؤ، آؤ۔ لیکن املا کی گڑبڑ دراصل امرِ تعظیمی کی صورتوں میں ہوتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ امرِ تعظیمی کے لیے مادۂ فعل کے بعد اِیے /iye/ بڑھا دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو : اٹھ /uṭh/ جمع /iye/ بنا /uṭhiye/۔ اس میں دو مصوتوں کا جوڑ سرے سے ہے ہی نہیں تو پھر اس میں ہمزہ کا استعمال کیا معنی؟ چنانچہ اُٹھ سے اُٹھئے غلط ہے اور اُٹھیے صحیح ہے، اسی طرح :

بیٹھ سے	بیٹھئے	غلط ہے	بیٹھیے	صحیح ہے	
لکھ ،،	لکھئے	،،	لکھیے	،،	
سن ،،	سنئے	،،	سنیے	،،	
چاہنا ،،	چاہئے	،،	چاہیے	،،	(جمع چاہئیں) صحیح ہے۔ علی ہذا القیاس

(10) اب اُن افعال کے امرِ تعظیمی کو لیجیے جو مصمتوں پر نہیں بلکہ مصوتوں پر ختم ہوتے ہیں۔

(الف) آنا، جانا، فرمانا وغیرہ۔ آ /ā/ جمع اِیے /iye/ بنا آیئے /ā + iyē/۔ واضح رہے کہ یہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں، اس لیے ہمزہ کا استعمال

ضروری ہے، یعنی آیئے، جایئے، فرمایئے میں ہمزہ لکھا جائے گا۔
(واوَ) سونا، رونا، دھونا وغیرہ۔ سو /sō/ جمع اِیئے /iyē/ بنا سویئے /sō+iyē/۔ پہلی مد کی طرح یہاں بھی دو مصوتے ساتھ ساتھ آرہے ہیں، اس لیے ہمزہ کا استعمال ضروری ہے، یعنی سویئے، دھویئے وغیرہ۔
(یائے معروف اور مجہول) پینا، سینا، لینا، دینا، کرنا (مادہ کرکے علاوہ کی)۔ قاعدہ ہے کہ ی /ī/ یا ے /ē/ پر ختم ہونے والے مادوں کے ساتھ اِیے /iyē/ نہیں ملایا جاسکتا اور ان کے بیچ میں تلفظ کی سہولت کے لیے ج /j/ بڑھا دیا جاتا ہے؛ یعنی پینا سے پی /pī/ + جِیے /jiyē/ بنا پیجیے /pījiyē/؛ اسی طرح سیجیے /sījiyē/، لیجیے /lījiyē/، دیجیے /dījiyē/، کیجیے /kījiyē/۔ ظاہر ہے کہ ان تمام الفاظ میں دو مصوتوں کا جوڑ نہیں ہے، اس لیے ان میں ہمزہ کا استعمال غلط ہے یعنی انھیں پیجیے، سیجیے، لیجیے، کیجیے لکھنا چاہیے۔ اردو میں ہمزہ کے استعمال میں سب سے زیادہ بے احتیاطی امرِ تعظیمی کی انھیں مندرجۂ بالا صورتوں میں برتی جاتی ہے۔

(11) یہ نہ سمجھا جائے کہ دیسی الفاظ میں صرف افعال میں ہمزہ استعمال ہوتا ہے؛ اسما اور اسمائے صفت میں بھی جہاں تلفظ میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں گے، اس لفظ کو ہمزہ سے لکھا جائے گا مثلاً لکھنؤ، کیکئی، بہرائچ، نیا سے نئی، بھائی، گہرائی، نائی، لمبائی وغیرہ۔

مستعار الفاظ

(12) ہمزہ سے لکھے جانے والے وہ الفاظ جو اُردو میں مستعمل ہیں، ان میں اچھی خاصی تعداد ان الفاظ کی ہے جن کے آخر میں یائے معروف ہے اور جن کے آخری صوتی رکن سے پہلے الف ہے، یعنی جن میں /ā/ اور /ī/ دو مصوتوں کا جوڑ ہے، مثلاً (اسما) آشنائی، رسوائی، گیرائی، رونمائی، شنوائی، شکیبائی، کج ادائی، حلوائی، خودستائی، خودنمائی، سرخروئی، رعنائی، دانائی، دلجوئی، نغمہ سرائی، رضائی،

دائی، یکجائی، یکتائی، شیدائی، خدائی، پذیرائی، بینائی، بے وفائی، بے نوائی، بے حیائی، شناسائی وغیرہ۔
(اسمائے صفت) آبائی، سودائی، گرمائی، سرمائی، انتہائی، صحرائی، تماشائی، حنائی وغیرہ۔
باقی الفاظ میں دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے اور ہمزہ سے لکھے جانے والے الفاظ کی کچھ مثالیں یہ ہیں:
(الف کے بعد ابتدائی) آئین، آئندہ، آئینہ، آئمہ۔
(عین سے پہلے آخری) صنائع، بدائع، ضائع، وقائع، ذرائع۔
(وسطی) شائستگی، پائیدار، جزائر، شرائط، حقائق، جائز، عائد، مسائل، ہیئت، تائید، پائجامہ، طاؤس، طوائف، زائد، جائیداد، جرائد، رائیگاں، جرائم، طائر، غائب، فائدہ، زائچہ، دائرہ، ذائقہ، تائب، خائف، انشائیہ، فائق، فضائل، عقائد، قبائل، قائل، قصائد، قائم، کائنات، مطمئن، ماؤف، کوائف، نائب، صائب، دائر، وظائف، عجائب، مؤنث، مؤرخ، متأثر، مؤلف، مؤثر۔
فارسی حاصل مصدر آزمائش، فرمائش، ستائش، آرائش کو اردو میں ہمزہ سے لکھنے کا رواج ہے۔ یہ الفاظ ازروئے اصل ی سے ہیں، لیکن اردو میں ان کا تلفظ نیم مصوتہ ی سے نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے معاملے میں اصل کی نہیں، بلکہ استعمال کی پیروی کرنی چاہیے۔ یوں بھی اردو میں قاعدہ ہے کہ نیم مصوتہ ی صرف اس حالت میں اپنی آواز کو برقرار رکھتا ہے جب اس سے پہلے کسرہ ہو (مثلاً کیے، لیے، دیے، چاہیے، لکھیے، ملاحظہ ہو پیراگراف سات)، جبکہ مندرجہ بالا الفاظ میں ایسا نہیں ہے۔ ان میں الف کے بعد وہی آواز نکلتی ہے جو غائب، تائب، نائب وغیرہ میں ہے۔ اس لیے ان کو ہمزہ سے لکھنا مناسب ہے۔

(13) مؤرخ، مؤلف، مؤنث، مؤثر، مؤذن وغیرہ لفظوں میں دو مصوتے ساتھ ساتھ ادا ہوتے ہیں، اس لیے ان کو ہمزہ سے لکھنا مناسب ہے۔

(14) مفرد الفاظ میں وسطی حالت میں جہاں ہمزہ کسرہ کے ساتھ آتا ہے، مثلاً

غائب، جائز، فائدہ، کائنات، آئندہ، عجائب، جرائد، رائگاں، وظائف، حقائق، زائد، صائب، تائب وغیرہ، فتح کی آواز تو وہی [a] کی رہتی ہے وہاں جیسے چل، پل، کل میں، لیکن کسرہ کا امالہ ہوجاتا ہے اور ان تمام الفاظ میں کسرہ بطور [i] یعنی دِل، مِل، سِل کی درمیانی آواز کی طرح نہیں بلکہ نسبتاً منھ کو کچھ کھول کر ادا ہونے والی آواز [ɛ] کی طرح بولا جاتا ہے۔

(15) ہمزہ کا قاعدہ ہے کہ اگر یہ صوتی رکن کے آخر میں آتا ہے تو یہ یا تو واؤ پر لکھا جاتا ہے (جاؤ، کھاؤ) یاے پر لگایا جاتا ہے (آئے، جائے) اور یا ی پر لکھا جاتا ہے (آئی، پائی، حنائی، شناسائی)۔ آخری دونوں صورتوں میں عمودی شوشے کا استعمال ہوتا ہے۔ واؤ پر لگنے والا ہمزہ خواہ وہ لفظ کے بیچ میں ہو، خواہ آخر میں، ہمیشہ اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے۔ الف اور واؤ کے بعد آنے والا ہمزہ بعض لفظوں میں شوشے کے ساتھ اور بعض میں اس کے بغیر لکھا جاتا ہے (آئیں، جائیں، جرائم، جائز، جرائد، روئیں، مؤنث، مؤرخ، مؤلف)۔

(16) اضافت : ہمزہ کے استعمال میں بے احتیاطی کی بعض مثالیں اضافت کی ذیل میں آتی ہیں۔ چنانچہ نیچے اضافت کے اصول مختصراً پیش کیے جاتے ہیں :

اگر مضاف ہائے مختفی پر ختم ہو تو اضافت ہمزہ سے لکھنی چاہیے، مثلاً جذبۂ دل، نالۂ دل، پایۂ دل، پایۂ تخت، بازیچۂ اطفال، تزکیۂ نفس، سانحۂ دردناک، مایۂ ناز، چشمۂ آب، خانۂ آباد، واقعۂ شب، منارۂ عظمت، گفتۂ غالب، غمزۂ دلربا، بادۂ ناب، قصۂ غم، دائرۂ کار۔

(17) اگر مضاف کے آخر میں ح آئے یا آخری ہ کی آواز تلفظ میں سنائی دیتی ہو تو اضافت زیر سے ظاہر کرنی چاہیے، مثلاً وجوہِ غدر، شبیہِ غالب، توجیہِ نادر، ماہِ نو، نگاہِ ناز، شبہِ حسن، کوہِ سلیمان، صبحِ وطن، فتحِ شام، وجہِ جواز، تہہِ دل۔

(18) اگر مضاف اُردو میں الف یا واؤ پر ختم ہو تو اضافت یائے مجہول پر ہمزہ سے لکھنی چاہیے، کیونکہ دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا محل ہے مثلاً صلائے

عام، اردوئے معلا، دریائے غم، اجزائے ترکیبی، روئے سخن، دنیائے اردو، ایفائے وعدہ، بازوئے قاتل، بوئے گل، بقائے دوام، سوئے وطن، خلفائے اسلام، مقتضائے حال۔

(19) اگر مضاف یائے معروف پر ختم ہو تو اضافت کسرہ سے ظاہر کرنی چاہیے، مثلاً تنگ ظرفیِ منصور، والیِ ریاست، رعنائیِ خیال، یکتائیِ معشوق۔ (رعنائی اور یکتائی میں ہمزہ اصل لفظ کا حصہ ہے، اضافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں)۔

(20) اگر مضاف یائے مجہول مابعد الف پر ختم ہو تو اضافت کے لیے ہمزہ لگے گا۔ اس لیے کہ اضافت کی آواز اور یائے مجہول کی آواز یعنی دو مصوتوں کا انضمام ہوجاتا ہے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی تعداد زیادہ نہیں : تنگ نائے غزل، آبنائے بلوچستان، رائے عالی۔[1] وہ الفاظ جن میں یائے مجہول الف کے بعد نہ ہو، بلکہ ماقبل مفتوح ہو، مثلاً پَے، مَے، ان کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کی آخری آواز /y/ اور اضافت کی /e/ میں انضمام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسے الفاظ کو کسرہ سے مضاف کرنا چاہیے، پَےِ مغفرت، مَےِ ہوش ربا، شَےِ لطیف۔

(21) اگر مضاف ہ کے علاوہ کسی بھی مصمتے پر ختم ہو تو اضافت ہمیشہ کسرہ سے لکھنی چاہیے، مثلاً وصلِ زنگارِ رخِ آئینہ، بقدرِ شوق، آئینِ نو، محبانِ اُردو، کارِ جواں مرداں، جانِ ناتواں، حسنِ توبہ شکن، دلِ دردمند، رخِ زیبا، دردِ دل وغیرہ۔ اسی طرح شمعِ وفا، رفعِ شر، سنہِ اشاعت۔[2]

(22) اضافت سے متعلق مندرجہ بالا تمام اصولوں کو تشکیلی گرامر (Transformative Grammar) کے ایک چھوٹے سے قانون میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے:

---

1 رائے چند، رائے بھولا ناتھ یا رائے صاحب فلاں میں رائے دیسی ہے۔ اس لفظ میں دو مصوتے ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمزہ کا استعمال مناسب ہے۔

2 سنِ اشاعت غلط ترکیب ہے، کیونکہ سن بہ معنی عمر ہے۔

برس چودہ کا یا کہ پندرہ کا سن جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن

		hamza		hāe muxtafi alif or wāō
Izāfat	⟶	yāē with hamza	after	yāē mujhul following ā
		kasra		otherwise

ایسے مختصر اور جامع قوانین کو زبان کے مباحث میں استعمال کرنے کی راہ چامسکی نے اپنی تشکیلی گرامر میں دکھائی ہے۔ ان پر علامتی منطق اور الجبرا کا اثر ظاہر ہے۔ یہاں تیر کے نشان کے معنی ہیں rewrite یعنی دوبارہ لکھو۔ اس کے بعد کھڑی لکیروں کی دو مستطیلیں ہیں۔ کھڑی لکیروں کا مطلب ہے کہ ان میں سے بہ یک وقت صرف ایک چیز لی جائے؛ اور ایک مستطیل سے جو چیز بھی لی جائے گی، اس کے ساتھ مقابل کی مستطیل سے اُسی کے سامنے کی چیز لینی ہوگی۔ مندرجۂ بالا قانون لفظ اضافت سے شروع ہوتا ہے یعنی اضافت ایک ذہنی تصور (abstraction) ہے۔ ابھی ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے۔ اب دونوں مستطیلوں سے پہلی چیز کو لیجیے تو اس کا مطلب ہوا کہ اضافت لکھی جائے گی ہمزہ سے اگر مضاف ختم ہو ہائے مختفی پر یا الف پر یا واوَ پر۔ اسی طرح اضافت لکھی جائے گی 'ئے' سے اگر مضاف ختم ہو 'ے' پر؛ اور اضافت لکھی جائے گی کسرہ سے دیگر تمام حالتوں میں۔

(23) شمع، رفع، دفع، نفع الفاظ اگرچہ ساکن الآخر ہیں لیکن اردو کی عام بول چال میں انھیں چھوٹے مصوتے /a/ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ مضاف حالت میں یہ /a/ تلفظ میں ساکت ہوجاتا ہے اور اضافت کا /ē/ باقی رہتا ہے۔ اس کے برعکس وہ الفاظ جو آخری /ē/ سے بولے جاتے ہیں، مثلاً وقائع، صنائع، ذرائع وغیرہ ان میں مضاف حالت میں اصل لفظ کی /ē/ کے بعد اضافت کی /ē/ مزید آتی ہے اور پہلی /ē/ دوسری /ē/ میں ضم ہوکر الگ سے اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ یعنی وقائع نعمت خانِ عالی میں وقائع کو مضاف تو کسرہ سے کیا جائے گا لیکن وقائع کی آخری /ē/ اور اضافت کی /ē/ کا انضمام ہوجائے گا۔

(واضح رہے کہ یہ اصول بنیادی زبان کے ہیں، شاعری میں عروضی ضرورتوں کی وجہ سے مصوتوں کی طوالت کو گھٹایا یا بڑھایا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمزہ کا استعمال یا اضافت کو ظاہر کرنے کے اصولوں میں بھی تبدیلی ہوجائے گی۔ مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل مصرعوں میں بازو اور گیسو کی اضافت کو بجائے ئے کے کسرہ سے ظاہر کرنا زیادہ مناسب ہوگا:

ع شایانِ دست و بازوِ قاتل نہیں رہا

ع گیسوِ تاب دار کو اور بھی تاب دار کر

نتائج

(24) اوپر کی بحث سے جو نتائج نکلتے ہیں، مختصراً وہ یوں ہیں:

(1) ہمزہ کے معاملے میں بنیادی چیز تلفظ ہے، اگر کسی لفظ میں دو مصوتے ساتھ ساتھ آئیں (رسائل، تائب، عجائب، فائدہ، کھائے، آؤ، گئے، فرمائیے، اُٹھائیے، آئیے، جائیے) تو اُسے ہمزہ سے لکھنا چاہیے، ورنہ نہیں۔ (ہونا کی ماضی ہوا اس کلیے سے مستثنٰی ہے)۔ یہ بھی واضح رہے کہ اردو میں دو مصوتوں کا جوڑ جہاں عین سے آتا ہے وہاں ہمزہ استعمال نہیں ہوتا۔

(2) جن الفاظ میں مصوتے اور نیم مصوتے میں ی کا جوڑ ہے، وہ ہمزہ سے نہیں لکھنے چاہئیں۔ (لیے، لیجیے، دیے، پیے، پیےجیسے، دیکھیے، سنیے، چاہیے، کیے، کیجیے، دیجیے)

(3) اضافت کے لیے ہمزہ صرف ان الفاظ پر لگتا ہے جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں (جذبۂ دل، نالۂ درد)، جہاں ہ تلفظ میں ادا ہوتی ہو، وہاں اضافت کسرہ سے لکھی جاتی ہے، (تہِ دل، وجہِ جواز، ماہِ نو)

(4) عربی الفاظ طلباء، انشاء، منشاء، امراء، وزراء، فقراء اُردو میں صرف آخری الف سے بولے جاتے ہیں یعنی ان میں دو مصوتوں کا جوڑ نہیں، اس لیے انھیں ہمزہ سے لکھنا مناسب نہ ہوگا۔ البتہ اگر پوری ترکیب عربی کی ہے تو وہاں ہمزہ کو

برقرار رکھنا چاہیے مثلاً انشاء اللہ، منشاء الرحمٰن، ذکاء اللہ، (یہی حال سوء اتفاق، سوء ظن، سوء ادب وغیرہ ترکیبوں کا ہے۔ لفظ سوء اردو میں مفرد استعمال نہیں ہوتا، اور یہ تراکیب جوں کی توں مستعار لی گئی ہیں، اس لیے ان میں ہمزہ کا استعمال جائز و درست ہے)۔

(5) اردو میں ہمزہ کی اپنی الگ سے کوئی آواز نہیں۔ البتہ اردو کے مستعار الفاظ میں لفظ مسئلہ کے تلفظ میں حلقی بندشی آواز (Glottal Catch) کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اردو میں جہاں عین کو حلقی کھٹک سے بولتے ہیں، وہاں یہی آواز ادا ہوتی ہے۔ مسئلہ یوں بھی اردو میں استثنائی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں دو مصوتے ساتھ نہیں آتے۔

(6) ہمزہ کو اردو نے اپنی ضرورتوں کے لیے اپنا لیا ہے۔ یہ علامتِ بے صوت ضرور ہے لیکن بے مصرف نہیں اور اردو املا کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ہمزہ دیسی اور مستعار دونوں طرح کے الفاظ کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ اور چونکہ دیسی الفاظ خصوصاً افعال کی تصریفی صورتوں کا استعمال مستعار الفاظ سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے، اس لیے ہمزہ کی پوری پوری تارید ہو چکی ہے۔

(7) اردو نے عربی، فارسی اور پراکرتوں سے بہت کچھ لیا ہے، لیکن اب اس کی حیثیت ایک آزاد زبان کی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا تجزیہ خود اس کی سطح پر آزادانہ کیا جائے۔ زیرِ نظر مضمون کی نوعیت اجتہادی نہیں، اشتہادی ہے۔ اس میں روایت سے خواہ مخواہ انحراف نہیں کیا گیا بلکہ اردو زبان کی سطح پر آزادانہ ہمزہ کے استعمال کا تجزیہ کر کے اس کے صحیح املا کے اصول معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدما نے ہمزہ کو اردو کی ضرورتوں کے لیے اپنایا تو وہ بلاضرورت نہیں تھا، کوئی نہ کوئی اصول (غیر واضح طور ہی پر سہی) اُن کے پیشِ نظر ضرور رہا ہوگا۔ زیرِ نظر مضمون میں اسی اصول کو صوتی سطح پر دریافت کر کے ہمزہ کے استعمال کے قاعدے سائنسی وضاحت کے ساتھ مرتب کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ صحیح املا کے لیے اس صوتی اصول کو سمجھنا اور ان قاعدوں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

(یہ مضمون پہلی بار کل ہند اورینٹل کانفرنس کے علی گڑھ اجلاس منعقدہ 1966 میں پڑھا گیا اور مئی 1967 میں ہماری زبان میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف رسالوں اور کتابوں میں نقل ہوا)۔

ن اور ں [1]

اردو میں نون [2] کی آواز کئی طرح سے ادا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نون اپنے بعد آنے والی بعض آوازوں سے ہم مخرج ہوکر بولا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر کندن، انڈا، رنج، تنگ اور جانا الفاظ میں ہر جگہ نون کے مخرج میں ذرا ذرا سا فرق پایا جاتا ہے۔ ایک ہی آواز کے یہ مختلف روپ آوازوں کی درجہ بندی کے لیے خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اب تک جن حضرات نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے، ان میں ڈاکٹر زور مرحوم، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر گیان چند کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر اس بات پر متفق ہیں کہ اردو میں نون کی بنیادی آواز ایک نہیں، دو ہیں یعنی ن اور ں۔ مجھے شروع ہی سے یہ تقسیم مناسب معلوم نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے کتابچے ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' کے دوسرے ایڈیشن میں نون کی مختلف شکلوں کی درجہ بندی محض مخرج کے اعتبار سے نہیں کی بلکہ اس کی صوتیاتی نوعیت کو بھی پیش نظر رکھا، اس طرح میں نے ہم مخرج نون اور نون کی دو مدیں قائم کیں۔ وسکانسن آنے کے بعد مزید مطالعے اور ماہرین سے تبادلۂ خیال کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ نون کی دو بنیادی آوازوں کے طور پر پیش کرنے کا نظریہ قرینِ صحت نہیں۔ اگر زبان کے مجموعی ڈھانچے کو نظر میں رکھا جائے تو نون کی مختلف شکلوں کی درجہ بندی نہایت آسانی سے واضح طور پر کی جاسکتی ہے۔ ان چند سطروں کا مقصد یہی ثابت کرنا ہے کہ نون کے تمام روپوں کو

---

1 ن = لثوی نون [n]   ں = غشائی نون [ŋ]

2 نون بہ طور مصمتہ یعنی حرف صحیح۔ اس مختصر مضمون میں نون غنہ کی بحث شامل نہیں جو مصوتہ آواز ہے

ایک ہی صوتیے یعنی ''بنیادی آواز'' (Phoneme) کے ذیل میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ان الفاظ کو دیکھیے۔ ہر شق کے الفاظ کا تلفظ دوسری شق کے الفاظ میں آنے والے نون سے قدرے مختلف ہے:

(1) سنت- پنت- اندازہ- تند- سگندھ- گندا- کندھا- بند- بندھ- بنتا- کندن

(2) انڈا- غنڈا- گنڈا- کنٹھ- انٹی- گھنٹا- کنڈی- کنڈل

(3) رنج- گنج- پنج- کنج- پنچھی- منجھنا- کنجوس- کنچن

(4) رنگ- سنگ- تنگ- جنگ- گنگا- دنگا- ڈنکا- پنکھا- کنگھی

(5 الف) بن- بنا- نور- گانا- سننا- جلنا- اون- دن- نائی

اس مختصر مضمون میں نون کی مندرجۂ بالا شکلوں کے لیے جو اصطلاحیں اور علامتیں استعمال کی جائیں گی، وہ بالترتیب یوں ہیں:

ہم مخرج دنتی نون	(Homorganic Dental n)
ہم مخرج معکوسی نون	(Homorganic Retroflex n)
ہم مخرج تالوئی نون	(Homorganic Palatal n)
ہم مخرج غشائی نون	(Homorganic Velar n)
لثوی نون	(Alveolar n)

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں، ان کی روشنی میں نون کے پانچ تلفظ آسانی سے ایک دوسرے سے الگ پہچانے جا سکتے ہیں یعنی (1) دنتی نون ت اور د سے پہلے، (2) معکوسی نون ٹ اور ڈ سے پہلے (3) تالوئی نون چ اور ج سے پہلے اور (4) غشائی نون ک اور گ[3] سے پہلے ہم مخرج ہو کر آتا ہے۔ باقی سب جگہ لثوی نون ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح گویا نون کی پانچ مختلف آوازیں ہیں لیکن ان پانچوں میں باہمی سمجھوتا ہے کہ ایک کی جگہ پر دوسری نہیں آئے گی۔ یعنی نون کے پانچ روپوں میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص صوتی ماحول ہے اور ایک کے ماحول میں

3 یہاں اور اس مضمون کے بعد کے حصوں میں ت د ٹ وغیرہ بندشی آوازوں سے ان کے ہکار اور غیر ہکار دونوں روپ مراد ہیں، یعنی ت تھ، د دھ، ٹ ٹھ وغیرہ۔

دوسری آواز دخل اندازی نہیں کرتی۔ لسانیات کا اصول ہے کہ اگر اصوات (Phones) کے کسی مجموعے میں ایسا باہمی سمجھوتا ہو تو وہ تمام آوازیں آپس میں تکملی بٹوارے (Complementary Distribution) میں ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ ان تمام اصوات کو ایک بنیادی آواز کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس بنیادی آواز کو فونیم (Phoneme) کہیں گے اور اس کی مختلف شکلوں کو الوفون (Allophone) یعنی ذیلی صوتیے کہیں گے۔ گویا اردو میں اگر نون کو ایک فونیم مانا جائے تو اس کے مندرجۂ بالا پانچوں تلفظ اس کے پانچ الوفون قرار پائیں گے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ یہ درجہ بندی اتنی آسان نہیں جتنی اب تک کے بیان سے نظر آتی ہے۔ مزید بحث سے پہلے یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(5 ب) دیسی الفاظ: منکا- تنکا- بھنگا- دنگا- ننکا- سنکی- کنکی- تنکی- پنکی

مستعار الفاظ: انکار- منکَر- منکِر- انکسار- انکشاف- منکشف- منکوحہ

اوپر ہم نے کہا تھا کہ ک گ سے پہلے غشائی نون آتا ہے اور باقی جگہ لثوی۔ لیکن (5 ب) کی مثالوں سے اس بیان کی تکذیب ہوتی ہے۔ ان تمام دیسی اور مستعار الفاظ میں لثوی نون بھی ک گ سے پہلے استعمال ہوتا ہے۔ گویا ان مثالوں میں لثوی نون کا وقوع باہمی سمجھوتے کے اصولوں کو توڑ رہا ہے اور غشائی نون کی جگہ پر بھی ڈٹا ہوا نظر آتا ہے۔ گویا لثوی نون ایک ہی صوتی ماحول میں غشائی نون سے ٹکرا رہا ہے۔ اوپر ہم نے فونیم اور الوفون کی جو تعریف کی تھی، اس کی رو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ جب دو اصوات ایک ہی صوتی ماحول میں ٹکرا رہی ہوں تو وہ ایک فونیم کی الوفون نہیں ہوسکتیں۔ اردو میں نون کو ایک فونیم قرار دینے میں سب سے بڑی دقت یہی ہے۔

اسی بنا پر ماہرین نے اردو میں نون کی ایک نہیں دو بنیادی آوازوں کا وجود تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ''ہندوستانی صوتیات'' میں غشائی نون کو نون سے الگ دکھایا ہے (ص 89)۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی اپنے انگریزی رسالے میں لثوی نون اور باقی طرح کے نون میں امتیاز کیا ہے (ص 19)۔ عبدالقادر سروری نے بھی اپنی

کتاب ''زبان اور علم زبان'' کے ایک نقشے میں دونوں کی الگ الگ نشان دہی کی ہے۔ فونیم کے نظریے کی رو سے نون کی درجہ بندی کی کوشش ڈاکٹر گیان چند اور راقم الحروف نے کی ہے۔ ہم سے پہلے ہندی میں یہ کوششیں ایک مدت سے جاری ہیں۔ وہاں بھی غشائی نون کا وجود نون سے الگ مانا گیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے بھی غشائی نون کو ایک فونیم اور باقی شکلوں پر محیط نون کو دوسری فونیم مانا ہے۔ میں نے اپنے رسالے ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' کے دوسرے ایڈیشن اور اس سے ماخوذ اپنے اس مضمون میں جو ستمبر 1963ء کے ''اردو نامہ'' میں شائع ہوا ہے، اس تجزیے کے برعکس لثوی نون کو ایک فونیم اور باقی شکلوں پر محیط نون کو دوسری فونیم مانا تھا۔ ڈاکٹر گیان چند نے ''اردو نامہ'' اپریل 1964ء میں لکھا کہ صرف انھیں کا طریقہ صحیح ہے۔ میری رائے ہے کہ ایسا سوچنا مناسب نہیں۔ یہاں صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ فونیم کی درجہ بندی کے ایک سے زیادہ راستے ہوسکتے ہیں اور اگر صوتیاتی تجزیے کا مقصد زبان کی منتشر آوازوں کو کم سے کم فونیم میں اسیر کرنا ہے تو نون سے متعلق جو نیا نظریہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے، اسے ڈاکٹر گیان چند کی رائے پر اور سابقہ تمام نظریوں پر فوقیت حاصل ہے۔

نون کے جو پانچ روپ اوپر پیش کیے گئے، ان میں سے غشائی نون کو بنیادی آواز ماننے میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم ایک ایسی آواز کو بنیادی آواز کا درجہ دینا چاہتے ہیں جس کا اپنا کوئی آزادانہ وجود ہے ہی نہیں۔ آزادانہ وجود سے یہاں یہ مراد ہے کہ اردو میں یہ آواز مابعد ک اور گ کے بغیر بولی ہی نہیں جاتی یعنی صوتیاتی اعتبار سے یہ ''اپاہج'' آواز ہے اور دوسری آوازوں کے سہارے کے بغیر اپنے طور پر استعمال نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں انگریزی کی کورانہ تقلید کی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی میں غشائی نون (ŋ) کو (n) سے الگ فونیم مانا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی میں غشائی نون لفظ کے وسط یا آخر میں ک اور گ کے سہارے کے بغیر آزادانہ طور پر آسکتا ہے، مثلاً Sin اور Sing کے اقلی جوڑے میں موخرالذکر لفظ میں (ŋ) آزادانہ طور پر آیا ہے۔ اس کے برعکس اردو میں یہ آواز ک یا

گ کے سہارے کے بغیر نہیں آسکتی۔ انگریزی (ŋ) کی طرح اردو (ڑ) بھی صرف وسطی اور آخری حالت میں آسکتا ہے چنانچہ اسے فونیم کا درجہ دیا جاتا ہے، جبکہ غشائی نون اپنے طور پر آزادانہ کہیں بھی نہیں آتا۔ جہاں بھی آتا ہے، ک یا گ سے ہم مخرج ہوکر آتا ہے۔ اگر کسی لسانیاتی تجزیے میں ایسی بے دست و پا آواز کو بنیادی آواز یعنی فونیم کا درجہ دیا گیا ہے تو ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ درجہ بندی کو مکمل کرنے کے لیے کھینچ تان سے کام لیا گیا ہے اور ایک ایسی آواز کو بنیادی آواز کے رتبے پر فائز کر دیا گیا ہے جو دراصل اس کی مستحق نہیں۔

اس مسئلے کے بہتر حل کی تلاش جاری رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنے وقوع کی حدبندی کے اعتبار سے غشائی نون کی نوعیت وہی ہے جو دنتی، تالوئی یا معکوسی نون کی۔ یعنی جس طرح دنتی نون اور تالوئی نون وغیرہ صرف خاص خاص آوازوں سے ہم مخرج ہوکر بولے جاسکتے ہیں، اسی طرح غشائی نون بھی بعض مخصوص آوازوں سے ہم مخرج ہوکر آتا ہے۔ اردو میں غشائی نون کے ک یا گ کے بغیر واقع ہونے کی کوئی مثال میری نظر سے نہیں گزری۔ چنانچہ ہم اگر دنتی نون وغیرہ کو الوفون یعنی ذیلی آوازیں مان رہے ہیں تو غشائی نون کو بھی ذیلی آواز ماننا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرسکتے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ یا تو ہم صوتیاتی تجزیے کی ترازو کو ٹھیک سے نہیں پکڑے ہوئے یا پھر ہم نے زبان کے ڈھانچے میں کسی اہم نکتے کو نظرانداز کر دیا ہے۔

ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ غشائی نون کو نون کے باقی روپوں کے ساتھ ایک فونیم ماننے میں سب سے بڑی دقت شق (5ب) کے الفاظ کی وجہ سے پیش آتی ہے یعنی ک گ سے پہلے غشائی نون بھی آسکتا ہے (شق 4) اور لثوی نون بھی (شق 5ب)۔ گویا تمام جھگڑے کی جڑ شق (5ب) کے الفاظ ہی ہیں۔ چنانچہ آئندہ تجزیے میں ہمیں زیادہ توجہ انھیں الفاظ پر مرکوز کرنی پڑے گی۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہے کہ ہمیں نون کے ان دو روپوں کا جائزہ اردو زبان کے پورے صوتیاتی نظام کی روشنی میں لینا چاہیے اور معلوم کرنا چاہیے کہ خود اردو زبان کا فطری رجحان کیا ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ غشائی نون صرف ک گ سے پہلے آتا ہے (گنگا، رنگ، ڈنگا۔شق 4) اورلثوی نون نہ صرف بقیہ سب موقعوں پر آتا ہے (بن، بنا، نور۔شق 5 الف) بلکہ ک گ سے پہلے بھی آتا ہے (منکا، تنکا، شق 5ب)۔ اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غشائی نون تو اپنی جگہ پر قانع ہے مگرلثوی نون غشائی نون کی جگہ پر بھی واقع ہوسکتا ہے۔کیا واقعی لثوی نون ''حریص آواز'' ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل جملے ملاحظہ ہوں:

(6) اس دن کی بات ہے
میں جان گیا
وہ سن کے چپ رہا
موہن گا رہا تھا
روپے گن کے دیئے
ے یہ بھی تقدیر کا لکھا کہ لکھے
خط وہ کن کن کنایتوں سے مجھے (ذوق)

ان جملوں میں نون کے بعد دوسرے لفظ میں ک یا گ کی آواز ہے۔ اگر ان جملوں کو عام رفتار سے پڑھا جائے تو نون کا تلفظ لثوی نون کے طور ہی پر ہوگا۔ کیا ان مثالوں کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ لثوی نون نے غشائی نون کی جگہ کو ہتھیا لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں، کیونکہ گو نون ک یا گ سے پہلے آیا ہے لیکن دونوں کے درمیان لفظ کی حد (Word Boundry) ہے، اور اتنی بات واضح ہے کہ لفظ کی حد سے پہلے غشائی نون نہیں آتا، لثوی نون ہی آسکتا ہے۔ (دن، جان، سن، موہن، گن وغیرہ شق ٦ میں)

اب اگر شق (6) کی مثالوں کو شق (4) (5الف) اور (5ب) کے پہلو بہ پہلو رکھ کر غشائی نون اورلثوی نون کے متعلق اردو زبان کے عام رجحان کا پتہ چلانے کی کوشش کی جائے تو واضح طور پر محسوس ہوگا کہ اردو کا عام رجحان یہی ہے کہ ک گ سے پہلے غشائی نون ہی آتا ہے اورلثوی نون صرف اسی حالت میں آتا ہے جب

ک گ سے پہلے صوتی حد ہو۔ اگر اس بیان کو ہم ایک مفروضے (Hypothesis) کی حیثیت دے دیں تو آگے چل کر شق (5ب) کے الفاظ کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہوگی، کیونکہ بظاہر صرف یہی الفاظ اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں۔

ہم شق (6) میں دیکھ چکے ہیں کہ لثوی نون ک گ سے پہلے وہاں آسکتا ہے جب اس کے اور ک گ کے درمیان صوتی حد ہو۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ کیا شق (5ب۔منکا تنکا وغیرہ) میں بھی نون اور ک گ کے درمیان ایسی کوئی حد ہے؟

جدید لسانیات میں زبان کے نظام کو ایک ایسا ''تہہ دار ڈھانچہ'' (Hierarchy Stratum) قرار دیا گیا ہے جس میں اوپر نیچے کی ''سطحیں'' ہیں۔ اگر صوتیات (Phonology) کو پہلی ''سطح'' تسلیم کیا جائے تو دوسری ''سطح'' لفظیات (Morphology) اور تیسری ''سطح'' نحو (Syntax) سے عبارت ہوگی۔ ان تینوں سطحوں میں گہرا رشتہ ہے۔ جس طرح صوتیات میں صوت (Phone) نہایت مبہم چیز ہے اور اس کی درجہ بندی فونیم کے ذریعے کی جاتی ہے، اسی طرح لفظیات میں لفظ (Word) بھی نہایت مبہم چیز ہے اور اس کی درجہ بندی مارفیم (Morpheme) کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مارفیم کی تعریف چند لفظوں میں ناممکن ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر مارفیم (لفظیہ) زبان کی ان لفظی اکائیوں کو کہتے جن کی معنوی اعتبار سے مزید تقسیم نہ کی جاسکے۔[4] مثال کے طور پر لفظ /کر/ کی مارفیم (کر) ہے۔ لفظ/ جانا/ کی (جا) اور (نا) اور لفظ /خوش نمائی/ کی (خوش) (نما) اور (ای)۔ جو لفظیہ آزادانہ اپنے طور پر استعمال ہوسکے جیسے مندرجۂ بالا مثالوں میں (کر) (جا) اور (خوش) اسے آزاد لفظیہ (Free Morpheme) کہتے ہیں اور جو آزادانہ استعمال نہ ہوسکے جیسے/ جانا/ کا (نا) یا خوش نمائی/ کا (نما) اور (ای)، اسے مقید لفظیہ (Bound Morpheme) کہتے ہیں۔ گویا لفظ ایک مارفیم کا ہوسکتا ہے اور اس سے زیادہ کا بھی۔ ایک لفظ کے اندر ایک مارفیم اور اس کے بعد کی مارفیم کے درمیان جو حد ہوتی ہے، اسے ''مارفیم کی حد''

---

4 .....the smallest meaningful units in the structure of the language. ایچ-اے-گلیسن

(An Introduction to American Linguistics) ۱۹۶۱ء، ص ۵۳

(Morpheme Boundry) کہتے ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں مندرجۂ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:

(7 الف) کن کٹا، کن کھجورا، کان کن، فن کار، ان گنا، ان گڑھ، ان گنت، ان کہی، پن گھٹ، پن کٹی، پن کال، من کامنا، گن کاری، گن گان، گن گاتھا، کنکوا

(ب) ڈِنکر، بنکر، کنکنا، کھنکھنانا، کھنکھناہٹ، گن گن، گنگنانا، گنگناہٹ، گنگنا، گنگناپن، گِھنگھِنانا، گھَنگھَنانا۔

ممکن ہے بعض حضرات کے نزدیک (7 الف) کے الفاظ مرکب ہوں اور (7 ب) کے مفرد۔ لیکن لسانیات کی نظر میں یہ سب الفاظ ایک سے زیادہ مارفیم سے مل کر بنے ہیں۔ ان تمام مثالوں میں ن کے بعد ک یا گ آرہا ہے۔ (رواجاً یہاں نون کا تلفظ غشائی ہونا چاہیے، لیکن واقعتاً نون کا تلفظ غشائی نہیں، بلکہ لثوی ہی ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس کے جواب میں اس مسئلے کی کلید ہے۔ یعنی یہ کہ یہاں ن اور ک گ کے درمیان مارفیم کی حد (Morpheme Boundry) ہے۔ (7 الف) کی مثالوں میں چونکہ زیادہ تر لفظیے الگ الگ رکھے جاتے ہیں، وہاں یہ صوتی حد واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے، (7 ب) میں چونکہ یہ حد اتنی واضح نہیں، اس لیے ذیل میں ان الفاظ کی وضاحت کی جاتی ہے:

ڈِنکر [ڈِن] [کر]

بُنکر [بُن] [کر]

کُنکنا [کُن] [کن] [ا] بمعنی ''نیم گرم''

کھنکھنانا [کھن] [کھن] [ا] [نا] بہ طریق گڑگڑانا اور گڑگڑاہٹ، سنسکرت ...... سے بمعنی Tinkle, Jingle

کھنکھناہٹ [کھن] [کھن] [ا] [ہٹ]

گُن گُن [گُن] [گُن] مادہ گُن سے بمعنی ''ہلکی انفی آواز'' (ع: اوگن گن کرتا بھنورا!)

گنگنانا [گن] [گن] [ا] [نا]

گنگناہٹ [گن] [گن] [ا] [ہٹ]
گُنگنا [گن] [گن] [ا] گنگناپانی: ''نیم گرم پانی''
گنگناپن [گن] [گن] [گن] [ا] [پن] گنگناپن اسم
گھِنگھِنانا [گھِن] [گھن] [ا] [نا] گھِن بمعنی نفرت (گھِن کھانا)
گھَنگھَنانا [گھَن] [گھن] [ا] [نا] گھَن ''ایک طرح کی آواز'' (چکی کی گھَن گھَن)[5]

اوپر جو مفروضہ قائم کیا گیا تھا، شق (7 الف اور ب) کی مثالوں کے تجزیے سے اس کی اس حد تک تصدیق ہوجاتی ہے کہ ایک سے زیادہ مارفیم کے لفظوں میں جہاں ک گ سے پہلے لثوی نون آئے، وہاں ک گ اور نون کے درمیان مارفیم کی حد ضرور ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ کیا شق (5 ب) کے الفاظ منکا، تنکا وغیرہ میں بھی ایک سے زیادہ مارفیم ہیں اور کیا ان میں بھی ک گ اور نون کے درمیان مارفیم کی حد ہے جس کی وجہ سے نون کا تلفظ لثوی نون کی حیثیت سے ہوتا ہے؟

شق (5 ب) کے الفاظ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک سے زیادہ رکن کے ہیں۔ پہلا رکن نون پر ختم ہوتا ہے اور دوسرا رکن ان سب الفاظ میں [کا] ہے یا [کی]۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے میں نے پلیٹس سے رجوع کیا، کیونکہ اردو کے تمام اچھے لغات میں سے صرف وہی باقاعدگی سے الفاظ کے ماڈوں اور ان کے قدیم مآخذ پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب دیسی الفاظ سنسکرت لاحقہ :क یا क لگانے سے بنے ہیں۔ پلیٹس کے اس تجزیے کی تصدیق کے لیے میں نے اپنے دوست کوروکھشیتر کے ڈاکٹر دھریندر شرما سے جو وسکانسن یونیورسٹی میں سنسکرت پڑھاتے ہیں، مشورہ کیا۔ انھوں نے میری توجہ وٹنی کی مستند سنسکرت گرامر کے اس بیان کی طرف دلائی جس میں بتایا گیا ہے کہ क، का،

5 الفاظ کی تصدیق کے لیے دیکھیے John. T.Platts کا لغت جس کا نیا ایڈیشن آکسفورڈ سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔

उका اور इका اسمائے صفت یا اسمائے تنکیر بنانے کے علاوہ بغیر کسی مخصوص صرفی مقصد کے بھی اسما اور اسمائے صفت کے ساتھ جوڑے جاتے ہیں۔ ان لاحقوں کا یہ استعمال ویدوں کی زبان میں بھی ملتا ہے اور مابعد کی سنسکرت میں تو یہ خاص اسی نوعیت سے آئے ہیں۔ (اصل بیان کے ضروری حصے حاشیے میں ملاحظہ ہوں)[6]

پلیٹس کے اس تجزیے کے بارے میں میں نے پروفیسر رپلے مور سے بھی تبادلۂ خیالات کیا جو شعبۂ علوم ہند میں معلم ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ سنسکرت لاحقہ क کی طرح پراکرت میں بھی ایک لاحقہ क تھا جو بغیر کسی خاص مقصد کے مادے اور سنسکرت لاحقے کے بعد اضافہ کیا جاتا تھا یا صرف مادے کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔ اس کا ذکر کیلاگ نے اپنی جامع ہندی گرامر میں بھی کیا ہے[7] ان تمام بیانات کی روشنی میں زیرِ بحث الفاظ کی اصل یوں ظاہر کی جائے گی:

---

6 "क *ka*. This is doubtless originally one of the class of suffixes forming adjectives of appurtenance.And that value it still has in actual use; yet only in a small minority of occurences. It has been, on the one hand, specialized into an element forming diminutives; and, on the other hand, and much more widely, attenuated into an element without definable value, added to a great many nouns and adjectives to make others of the same meaning- this last is, even in the Veda, and still more in the later language, its chief office." (P. 466)

"Of this origin are doubtless...the so called primary suffixes *uka* and *aka*, and likewise the secondary suffix *ika*."(P.467)

"Such derivatives in the later language are innumerable; from almost any given noun or adjective may be made an equivalent, ending in *ka* or ka." (P.468)

Whitney, William Dwight. *Sanskrit Grammar*, Harvard University Press, Cambridge, Massachusetts, 1950, pp.466-468.

7 ... "we should note an old Prakrit habit of adding to various words the affix क. This Prakritic क is not to be confounded with the Sanskrit affix क... This Prakrit क is wholly unmeaning. Although, in modern... Hindi

منکا= मणि + क + का

تنکا= तृण + क + का

دُنکا= धान + क + का

ننکا= नन्द + क + का بمعنی بچہ

بھنگا= भृङ्ग + क + इका

کنکی= कण + क + इका بمعنی چاول کا ٹکڑا

پنکی= पन + क + इका

تنکی= तुन + क + इका بمعنی باریک اور خستہ روٹی

سنکی= सन + क + इका

اس تجزیے میں لاحقوں پر لاحقے کا اضافہ زبان کے کئی ارتقائی مدارج سے تعلق رکھتا ہے۔ پراکرت اصولوں کے مطابق دوسرے لاحقے کا क زائل ہو جاتا ہے۔[8] بھنگا کا تلفظ پلیٹس نے غشائی نون اور لثوی نون دونوں طرح دیا ہے، لیکن اردو میں لثوی نون ہی سے مروج ہے (ملاحظہ ہو ''نور'' اور ''آصفیہ'') یہاں ग لاحقے میں क کی جگہ لے لیتا ہے۔ پہلے پانچوں لفظ مذکر ہیں جبکہ کنکی، پنکی اور تنکی مونث ہیں۔ چنانچہ क کے مقابلے میں ان میں لاحقہ इका استعمال ہوا ہے جو بعد میں इ رہ گیا اور क کے ساتھ مل کر की میں تبدیل ہوا جو تانیث پر دال ہے۔ آخری لفظ سنکی میں इका اسمیہ نہیں، توصیفی ہے۔

---

this affix has for the most part disappeared, yet its former existance is to be noted, as having influenced the form of a great number of modern words."

Kellogg, S.H. *A Grammar of the Hindi Language*, London, 1893, rep. 1955, pp. 59-60.

اس مسئلے پر مزید مطالعے کے لیے کیلاگ نے مندرجۂ ذیل مآخذ کا حوالہ پیش کیا ہے:

Vararuchi (ed. by Cowell), *Prakrita Prakasha*, iv. (25) Lassen. pp. 288, 434, 461, 475

8 کیلاگ، حوالۂ ماسبق، صفحہ 125، مع حواشی ص 189۔

اس تجزیے میں مزید اضافہ ناممکن ہے، اور ان الفاظ میں بھی ان کی ہر ہر آواز کی ارتقائی شکلوں کی بحث زیرِنظر مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ ان الفاظ میں مارفیم کی حدوں کا پتہ چلایا جائے اور مندرجۂ بالا تجزیے سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ ان الفاظ میں نون اور ک گ کے درمیان واضح طور پر تاریخی مارفیم کی حد موجود ہے۔

یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ङ، ङा وغیرہ سنسکرت کی فونیم ہیں، ہوا کریں، جدید ارود کی بحث میں ہم انھیں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ یعنی ہم توضیحی لسانیات اور تاریخی لسانیات کو گڈمڈ کر رہے ہیں! یہ صحیح ہے کہ توضیحی لسانیات وقت کی عصری سطح پر تجزیہ کرتی ہے اور اس کا بظاہر کوئی سروکار زمانۂ قدیم کی تبدیلیوں سے نہیں۔ لیکن اگر زبان نے اپنے ارتقا کے سفر میں کبھی کوئی ایسی خصوصیت اپنا لی تھی جو اب تک چلی آتی ہے اور اس کا کوئی جواز عصری سطح پر نہیں ملتا تو اس کی کھوج کے لیے تاریخی لسانیات سے مدد لینا ناگزیر ہے، گویا عصری مطالعے (Synchronic Study) کے علاوہ تاریخی مطالعے (Diachronic Study) کی مدد لینا نہ صرف مناسب بلکہ انسب ہے۔

شق (5 ب) کے دیسی الفاظ سے نمٹ لینے کے بعد اب مستعار الفاظ کو لیجیے۔ اردو میں یہ سب کلاسیکی عربی سے آئے ہیں۔ فرانسیسی محقق کان تی نو (Cantineau) کا بیان ہے کہ کلاسیکی عربی میں نون اور نون غنہ کا وجود تھا۔ عربی کی جدید بولیوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ''n (لثوی نون)[9] تالوئی اور غشائی آوازوں سے پہلے اکثر ŋ (غشائی نون) میں بدل جاتا ہے''۔ ہمیں عربی کی جدید بولیوں سے سروکار نہیں۔ اردو میں ان تمام مستعار الفاظ کا تلفظ دیسی الفاظ منکا، تنکا کی طرح لثوی نون ہی سے ہوتا ہے۔ قطع نظر دوسری باتوں کے، ان مستعار الفاظ میں بھی لثوی نون اور ک کے درمیان مارفیم کی یا مادے کی حد موجود ہے جس سے ہمارے مندرجۂ بالا اصول کی پوری طرح توثیق ہوتی ہے۔ یعنی انکار، 'منکر' وغیرہ مادہ نکر

9 Jean Cantineau, *Cours de Phonetique Arabe*, pp. 38, 39.

سے؛ انکسار، منکسر کسر سے؛ انکشاف منکشف کشف سے بنے ہیں۔ یہی حال اس قبیل کے دوسرے الفاظ کا ہے۔[10]

اب چونکہ ہم اپنے مفروضے کی تصدیق کر کے اسی کو اصول کا درجہ دے چکے ہیں، لثوی نون کے وقوع کو ایک آسان سے قانون کے ذریعے یوں پیش کر سکتے ہیں

$$-n-\begin{Bmatrix}k\\g\end{Bmatrix}-\longrightarrow\ -n\,||\begin{Bmatrix}k\\g\end{Bmatrix}-\qquad(8)$$

جدید لسانیات میں ریاضی اور منطق کی اصطلاحوں کا چلن عام ہے۔ یہاں ان متعلقہ علامتوں کی مختصر وضاحت کردی جاتی ہے۔ چھوٹی لکیر (Dash) سے مراد ہے کہ اس مقام پر کوئی نہ کوئی آواز یا آوازیں ہوں گی، ان کی نوعیت سے ہمیں سروکار نہیں۔ خطوط وحدانی میں جو آوازیں یعنی (ک) k اور g (گ) اوپر نیچے درج کی گئی ہیں، ان کا مطلب ہے کہ بیک وقت ان دونوں میں سے کوئی سی ایک واقع ہوسکتی ہے، یعنی ک یا گ، دونوں ایک ساتھ نہیں آسکتیں۔ نیز دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ دونوں میں سے ایک کو ضرور لینا ہوگا۔ تیر کے نشان کا مطلب ہے "Rewrite" یعنی ''دوبارہ لکھا جائے''۔ قانون کے دوسرے حصے میں || سے مراد ہے مارفیم کی حد۔ اب پورے قانون کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی لفظ میں ک یا گ سے پہلے لثوی نون (n) بولا جاتا ہو تو اُسے صوتیاتی تجزیے میں لثوی نون کے بعد مارفیم کی حد کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا جائے۔ یعنی زبان کے صوتیاتی نظام میں یہ بات بہ منزلہ ایک حکم کے ہے کہ لفظ کے اندر لثوی نون ک گ سے پہلے نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو اس کے اور ک گ کے درمیان مارفیم کی حد ہوتی ہے۔ قانون کے پہلے حصے میں k اور g کے بعد جو چھوٹی لکیر ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے

---

10 مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Edward William Lane,
Arabic - English Lexicon,
London, 1863-93

بعد لفظ کا کچھ اور حصہ ہے یعنی لفظ ایک سے زیادہ صوتی رکن کا ہے۔ کیونکہ لثوی نون ک گ سے پہلے ایک صوتی رکن کے لفظ میں قطعاً نہیں آتا، وہاں غشائی نون ہی آتا ہے۔ لیکن اس قانون کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں بھی مارفیم کی حد ہوگی، وہاں نون کا تلفظ لازماً لثوی ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم اپنے قانون کے پہلے حصے کو دوسرے اور دوسرے کو پہلے کی جگہ پر لکھتے۔

آپ نے دیکھا کہ عام زبان میں جس بات کو بیان کرنے میں بیسیوں جملوں کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر بھی مبحث پوری قطعیت سے بیان نہیں کیا جاسکتا، علامتی منطق کی مدد سے اُسے محض چند علامتوں کے ذریعے نہایت اختصار، سادگی اور قطعیت کے ساتھ صرف ایک سطر میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

لفظ کے اندر لثوی نون کے ک گ سے پہلے واقع ہونے پر مندرجۂ بالا ''حکم'' لگا چکنے کے بعد شق (5 ب) کے الفاظ کا الگ وجود خود بخود ختم ہوگیا۔ اب یہ تمام الفاظ شق (5 الف) کے الفاظ کے ساتھ ملائے جاسکتے ہیں۔ شروع میں لثوی نون کا وقوع بتاتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ ''یہ بقیہ سب موقعوں'' پر آتا ہے۔ اب ان بقیہ موقعوں میں ایک موقع یہ بھی ہے کہ ک گ سے پہلے مارفیم کی حد کے ساتھ بھی آسکتا ہے۔ اس طرح لثوی نون اور غشائی نون میں ایک ہی صوتی ماحول میں واقع ہونے سے جو ٹکراؤ پیدا ہوا تھا، وہ ختم ہوگیا۔ اب نون کی پانچوں شکلوں کی درجہ بندی نہایت آسانی اور سادگی کے ساتھ ایک ہی فونیم کے طور پر کی جاسکتی ہے۔ یعنی (1) دنتی نون، (2) معکوسی نون، (3) تالوئی نون، (4) غشائی نون اور (5) لثوی نون ایک فونیم ''نون'' کے پانچ الوفون قرار پائے۔ انھیں نقشے کے ذریعے یوں ظاہر کیا جاسکتا ہے:

	ت د سے پہلے	ٹ ڈ سے پہلے	چ ج سے پہلے	ک گ سے پہلے	بقیہ موقعوں پر
دنتی نون	✓				
معکوسی نون		✓			
تالوئی نون			✓		
غشائی نون				✓	
لثوی نون					✓

اب دیکھا جاسکتا ہے کہ ان تمام اصوات میں باہمی سمجھوتا ہے اور ایک کی جگہ پر دوسری صوت نہیں آسکتی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ لثوی نون، غشائی نون کی جگہ دخل اندازی کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ جہاں وہ ک گ سے پہلے آتا ہے وہاں اس کے اور ک گ کے بیچ میں مارفیم کی حد ہوتی ہے جو غشائی نون کا مخصوص ماحول نہیں۔ غشائی نون ایک صوتی رکن کے لفظ میں بھی ک گ سے پہلے آسکتا ہے (جنگ، رنگ، تنگ وغیرہ) جبکہ لثوی نون یک رکنی لفظ میں ک گ سے پہلے نہیں آسکتا۔

ک گ سے پہلے لثوی نون کے اس مسئلے کا ایک اور حل بھی ممکن ہے۔ اتنی بات معلوم ہے کہ لثوی نون ایک صوتی رکن کے لفظ میں ک گ سے پہلے نہیں آسکتا۔ جب بھی آتا ہے، دو یا اس سے زیادہ صوتی رکن کے لفظ میں آتا ہے (تنکا، منکا، انکار، انکشاف، انکساری) چنانچہ عین ممکن ہے کہ ایسا صرف ''صوتی رکن کی حد'' (Syllable Boundry) کی وجہ سے ہوتا ہو۔ (5 ب) اور (7 ب) میں جتنے الفاظ پیش کیے جاچکے ہیں، ان سب میں ک یا گ اور ان سے پہلے صوتی رکن کی حد موجود ہے۔ ان مثالوں کے پیش نظر یہ اصول آسانی سے وضع کیا جاسکتا ہے کہ جہاں بھی ک گ سے فوراً پہلے رکن کی حد ہو، وہاں لثوی نون ہی آئے گا۔ (تنکا، انکسار وغیرہ) اور جہاں یہ حد نہیں ہے وہاں غشائی نون آئے گا (جنگ، تنگ، رنگ وغیرہ)۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ ایک سے زیادہ رکن کے غشائی نون والے

الفاظ مثلاً جنگی، تنگی، رنگیلا وغیرہ میں رکن کی حد واضح طور پر قائم نہیں کی جاسکتی۔ اگر اس کی نشان دہی کی کوشش کی جائے تو تین حل سامنے آتے ہیں :

ا یہ حد ن اور گ کے درمیان ہے یعنی (جن) (گی)

ب یہ حد گ اور ی کے درمیان ہے یعنی (جنگ) (ی)

ج یہ حد گ کے اوپر پڑتی ہے یعنی جنگی کہتے ہوئے گ کی آواز کا کچھ حصہ پہلے رکن کے ساتھ ادا ہوتا ہے اور کچھ دوسرے کے ساتھ۔ اگر الف کو صحیح مانا جائے (اور اس کو غلط ثابت کرنا آسان بھی نہیں) تو اوپر جو اصول ہم نے وضع کیا ہے، وہ بے کار ہوجاتا ہے کیونکہ یہاں نون اور گ کے درمیان صوتی حد ہے اور اس کے باوجود لثوی نہیں، غشائی نون ہی بولا جاتا ہے۔ دوسرا حل یعنی (ب) واضح طور پر صحیح نہیں کیونکہ جنگی رنگی وغیرہ بولتے ہوئے کوئی بھی ی کو الگ سے نہیں بولتا۔ بلکہ ی کی آواز اپنے سے پہلے کے مصمتے یعنی گ سے مل کر ہی ادا ہوتی ہے۔ رہا (ج) تو اس کے صحیح ہونے کا قوی امکان ہے۔

انڈیانا یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی کام کے دوران میں میں نے اس سلسلے میں کئی ماہرین سے استفسار کیا۔ سب متفق تھے کہ صوتی رکن کا مسئلہ ہر زبان میں مختلف ہے اور اسے زبان کے پورے صوتیاتی نظام کی روشنی میں طے کیا جاسکتا ہے۔ اس بات سے بھی بیشتر نے اتفاق کیا کہ جنگی، تنگی جیسے لفظوں میں صوتی رکن کی حد واضح طور پر گ سے پہلے یا بعد میں نہیں، لیکن یہ بات کہ صوتی رکن کی حد گ پر پڑتی ہے، صرف تاثراتی طور ہی پر کہی جاسکتی ہے۔ انڈیانا میں مجھے سوناگراف (Sonagraph) اُسیلوگراف (Oscillograph) اور وزیوکوڈر (Visiocodor) کے استعمال کی سہولت میسر تھی اور اپنے دوسرے کاموں کے لیے میں ان مشینوں کو استعمال کرتا رہا ہوں، لیکن صوتی حد کا مسئلہ ان مشینوں کی مدد سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ انگریزی میں بھی ن کی آواز ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا وہاں چونکہ یہ آزادانہ آسکتی ہے، صوتی حد کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اردو میں غشائی ن بغیر ک گ کے آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس

بات کا قوی امکان ہے کہ جنگی تنگی وغیرہ الفاظ میں گ کی آواز کا شروع کا کچھ حصہ نون کے ساتھ مل کر ادا ہوتا ہو اور اس کے بعد دوسرا صوتی رکن ساتھ ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ آئندہ تحقیق سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوجائے۔ اگر ایسا ہو سکا تو پھر اردو میں نون کا مسئلہ صوتی رکن کی حد ہی کی مدد سے طے ہوجائے گا، اور مارفیم کی حد تک جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہو، نون کی آوازوں کی سائنسی درجہ بندی کے لیے مارفیم کی حد تک مدد لینا ضروری ہے۔ ایک نون کو دو نون تسلیم کرنے کے جنجال سے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے۔

نون سے متعلق اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے چند فروعی باتوں کا مختصر ذکر کردینا بھی ضروری ہے۔ ایک یہ کہ لثوی نون کے علاوہ باقی چاروں نون ہم مخرج ہوکر آتے ہیں۔ ایسا صرف بندشی آوازوں کے ساتھ ہوسکتا ہے، س وغیرہ صفیری آوازوں کے ساتھ نہیں۔ سابقہ تحریروں میں یہ بات نظرانداز ہوگئی تھی جس کی وضاحت ڈاکٹر گیان چند نے ''اردو نامہ'' والے مضمون میں کردی ہے۔ لیکن وہ ش سے پہلے آنے والے ''عقب لثوی نون'' کو الگ ذیلی آواز قرار دیتے ہیں۔ اگر اس طرح کی تقسیم کو روا رکھا جائے تو پھر بقول پروفیسر مارٹن جوس کے ذیلی آوازوں کی کوئی حد ہی نہیں اور یہ تقسیم کہیں پر بھی ختم نہیں ہوسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ش سے پہلے نون ادا کرتے ہوئے نوک زبان ذرا سی اوپر کو جا کر لگتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے ''عقب لثوی'' کہہ لیں، لیکن اس کی نوعیت پھر بھی لثوی ہی ہے۔ اس لیے ہم نے اسے الگ سے اپنے خاکے میں جگہ نہیں دی۔

دوسرے یہ کہ نون بندشی آوازوں کے ساتھ ہم مخرج ہوکر آتا ہے لیکن ہم نے زیرنظر مضمون میں لبی بندشی آواز کے ساتھ ہم مخرج ہونے والے نون (گنبد، انبساط وغیرہ) کو نہیں لیا۔ ان الفاظ میں نون م کی آواز دیتا ہے اور چونکہ م اردو میں اپنا آزادانہ وجود رکھتا ہے یعنی الگ سے فونیم ہے، اس لیے اس کی درجہ بندی م ہی کے ساتھ مناسب ہے۔ ایسا نہ کیا جائے تو درجہ بندی میں ایک آواز کو خواہ مخواہ دوسری کی

حدود میں داخل کرنے (Over Lapping) کا الزام عائد ہوگا۔

تیسرے یہ کہ ق اگرچہ بندشی آواز ہے، نون اس سے ہم مخرج ہوکر نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ ق عربی سے مستعار ہے۔ عربی کے جن الفاظ میں ق نون کے فوراً بعد آتا ہے، وہ لثوی نون ہی سے بولے جاتے ہیں۔ اردو میں یہ خصوصیت برقرار رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ میں بھی انکار منکر وغیرہ کی طرح ن اور ق کے درمیان مارفیم کی حد موجود ہے یا مادے میں مصوتہ ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(9) انقباض۔ انقسام۔ انقیاس۔ منقسم۔ انقطاع۔ منقطع۔ منقوطہ۔ منقوش۔ منقبت۔ منقار۔ منقول۔ عنقا۔ انقلاب۔ منقلب۔ منتقل۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ جدید لسانیات میں آوازوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل اصولوں سے ''شمعِ راہ'' (Guiding Principles) کا کام لیا جاتا ہے:

(1) زبان کی دنیا میں کوئی ایک صوت (Phone) دوسری صوت سے سو فی صد مطابقت نہیں رکھتی۔ ماہرِ لسانیات کا کام یہ ہے کہ مختلف اصوات کے باہمی ربط کا پتہ چلائے اور ان کی درجہ بندی کرتے ہوئے انھیں بنیادی صوتیاتی اکائیوں یعنی فونیم میں اس طرح اسیر کرے کہ زبان کے صوتیاتی نظام کی پوری تصویر سامنے آجائے۔ فونیم کی تعداد جتنی کم ہوگی، مستحسن سمجھا جائے گا۔

(2) زبان میں آوازیں ایک نظام کے تحت کام کرتی ہیں۔ اگر اس نظام کے کسی اصول سے روگردانی کی کوئی مثال ملے تو اس کا تجزیہ پورے نظام کی روشنی میں کرنا چاہیے نہ اس طرح کہ اس کی خاطر نظام ہی کو مسخ کرکے پیش کیا جائے۔ نون کو دو بنیادی آوازیں قرار دینا اردو کے صوتیاتی نظام کو مسخ کرنا ہے۔

(3) صوتیات مستقل بالذات نہیں۔ زبان کے ''تہہ دار ڈھانچے'' (Hierarchy) میں اس کی حیثیت صرف ایک ''سطح'' (Stratum) کی ہے۔ اس کی پیچیدگیوں کا حل تلاش کرنے کے لیے زبان کی دوسری ''سطحوں'' یعنی لفظیات، نحو وغیرہ

سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

(4) صوتیاتی تجزیے کے نتائج جتنے زیادہ سادہ اور مختصر قوانین کی مدد سے پیش کیے جاسکیں، اتنا اچھا ہے۔

(5) زبان کا ہر بولنے والا اپنی زبان کے صوتیاتی نظام کا ''وجدانی احساس'' (Intuitive Feeling) رکھتا ہے۔ اس کی بدولت وہ اپنی زبان کے استعمال پر قادر ہوتا ہے۔ صوتیاتی تجزیہ وہی سب سے بہتر ہے جس میں زبان بولنے والوں کے ''وجدانی احساس'' سے مطابقت پائی جائے۔

ان پانچ ''رہ نما اصولوں'' کی روشنی میں دیکھا جائے تو نون کو دو فونیم کے طور پر پیش کرنے والا سابقہ نظریہ ہر لحاظ سے غیر مستحسن ہے، جبکہ زیرِ نظر مضمون میں پیش کیا گیا نظریہ نہ صرف اردو سے متعلق ہمارے ''وجدانی احساس'' کا ساتھ دیتا ہے اور زبان کے فطری رجحان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نتائج کو واضح طور پر سائنسی صحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، بلکہ لثوی نون (ن) اور غشائی نون (ں) کی مصنوعی اور من گھڑت تفریق کو بھی ختم کرتا ہے؛ اور اردو کی کل فونیم کی تعداد کو کم کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔

(وسکانسن 1964)

اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی

امتیازی خصوصیات کی روشنی میں [1]

لسانیات میں اس بات کو جاننے کی برابر کوشش کی جارہی ہے کہ زبان کی بنیادی ممیّز اکائی (Ultimate Discrete Unit) کیا ہے، اور ذہنِ انسانی اس کا ادراک کیوں کر کرتا ہے۔ زبان جملوں سے مل کر بنتی ہے، جملے لفظوں سے اور لفظ صرفیوں (Morphémes) سے تشکیل پاتے ہیں : صرفیے اپنی جگہ پر آوازوں سے مل کر بنتے ہیں اور وہ آوازیں جو معنی کی تفریق میں مدد دیتی ہیں، یعنی زبان کے اندر دوسری تمام آوازوں سے باہمدگر متضاد ہوتی ہیں، فونیم کہلاتی ہے۔ لیکن کیا فونیم کوئی بالذات چیز ہے؟ کیا ذہنِ انسانی آوازوں کا ادراک فونیم کی حیثیت سے کرتا ہے؟ رومن یاکوب سن کا امتیازی خصوصیات کا صوتیاتی نظریہ انھیں سوالوں کا جواب دینے کی کوشش ہے۔ پچھلے 25-20 برس میں عملِ تکلم سے متعلق تحقیق کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک رمزیاتی ضابطہ (Code) ہوتا ہے، جس کی بنیادی ممیّز اکائیاں اس

---

1 اس مقالے میں جو نتائج پیش کیے گئے ہیں، وہ اس تحقیقاتی کام کا حصہ ہیں جو میں نے اردو صوتیات سے متعلق 1964-1965 میں وسکانسن یونیورسٹی اور انڈیانا یونیورسٹی میں مکمل کیا تھا۔ اس میں فورڈ فاؤنڈیشن اور وسکانسن یونیورسٹی اُلمنائی ریسرچ ایسوسی ایشن کی گرانٹ سے مدد ملی، جس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ امتیازی خصوصیات (Distinctive Features) کا نظریہ سمعیاتی صوتیات (Acoustic Phonetics) کے مبادیات اور اُردو آوازوں کے سپکٹروگرام اردو میں پہلی بار شائع کیے جارہے ہیں۔ سپکٹروگرام کی تیاری کا کام انڈیانا یونیورسٹی اور وسکانسن یونیورسٹی کی سمعیاتی لباریٹری میں کیا گیا تھا جس کے لیے پروفیسر مارٹن جوس، صدر شعبۂ جرمن؛ پروفیسر مرے فاؤلر، صدر شعبۂ لسانیات (وسکانسن) اور پروفیسر برٹل مالبرک (سویڈن) کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

زبان کے استعمال کرنے والوں کے لسانی شعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جب ہم بولتے ہیں، تو آواز کی صوتی لہریں ایک غیر منقطع تسلسل سے سامع تک پہنچ کر کانوں کے ذریعے اس کی سماعت کو متاثر کرتی ہیں؛ سماعت کے تاثرات ذہن تک پہنچتے ہیں؛ ذہن ان کے رمزیاتی ضابطے کو حل کرتا ہے اور اس طرح پیغام یا گفتگو کا ادراک ہوتا ہے۔ غرض ان صوتی لہروں میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو زبان کے ادراک میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ فونیم بالذات کوئی چیز نہیں، بلکہ وہ مجموعہ ہے ان خصوصیات کا جو زبان کے اندر ایک آواز کو دوسری تمام آوازوں سے الگ کرتی ہیں، اور سب کی سب بیک وقت سماعت کو متاثر کرتی اور اپنا تاثر ذہن تک پہنچاتی ہیں۔

زبان کی بنیادی ممیّز اکائیوں کی تلاش کا اولین نقش سنسکرت گرامر نویسوں کے اس نظریے میں ملتا ہے جو ''سپھوٹ'' کے نام سے مشہور ہے۔ جدید دور میں اس سے متعلق باقاعدہ تحقیق انیسویں صدی کے آخر میں یورپ میں شروع ہوئی اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس میں زیادہ دلچسپی لی جانے لگی۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں مزید بحث و مباحثے سے اس مسئلے کے بعض نئے پہلو سامنے آئے۔ 1939 میں پہلی مرتبہ تروبتزکوی اور فان وائک نے اسے سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تحقیقات کو آگے بڑھانے اور اسے باضابطہ صوتیاتی نظریے کی حیثیت سے پیش کرنے کا سہرا ہارورڈ یونیورسٹی کے روسی الاصل پروفیسر رومن یاکوب سن کے سر ہے۔ انھوں نے مشہورِ عالم سائنسی ادارے میسوچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی (MIT) کے پروفیسر مورس ہالے اور رائل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی اسٹاک ہوم کے پروفیسر گنرفانٹ کے ساتھ مل کر اپنے مشترکہ کام کی رپورٹ (Preliminaries to Speech Analysis) (صوتی تجزیے کے مبادیات) پہلی بار 1952 میں پیش کی۔ اس کے بعد یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے، اور اس کا امتیازی خصوصیات کا نظریہ اب جدید ترین صوتیاتی نظریے کی حیثیت سے دنیا بھر میں عام طور پر تسلیم کیا جاچکا ہے۔

امتیازی خصوصیات کے نئے نظریے کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ صوتی لہر جب

سامع تک پہنچتی ہے تو سامع کو دو رُخے انتخاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یعنی یا تو اسے ایک خصوصیت کی دو بالکل متضاد صفتوں مثلاً پیوست بالمقابل منتشر (Compact versus Diffuse) یا گمبھیر بالمقابل تیکھی (Grave versus Acute) میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا، یا کسی خصوصیت کی موجودگی اور عدم موجودگی مثلاً انفی بالمقابل غیر انفی (Nasality versus Non-Nasality) یا مسموع بالمقابل غیر مسموع (Voiced versus Voiceless) میں سے ایک پر صاد کرنا پڑے گا۔ دو صفتوں میں سے کم از کم ایک کا انتخاب امتیازی خصوصیت (Distinctive Feature) قرار دیا گیا ہے۔ گویا فونیم کی پہچان ایک یا کئی خصوصیات کے دو رُخے انتخاب پر منحصر ہے۔ یہی امتیازی خصوصیات زبان کی بنیادی ممیّز اکائیاں ہیں، کیونکہ ان کی مزید صوتیاتی تقسیم ممکن نہیں۔ آواز کا تنوع حیرت انگیز ہے۔ مثال کے طور پر معمولی سرگوشی سے لے کر بھرپور مسموعی کیفیت تک کئی درجے ہیں؛ لیکن امتیازی خصوصیت کے طور پر صرف دو انتہائی کیفیتوں یعنی مسموعی اور غیر مسموعی کو لیا جاتا ہے، یعنی کوئی صوتی لہر یا مسموعی خصوصیت کی حامل ہوگی یا غیر مسموعی خصوصیت کی۔ اس نظریے کی رُو سے زبان کا رمزیاتی ضابطہ (Code) بنیادی طور پر جوڑے دار (Binary) ضابطہ قرار پاتا ہے، جو عملاً بہت سادہ اور سہل ہے۔ یعنی ہر سوال کا جواب یا تو ہاں ہوگا یا نہیں۔ امتیازی خصوصیات کا یہ دوہراپن (Dichotomy) ہی آوازوں کے فوری ادراک کا ذمّہ دار ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلام (پیغام) نہایت قلیل صوتیاتی سلسلوں میں بٹ جاتا ہے جس سے اس کے تیز رفتار تجزیے اور فوری ادراک کا عمل ممکن ہوجاتا ہے۔ زبان کے صوتیاتی نظام میں کسی ایسے انتہائی سادہ رمزیاتی ضابطے کی موجودگی کی طرف، نظریۂ اطلاع (Information Theory) نے بھی اشارہ کیا ہے۔ عملِ تکلم (Communication Process) سے متعلق تحقیق کرنے والوں اور ماہر عصبیات (Neurologists) نے بھی اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ زبان کی افہام و تفہیم کا راز کسی ایسے انتہائی سادہ عمل ہی میں پوشیدہ ہے۔

اس نظریے کی ایک خوبی تو یہی ہے کہ یہ زبان کی افہام و تفہیم کے بنیادی

فطری عمل کو سمجھنے میں سابقہ نظریوں سے کئی قدم آگے ہے۔ اسے پیش کرتے ہوئے انتہائی کوشش اس امر میں کی گئی ہے کہ امتیازی خصوصیات کی فرد (Inventory) زیادہ سے زیادہ مختصر اور زیادہ سے زیادہ جامع ہو تاکہ ایک تو دنیا کی کوئی زبان اس کے زمرے سے باہر نہ رہ جائے، اور دوسرے اس نظریے میں سادگی اور سہولت کا معیار یہ نہیں کہ زبان میں فونیم کی تعداد کتنی ہے بلکہ یہ کہ فی فونیم کتنی امتیازی خصوصیات لاگو ہوئیں۔ تعداد میں یہ خصوصیات کل بارہ ہیں (جن کی تفصیل ابھی پیش کی جائے گی)، لیکن کسی ایک فونیم پر یہ سب کی سب شاذ و نادر ہی لاگو ہوتی ہیں۔ یہ امتیازی خصوصیات ہی وہ بنیادی مجرد اکائیاں ہیں جن کی مدد سے دنیا کی کسی بھی زبان کی آوازوں کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ صوتی تجزیے کے دوسرے نظریوں میں مصمتوں اور مصوتوں کے لیے الگ الگ ڈھانچے (Frame-work) ہیں، جبکہ زیرِ بحث نظریے میں ایسی کوئی تفریق نہیں ہے؛ اور دونوں قسم کی آوازوں کا تجزیہ ایک ہی ڈھانچے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ اس نظریے میں نتائج اخذ کرنے کے ساتھ ساتھ جانچنے کا عمل بھی کارفرما رہتا ہے اور نتائج کی صحت کی تصدیق خود نتائج کی مدد سے ہوجاتی ہے جیسا کہ آگے چل کر اُردو آوازوں کے تجزیے کی ذیل میں دکھایا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس مقالے کا مقصد یاکوب سن کے نظریے کو تفصیل سے اردو میں پیش کرنا نہیں ہے۔ اوپر جو کچھ کہا گیا، وہ محض بطور تمہید تھا۔ امتیازی خصوصیات کے نظریے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان کتابوں کے مطالعے کی سفارش کی جاتی ہے، جن کے نام اس مقالے کے آخر، ضمیمے میں درج کیے گئے ہیں۔

اس مقالے کا مقصد امتیازی خصوصیات کے نظریے کی روشنی میں اردو آوازوں کا صوتیاتی تجزیہ کرنا اور اس کے نتائج پیش کرنا ہے۔ اردو آوازوں میں سے بھی یہاں صرف مصمتوں کو لیا گیا ہے۔ مصوتوں کا تجزیہ کسی دوسرے موقع پر پیش کیا جائے گا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، اس نئے نظریے کی رُو سے ہندستانی زبانوں میں سے ابھی صرف بنگالی اور ہندی آوازوں کے تجزیے شائع ہوئے ہیں۔

بنگالی کا امریکہ(2) اور ہندی کا روس(3) میں۔ ہندی آوازوں کا تجزیہ محترمہ ایلی زارن کووا نے کیا ہے لیکن انھوں نے صرف مصمتوں کا چارٹ شائع کیا ہے اور بعض پہلوؤں سے ان کی بحث تشنہ بھی رہ گئی ہے، جس کی نشاندہی آگے چل کر کی جائے گی۔ ہم یہاں اردو مصمتوں کی مکمل فرد (Inventory) پیش کررہے ہیں اور ہمارا تجزیہ کئی لحاظ سے ایلی زارن کووا کے ہندی تجزیے سے مختلف بھی ہے۔

مبادیاتِ سمعیات

امتیازی خصوصیات کے نظریے کی بنیاد چونکہ سمعیاتی مواد (Acoustic Data) پر ہے، لہٰذا سب سے پہلے سمعیات سے متعلق چند بنیادی باتوں کی طرف اشارہ بے محل نہیں ہوگا۔ سمعیاتی صوتیات (Acoustic Phonetics) خاصا پیچیدہ اور پھیلا ہوا موضوع ہے۔ اس کی ابتدا دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں پروفیسر مارٹن جوس کی تحقیقات سے امریکہ میں ہوئی، لیکن انھیں اپنے نتائج شائع کرنے کی اجازت دوسری جنگ عظیم کے بعد 1948 میں ملی؛ جب انھوں نے اس موضوع پر پہلی کتاب شائع کی۔ پروفیسر جوس آج کل وسکانسن یونیورسٹی سے متعلق ہیں اور 1964 میں مجھے بھی وہاں ان کے درس میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ان چند برسوں میں اس علم نے حیرت انگیز ترقی کی ہے، کیونکہ اطلاعات، تار، وائرلیس، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ریڈیو، فوجی پیغام رسانی، طبیعات، لسانیات — غرض مختلف علوم کا اس کے نتائج سے گہرا تعلق ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس وقت سینکڑوں سائنس داں مختلف شعبوں اور اداروں میں سمعیاتی صوتیات کے تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور

---

2 Ferguson, Charles A., and Munier Chowdhury
"The Phonemes of Bengali", Language, Vol. 36, No. 1, 1960, pp. 22-59

3 T. Ia. Elizarenkova "Differenctsial'nye Elementary Soglasnykh Fonem Khindi", Voprosy Iazykoznaniia, No. 5 (1961), pp. 22-33.

(میرے لیے اس مضمون کا روسی زبان سے انگریزی میں ترجمہ میرے دوست جناب پیٹر پریسٹ، روز انسٹی ٹیوٹ تراہوٹ، انڈیانا نے کیا جس کے لیے ان کا ممنون ہوں)

پچھلے سترہ اٹھارہ برس میں اس موضوع پر کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے اہم کتابوں کے نام آپ کو ضمیمے میں ملیں گے۔ سمعیات (Acoustics) کا علم سمجھنے کے لیے ان کا پڑھنا ناگزیر ہے۔ یہاں اس سلسلے میں صرف چند بنیادی اشارے کیے جاتے ہیں۔

آواز صوتی لہروں سے مل کر بنتی ہے۔ یہ لہریں فضا میں 1100 فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ یہ لہریں ہی اُن خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں، جن سے ایک آواز دوسری سے الگ پہچانی جاتی ہے۔

سادہ صوتی لہر نام ہے صوتی تھرتھراہٹوں (Vibrations) کا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان کی حرکت اس طرح کی ہوتی ہے جس طرح گھڑی کا پنڈولم اپنے عمودی خط سے آگے پیچھے ہلتا رہتا ہے۔ ایسی ایک حرکت ایک سائیکل یعنی بَل کہلاتی ہے۔ چونکہ صوتی لہریں ہوا میں آگے بڑھتی ہیں، اس لیے ایک سیکنڈ میں جتنے سائیکل یعنی بَل مکمل ہوتے ہیں، وہ اس آواز کا صوتی تواتر (Frequency) کہلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شکل دیکھیے :

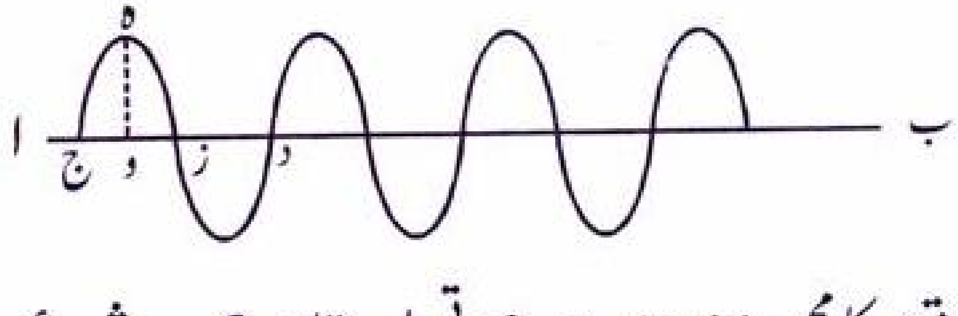

ا اور ب وقت کا محور (Axis) ہے۔ صوتی لہر مقام ج سے شروع ہوتی ہے، مقام د پر اس کا ایک سائیکل مکمل ہوا ہے۔ فرض کیجیے، یہ صوتی لہر ایک سیکنڈ میں 400 سائیکل مکمل کرتی ہے؛ لہٰذا اس کی رفتار یعنی صوتی تواتر (Frequency) 400 سائیکل فی سیکنڈ قرار پائے گی، یعنی یہ صوتی لہر ایک سیکنڈ میں 400 بار تھرتھراتی (Vibrate) ہے۔

صوتی لہروں کی رفتار اعضائے صوت کے تناؤ، رکاوٹ کی نوعیت، ہوا کے راستے کی شکل، اور ان کے سائز اور حجم پر منحصر ہے۔

صوتی تواتر اور لَے (Tone) کا گہرا تعلق ہے۔ ایک طرح کے صوتی تواتر سے

ہمیشہ ایک طرح کی لَے (Tone) پیدا ہوگی؛ جتنی رفتار بڑھے گی اتنی ہی لَے بڑھے گی۔ اس کا بالعکس بھی صحیح ہے۔ صوتی لہر کی قوس کا فاصلہ و — ہ اس کی اونچائی (Amplitude) کہلاتا ہے۔ اس کا گہرا تعلق آواز کی شدت (Intensity) سے ہے؛ جتنی اونچائی بڑھے گی اتنی ہی آواز کی شدت بڑھے گی۔

عام طور پر انسان 600 سائیکل فی سیکنڈ سے لے کر 4200 سائیکل فی سیکنڈ تک کی آواز سن کر اسے سمجھ سکتا ہے۔ اس سے نیچی آواز انسانی کانوں کے لیے بہت مدھم ہے اور اس سے اونچی اذیت دہ ہے۔ انسانی آواز کئی صوتی لہروں کا مجموعہ ہوتی ہے جن کی رفتار، لَے اور شدت باہم مختلف ہوتی ہے؛ اس لیے انسانی آواز مرکب صوتی لہروں کی ذیل میں آتی ہے۔

ہر صوتی لہر اپنی راہ میں آنے والے ان اجسام (Bodies) میں جو تھرتھرا سکتے ہیں، مزید صوتی تھرتھراہٹیں (Vibrations) پیدا کر دیتی ہیں، اس عمل کو گمک (Resonance) کہتے ہیں۔ انسان کے اعضائے صوت میں پہلا گمکدار خول (Resonator) حلق کا درمیانی حصہ ہے، اور دوسرا دہانے کے اندر کا راستہ ہے۔ اکثر آوازوں میں حلق میں پیداشدہ گمک (Resonance) دہانے کے گمکدار خول میں مزید گمک پیدا کرتی ہے۔ انفی آوازوں میں ناک تیسرے گمکدار خول (Resonator) کا کام دیتی ہے۔

صوتی لہروں کو ناپنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لیے کئی مشینیں استعمال ہوتی ہیں، جن میں جدیدترین اور سب سے اہم سوناگراف ہے۔ اس میں 2.4 سیکنڈ تک کی بات بھری جاسکتی ہے اور پھر اس کا سپکٹروگرام (Spectrogram) یعنی سمعیاتی نقش ایک لمبے کیمیائی کاغذ پر بجلی کی سوئی کی نوک سے بنایا جاسکتا ہے۔ ایسے کچھ سپکٹروگرام اس مقالے کے آخر میں شائع کیے جارہے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ نیچے کا افقی خط وقت کا محور (Axis) ہے۔ صوتی تواتر کی لکیریں اس کے اوپر بنتی چلی جاتی ہیں۔ سپکٹروگرام میں ساڑھے سات ہزار سائیکل فی سیکنڈ تک کا نقش مرتسم ہوسکتا ہے۔ آواز کی شدت کی قوسیں پہلوئی سیکشن میں بنائی جاسکتی ہیں جن کی مزید تفصیل

سمعیات کے ادب میں ملے گی۔ سپکٹروگرام دو طرح کے ہوتے ہیں، چھوٹی پٹی (Narrow Band) کے اور بڑی پٹی (Wide Band) کے۔ پہلے میں صوتی لہروں کا تجزیہ 45 سائیکل فی سیکنڈ اور دوسرے میں 300 سائیکل فی سیکنڈ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ پہلی قسم کے سپکٹروگرام میں صوتی لَے (Tone) کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے اور دوسری قسم کے سپکٹروگرام میں آوازوں کے دوسرے خصائص کو۔ آوازوں کے صوتیاتی تجزیے کے لیے زیادہ تر بڑی پٹی کے سپکٹروگرام ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس مقالے کے آخر میں جو سپکٹروگرام پیش کیے گئے ہیں، وہ بڑی پٹی ہی کے ہیں۔

صوتی تواتر کا وہ اجتماع جس سے ایک آواز دوسری سے الگ پہچانی جاسکتی ہے، سمعیاتی خط (Formant) کہلاتا ہے۔ اس سے سمعیاتی نقش (Spectrum) میں کالی بھاری افقی لکیریں سی بن جاتی ہیں۔ مصوتوں میں ایسے کم از کم دو سمعیاتی خط (Formant) ضرور ہوتے ہیں، جن کی مدد سے مصوتوں کی پہچان میں مدد ملتی ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر 1)۔ یہ دو خط اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مصوتوں کی تشکیل میں حلق کا راستہ اور دہانے کا راستہ دو گمکدار جوف (Resonance Chamber) کی حیثیت سے ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ غنّہ آوازوں میں ایک اور سمعیاتی خط اکثر پہلے اور دوسرے کے بیچ میں مرتب ہوتا ہے —؛ یا پہلا کمزور پڑ جاتا ہے اور اس نئے خط کے ساتھ مل کر کچھ پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مسموع آوازوں کے سپکٹرم میں بالکل نیچے ایک موٹی سی لکیر بن جاتی ہے جسے مسموعی لکیر (Voice Bar) کہتے ہیں۔ بندشی آوازوں میں مصوتوں کی طرح سمعیاتی خط نہیں بنتے بلکہ خاموشی کا وقفہ یعنی خالی جگہ ملتی ہے جو ہوا کا راستہ لمحے بھر کے لیے بند ہونے کی نشانی ہے، پھر ہوا کا راستہ کھلتے ہی ایک عمودی لکیر سے نقش مرتسم ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر 2؛ ٹ، ک)۔ بندشی آوازیں اکثر اپنے ماقبل یا مابعد کے سمعیاتی خطوط پر اپنے مختلف اثرات سے پہچانی جاتی ہیں۔ صفیری آوازوں میں صوتی لہروں کی اضطرابی کیفیت (Turbulance) سے دھندلی دھندلی عمودی لکیریں بن جاتی ہیں جو اور آوازوں میں نہیں بنتیں۔ انھیں صوتی لہروں کی رگڑ (Friction) سے پیدا ہونے

والے انتہائی شور (White Noise) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ سپکٹروگرام آوازوں کے تسلسل کا نقش ہے اور اس میں آواز اپنے آگے اور پیچھے کی آوازوں کے ساتھ گتھی ہوئی سامنے آتی ہے۔ صوتیات کا وہ تصور ناقص کہا جائے گا جس میں آوازوں کا تصور قطعیت کے ساتھ ایک کے بعد ایک سلسلہ وار وارد ہونے والی چیز کے طور پر کیا جائے۔ واقع یہ ہے کہ بول چال کی آوازوں میں اچھی خاصی جزوی تطبیق (Overlapping) پائی جاتی ہے۔ ایک آواز ابھی پوری طرح ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری شروع ہوجاتی ہے اور اس طرح سپکٹرم میں لفظ کے اندر ایک آواز کا انجام دوسری کے آغاز سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ مصمتے اکثر ماقبل یا مابعد کے مصوتوں پر اپنے سمعیاتی اثرات سے پہچانے جاتے ہیں؛ باقی آوازوں میں اکثر و بیشتر سپکٹرم کے آخری حصوں سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ پھر بھی چونکہ آوازوں کے باہمی اثرات بہت اہمیت رکھتے ہیں، سپکٹروگراموں کا پڑھنا اور ان سے نتائج نکالنا خاصا پیچیدہ اور دشوار کام ہے۔ ان میں بیسیوں عوامل کام کرتے ہیں، جنھیں پوری طرح سمجھنے کے لیے سمعیات سے متعلق اُن کتابوں کا مطالعہ از بس ضروری ہے، جن کی فہرست ضمیمے میں دی گئی ہے۔

امتیازی خصوصیات

آوازی خصوصیات (Sonority Features)

(1) مصوتی / غیرمصوتی (Vocalic / Non-vocalic)

مصوتی آوازوں میں واضح طور پر سمعیاتی خطوط (Formant) موجود ہوتے ہیں۔ غیرمصوتی آوازوں کے سمعیاتی خطوط اتنے واضح نہیں ہوتے۔ مردانہ آوازوں کے پہلے تین سمعیاتی خطوط عموماً 3200 سائیکل فی سیکنڈ سے نیچے پائے جاتے ہیں۔

مصوتی آوازوں کے لیے صوتی راستہ نسبتاً کھلا رہتا ہے اور ان میں مسموع کیفیت پائی جاتی ہے جس کی ابتدا سپکٹرم میں اچانک نہیں ہوتی۔ (ملاحظہ ہو شکل

نمبر2)

(2) **مصمتی / غیر مصمتی (Consonantal / Non-consonantal)**

مصمتی آوازوں کے (Total Energy) سپکٹرم میں زیریں/بالائی کلی قوت پورے سپکٹرم میں صفر (Zero) یعنی خالی جگہیں نمایاں ہوتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر2)۔ مصمتی آوازوں کے لیے صوتی راستے میں رکاوٹ پائی جاتی ہے؛ غیر مصمتی آوازوں کے لیے راستہ نسبتاً کھلا ہوتا ہے۔

مصوتے مصوتی (Vocalic) ہیں اور غیر مصمتی (Non-consonantal)، جبکہ مصمتے مصمتی (Consonantal) ہیں اور غیر مصوتی (Non-vocalic)۔ یہ تقسیم دنیا کی تمام زبانوں میں ملتی ہے۔ رواں آواز (Liquid) یعنی ل، اور لرزشی اور تھپکدار 'ر' کی بعض قسمیں مصوتی (Vocalic) بھی ہیں اور مصمتی (Consonantal) بھی، یعنی ان کے لیے صوتی راستہ نسبتاً کھلا بھی رہتا ہے اور رکاوٹ بھی ڈالی جاتی ہے۔ لہریے (Glide) یعنی ی، و اور ہمزہ غیر مصوتی (Non-vocalic) ہیں اور غیر مصمتی (Non-consonantal) بھی، اس لیے کہ ان کے لیے ہوا کا راستہ غیر مصوتی آوازوں جیسا ہے، مگر ان کے سپکٹرم میں مصمتوں کی طرح صفر یعنی خالی جگہیں نہیں پائی جاتیں۔

(3) **پیوست / منتشر (Compact / Diffuse)**

پیوست آوازوں میں سمعیاتی خطوط سپکٹرم کے مرکز میں نمایاں طور پر ساتھ ساتھ ملتے ہیں، جبکہ منتشر آوازوں میں ایک یا ایک سے زیادہ سمعیاتی خط مرکز سے ہٹے ہوتے ہیں۔ پیوست مصوتوں میں دوسرا اور تیسرا سمعیاتی خط ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں جتنے قریب ہوں گے، آواز اتنی ہی زیادہ پیوست ہوگی۔ پیوست اور منتشر آوازوں کا فرق دراصل گمکدار جوف (Resonance Chamber) کا ہے۔ پیوست آوازوں میں رکاوٹ کے آگے کا جوف بڑا اور پیچھے کا نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے۔ منتشر آوازوں میں صورت اس کے برعکس ہے۔

کھلے مصوتے سب سے زیادہ پیوست اور بند مصوتے سب سے زیادہ منتشر

مانے گئے ہیں۔ اسی طرح غشائی، تالوئی، پیش تالوئی مصمتے پیوست؛ اور لبی، دنتی اور بالا دنتی مصمتے نسبتاً منتشر آوازوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر ایک)

(4) زوردار/کم زور (Tense / Lax)

کمزور آوازوں کے مقابلے میں زوردار آوازوں کا زمانی وقفہ زیادہ ہوتا ہے اور ان میں قوت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر 4)۔ زوردار آوازوں میں ہوا کا دباؤ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اور صوتی راستے میں ایک طرح کا تناؤ (Tension) بھی پیدا ہوجاتا ہے۔

مصوتوں میں زوردار فونیم کا زمانی وقفہ کمزور فونیم سے نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ مصمتوں میں بھی زمانی وقفے کا فرق اہم ہے؛ لیکن بندشی زوردار آوازوں میں دھماکا (Explosion) نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے زوردار مصمتوں کو Fortis اور کمزور مصمتوں کو Lenis کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو مصوتوں میں /a/ اور /ū/ زوردار، اور /ə/ اور /u/ کمزور ہیں۔ اکثر زبانوں میں مصمتوں میں زوردار خصوصیت غیرمسموع آوازوں کے ساتھ اور کمزور خصوصیت مسموع آوازوں کے ساتھ نتھی ہوجاتی ہے، چنانچہ ان کے صوتی چارٹ میں ان دو خصوصیتوں میں سے صرف ایک کو لیا جاتا ہے، لیکن ہندآریائی زبانوں (بشمول اردو) میں ہکاریت (Aspiration) کی وجہ سے یہ اشتراک ممکن نہیں؛ اس لیے کہ ہکاریت سے آواز کمزور (Lax) ہوجاتی ہے اور ہندآریائی زبانوں میں ہکار اور سادہ جوڑے مسموع اور غیرمسموع دونوں طرح کی آوازوں میں ملتے ہیں۔ چنانچہ ان زبانوں میں زوردار/کمزور کے علاوہ مسموع / غیرمسموع کی امتیازی خصوصیت سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اردو میں زوردار/ کمزور کی امتیازی خصوصیت مصوتوں سے متعلق ہے، مصمتوں میں یہ غیر ہکاریت/ ہکاریت سے تکملی بٹوارے میں ہے۔

(5) مسموع/غیرمسموع (Voiced / Voiceless)

سپکٹرم میں زیریں مسموعی لکیر (Voice Bar) کی موجودگی/ غیرموجودگی۔

مسموع آوازیں یعنی ب، د، گ وغیرہ کے پیدا کرنے میں صوتی لبوں (Vocal

Cords) کی لرزش بھی شامل رہتی ہے۔ جن آوازوں میں ان رگوں کا راستہ نسبتاً کھلا رہے اور لرزش پیدا نہ ہو، انھیں غیر مسموع کہتے ہیں، مثلاً پ، ت، ک وغیرہ۔

مسموع آوازوں میں اصل مخرج کے علاوہ صوتی لبوں کی لرزش کا سمعیاتی اثر بھی مرتب ہوتا ہے، گویا ہوا کا دباؤ دو مخرجوں سے بیک وقت کام کرتا ہے، چنانچہ ان کے سپکٹرم میں دوسرے مخرج کے سمعیاتی خطوط بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ سپکٹرم کے سب سے نچلے حصے میں بنیاد کی لکیر کے ساتھ ساتھ جو ذرا چوڑا سا خط چلا گیا ہے، یہی مسموعی لکیر (Voice Bar) ہے۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر 6)

(6) انفی / دہانی (Nasal / Oral)

غیر انفی فونیم کے مقابلے میں انفی فونیم کے سپکٹرم بالائی سمعیاتی خطوط کا گہرا دباؤ ملتا ہے جو غیر انفی آوازوں کے سپکٹرم سے غائب ہے۔ انفی کیفیت سے جو سمعیاتی خط بنتا ہے، ساتھ کی آوازوں سے ملتے ہوئے اس میں ایک طرح کا اچانک پن پایا جاتا ہے۔ انفی آوازوں کے سپکٹرم میں قوت خاصے چوڑے حصے میں پھیلی ہوئی ملتی ہے۔ پہلا سمعیاتی خط اکثر کمزور ہوتا ہے اور اوپر کے حصے میں انفی سمعیاتی خط کا اضافہ ملتا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر 3)۔ انفی آوازوں میں نرم تالو کے نیچا ہونے کی وجہ سے ہوا دو کالموں میں بٹ جاتی ہے اور دہانے کے گمکدار خول (Resonator) پر ناک کے گمکدار خول کا اضافہ ہو جاتا ہے؛ اس طرح دو گمکدار جوف ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔

(7) مسلسل / رکاوٹ دار (Continuant / Discontinuous)

صوتی لبوں کی لرزش سے جو مسموعی لکیر (Voice Bar) سپکٹرم میں بنتی ہے، رکاوٹ دار آوازوں میں اس کے اوپر کا حصہ خالی رہتا ہے، یعنی اس میں خاموشی پائی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد یکلخت ایک عمودی خط سے آغاز ہوتا ہے اور سمعیاتی خطوط کے حصے میں قوت کا پھیلاؤ دکھائی دیتا ہے۔ یکلخت آغاز کی یہ کیفیت مسلسل آوازوں میں نہیں ملتی۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر 2)۔

رکاوٹ دار آوازوں میں ہوا کا راستہ یکلخت کھلتا ہے جیسا کہ بندشی آوازوں

میں ہوتا ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں صفیری اور رواں آوازوں میں ہوا کا راستہ بتدریج کھلتا ہے۔ اردو پ، ب، ت، د، ر وغیرہ رکاوٹ دار آوازیں ہیں اور ل، ف، س، ز وغیرہ مسلسل ہیں۔ یہ خصوصیت ایک طرف بندشی اور صفیری اور دوسری طرف رواں اور تھپکدار آوازوں میں تقابل کی ذمہ دار ہے۔

(8) سخت / نرم (Strident / Mellow)

سخت آوازوں میں زوردار شور کی کیفیت پائی جاتی ہے، جس کی صوتی لہریں بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ سپکٹرم کا اوپری حصہ اس شور کی وجہ سے تقریباً سیاہ نظر آتا ہے۔ نرم آوازوں میں صوتی لہریں کسی حد تک باقاعدہ ہوتی ہیں اور الگ الگ دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان آوازوں کا سپکٹرم نسبتاً کم سیاہ نظر آتا ہے۔

سخت آوازوں میں مخرج کے قریبی اعضا کے کنارے غیرہموار ہوتے ہیں۔ نرم آوازوں میں اس کے برعکس کنارے ہموار ہوتے ہیں۔ مثلاً س، ز، سخت آوازیں ہیں کیونکہ ان میں نکلتے وقت ہوا نچلے دانتوں کے غیرہموار کناروں سے ٹکراتی ہے اور صوتی لہروں میں اضطرابی کیفیت (Turbulance) پیدا ہوجاتی ہے، جبکہ خ، غ میں ایسا نہیں ہوتا۔ اردو ق بھی سخت آواز ہے۔

(9) منقطع / غیرمنقطع (Checked / Unchecked)

منقطع آوازوں میں نسبتاً کم وقت میں زیادہ قوت کا تیز رفتار اظہار ہوتا ہے اور غیرمنقطع آوازوں میں نسبتاً زیادہ وقت میں کم قوت کا سست رفتار اظہار ہوتا ہے۔ منقطع آوازیں سپکٹرم میں یکلخت مدھم ہوجاتی ہیں۔

منقطع آوازیں حلقی اور غیرمنقطع آوازیں غیرحلقی ہوتی ہیں۔ حلق میں حنجرے یا صوتی لبوں کو یکلخت کھولنے، بند کرنے یا بند کرکے یکلخت کھولنے سے ایک صوتی کھٹک سی پیدا ہوتی ہے جسے Glottal Catch کہتے ہیں۔ یہی آواز منقطع خصوصیت کی حامل ہے۔ اس کی بہترین مثال عربی ہمزہ ہے جو قدرے فرق کے ساتھ کئی زبانوں میں ملتا ہے۔ اردو میں حلقی بندشی آواز لفظ ''مسئلہ'' کے محتاط تعلیم یافتہ تلفظ میں اور کبھی کبھی ع کے لیے بولی جاتی ہے۔

لہجے کی خصوصیات (Tonality Features)

(10) گمبھیر / تیکھی (Grave / Acute)

گمبھیر آوازوں میں سپکٹرم کے بالائی حصے میں مقابلتاً زیادہ قوت کا اجتماع ہوتا ہے؛ تیکھی آوازوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ گمبھیر آوازوں میں دوسرا اسمعیاتی خط نسبتاً نیچے ہوتا ہے۔

گمبھیر آوازیں بیرونی (Peripheral) اور تیکھی آوازیں نسبتاً درمیانی (Medial) ہوتی ہیں۔ دنتی اور تالوئی آوازوں کے مقابلے میں لبی اور غشائی آوازیں بیرونی تسلیم کی جاتی ہیں۔ بیرونی یعنی غشائی اور لبی آوازوں میں گمکدار جوف نسبتاً کم خانہ دار (Compartmented) ہوتا ہے۔ اردو ک گ گمبھیر آوازیں ہیں اور ت، د تیکھی۔ مصوتوں میں اؤ /ū/ سب سے زیادہ گمبھیر اور اي /ī/ سب سے زیادہ تیکھی آواز ہے۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر ایک)

(11) سپاٹ / غیر سپاٹ (Flat / Plain)

غیر سپاٹ آوازوں کے مقابلے میں سپاٹ آوازوں کے سپکٹرم میں بالائی صوتی تواتر (Frequency) میں نیچے کی طرف جھکاؤ ملتا ہے۔ (ملاحظہ ہو شکل نمبر 5)

سپاٹ آوازوں کو پیدا کرنے کے لیے دہانے (Oral Orifice) کے اگلے حصے کو لب سکیڑ کر یا کسی دوسرے طریقے سے لمبا اور تنگ کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حلق کا اوپر کا حصہ Pharynx بھی کچھ کچھ سکیڑا جاتا ہے جس سے حلقی کیفیت (Pharyngealization) پیدا ہوتی ہے۔ ایسی آوازیں خصوصاً عربی اور ترکی میں پائی جاتی ہیں۔ اُزبک زبان میں عربی سے مستعار آوازوں کی یہ خصوصیت لبوں کو گول کرکے پیدا کی جاتی ہے کیونکہ ادراک (Perception) پر دونوں کا اثر تقریباً ایک سا پڑتا ہے۔ کسی ایک زبان میں یہ دونوں خصوصیتیں یعنی حلقی اور لبی کیفیت ایک ساتھ نہیں پائی جاسکتیں۔ ہندآریائی اور دراوڑی زبانوں میں یہ حلقی خصوصیت مفقود ہے۔ اس کے بدلے ان میں یہ خصوصیت معکوسی اور غیر معکوسی کے فرق میں ظاہر ہوتی

ہے۔ معکوسی آوازیں پیدا کرنے کے لیے بھی حلق کے بالائی حصے (Pharynx) کو تنگ کیا جاتا ہے اور زبان کی نوک کو تالو کی طرف اُلٹا موڑنے سے دہانے کا صوتی راستہ خفیف سا لمبا اور تنگ ہوجاتا ہے۔

(12) **تیز / کند (Sharp / Plain)**

متعلقہ کند آوازوں کے مقابلے میں تیز آوازوں کے بالائی صوتی تواتر میں اوپر کی طرف جانے کا رجحان ملتا ہے۔ اس صوتی تواتر کو پیدا کرنے کے لیے صوتی راستے میں زبان کے ایک حصے کو تالو کی طرف اٹھایا جاتا ہے جس سے تالوئیت (Palatalization) کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حلق کے بالائی حصے کا راستہ یعنی منہ کا پچھلا حصہ بھی نسبتاً زیادہ کھل جاتا ہے۔ یہ خصوصیت روسی زبان میں بعض آوازوں کی تفریق میں مدد دیتی ہے؛ اردو میں یہ صورت نہیں ہے۔

صوتیاتی تجزیہ

نئے نظریے کی روشنی میں اردو آوازوں کا تجزیہ پیش کرنے سے پہلے چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

مصمتوں کے گوشوارے پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا کہ اس میں اُن تمام آوازوں کو شامل کرلیا گیا ہے جو اُردو کی مصمتی فونیم کی ذیل میں آسکتی ہیں۔ ایلی زارن کووا نے اپنے روسی مضمون میں جس کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، کل 34 ہندی فونیم لی ہیں ان میں سے تیرہ ہکار فونیم ہیں جنھیں ہم نے صرف ایک علامت /H/ سے ظاہر کیا ہے۔ اس طرح ایلی زارن کووا اور ہمارے گوشوارے میں صرف 21 فونیم مشترک رہ جاتی ہیں۔ ہمارے گوشوارے میں اردو کی کل 30 مصمتی فونیم پیش کی گئی ہیں اس میں جن علامتوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں /ق/، /ژ/، /خ/، /غ/، /ف/، /ع/ بھی شامل ہیں۔ باقی اضافوں کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔ ان تبدیلیوں سے ہمارے گوشوارے کی تقسیم بدل گئی ہے اور اس میں فونیم کی درجہ بندی اور ان کی امتیازی خصوصیات کی تقسیم ایلی زارن کووا کے ہندی گوشوارے سے

مختلف ہے۔

ایلی زارن کوواتے جو 13 ہکار آوازیں لی ہیں، ان میں سے /نھ/، /لھ/، /مھ/ کو بھی انھوں نے الگ فونیم کا درجہ دیا ہے۔ /نھ/ وغیرہ کی ہائے مخلوط اور /پھ/، /بھ/، /تھ/، /دھ/ کی ہائے مخلوط میں جو فرق ہے، اسے انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ /نھ/، /مھ/ میں ہائے مخلوط جزوی ہے اور /پھ/، /بھ/ میں کامل۔ دونوں میں تکملی بٹوارہ (Complementary Distribution) ہے، یعنی دوسری 'ہ' بندشی، ایفریکیٹ آوازوں اور ڑ کے بعد آتی ہے اور پہلی ل، ن، م وغیرہ کے ساتھ۔ پھر یہ کہ اگر /لھ/، /مھ/، /نھ/ کو فونیم کا درجہ دیا جائے، تو /یھ/ اور /وھ/ کو بھی شامل کرنا چاہیے (یھاں، وھاں)۔ لیکن اس سے گوشوارے میں ہکاری آوازوں کی تعداد پندرہ تک جا پہنچے گی جو سائنسی کفایت اور سادگی کے منافی ہے اور جس سے یہ ساری درجہ بندی مضحکہ خیز بن جائے گی۔ چنانچہ اپنے گوشوارے میں ہم نے ہائے مخلوط یعنی ہکاریت (Aspiration) کو صرف ایک علامت /H/ کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔

اپنے مضمون مطبوعہ اردو نامہ، کراچی، شمارہ 14 (صفحہ 12) اور اپنے کتابچے ''اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'' (دوسرا ایڈیشن، صفحہ 35) پر ہم نے ہائے مخلوط کامل، ہائے مخلوط جزوی اور ہائے مخلوط ملفوظی میں تکملی بٹوارہ بتایا تھا، یعنی یہ کہ ہائے ملفوظی، ہائے مخلوط کی طرح ایک ہی صوتی رکن کا جز نہیں ہوتی اور اگر ہو تو اس سے پہلے کوئی نہ کوئی مصوتہ ہوتا ہے؛ اس لیے ہم نے انھیں ایک فونیم کے تحت رکھا تھا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر گیان چند جین بھی اپنی بعض تحریروں میں یہی بات کہہ چکے تھے۔ لیکن فتح، صبح جیسے مستعار الفاظ کی موجودگی میں اس تکملی بٹوارے میں ترمیم کی ضرورت ہے، کیونکہ تعلیم یافتہ طبقے کے محتاط تلفظ میں ان الفاظ میں ملفوظی ہ بندشی آواز کے فوراً بعد ایک ہی صوتی رکن میں واقع ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں ہم نے ہائے ملفوظی کو ہائے مخلوط سے الگ فونیم مانا ہے اور انھیں بالترتیب /h/ اور /H/ سے ظاہر کیا ہے۔

ایلی زارن کوواتے دلیل دی ہے، چونکہ لفظ لکھا /li-khā/ ہے /lik-hā/ نہیں، اس لیے ہکار مصمتہ /kh/ کو /h/ + /k/ نہیں مانا جاسکتا۔ اول تو یہ اعتراض ہائے

مخلوط کی صوتی تقسیم (Distribution) کے نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے؛ کیونکہ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ ہائے مخلوط ماقبل مصمتے کے ساتھ ضم کرکے بولی جاتی ہے اور دونوں آوازیں ایک ہی صوتی رکن کا جزو ہوتی ہیں، تو وہ یہ دلیل نہ لاتیں۔ دوسرے یہ کہ /kh/ یقیناً /k/ + /h/ نہیں، کیونکہ ہکاریت (Aspiration) ہائے ملفوظی سے مختلف ہے۔ اسی لیے تو اس غلط فہمی سے بچنے کے لیے ہم نے یہاں ہکاریت کو /H/ سے اور ہائے ملفوظی کو /h/ سے لکھا ہے، گویا /کھ/، /kH/ ہے، /kh/ نہیں۔

ایلی زارن کووا نے نون کے تحت صرف ایک فونیم کو لیا ہے۔ لیکن بھنگا، گنگا اور منکا، ڈنکا جیسے اقلی جوڑوں کی وجہ سے اس بیان کی صحت پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ میں نے اپنے مضمون ن اور نٓ مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، 8، 15 اور 22 فروری 1965 میں ثابت کیا ہے کہ غشائی نون کے ماحول میں نون کا وقوع تاریخی مارفیمی حد کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد شوکت سبزواری کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے میں نے اردو نامہ، کراچی، شمارہ 25 میں اشارہ کیا ہے کہ نون اور غشائی نون اور نون غنہ تینوں کو ایک ہی فونیم کے تحت لانے کے امکانات بھی ہیں، لیکن اس سلسلے میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فی الحال اس درجہ بندی کے مقصد کے لیے میں نے نون، غشائی نون اور نون غنہ یعنی مصوتی انفی آواز کو الگ الگ بالترتیب /n/، /ŋ/ اور /N/ کی علامتوں سے ظاہر کیا ہے۔ اتنی بات خاطر نشاں رہے کہ جہاں تک مصوتی انفی آواز کو /N/ + V سے ظاہر کرنے کا سوال ہے، پروفیسر گلیسن اس پر صاد کر چکے ہیں[4]:

"The following types of sounds are often best interpreted as sequences of phonemes :

Nasal Vowels [ã] = /an/..."

ایلی زارن کووا اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ ایسا کرنے سے تانتا /tãtā/ اور تانتا /tāntā/ کا فرق ظاہر نہیں کیا جا سکے گا۔ لیکن ہماری درجہ بندی میں

4 An Introduction to Descriptive Linguistics, (Revised) 1961. New York, p. 284

چونکہ تانتا کو /tāNtā/ لکھا جائے گا، اس لیے اس اعتراض کا موقع پیدا ہی نہیں ہوتا۔

/ی/ اور /و/ اردو میں لہریہ Glide کا درجہ رکھتے ہیں اور صوتی ماحول کی مناسبت سے مصوتے یا مصمتے کے طور پر واقع ہوتے ہیں؛ لہٰذا ان دونوں کو بھی مصمتی چارٹ میں شامل کیا گیا ہے؛ ان کے ساتھ ساتھ حلقی بندشی آواز (Glottal Catch) یعنی /?/ کو بھی رکھا گیا ہے۔ اردو رسم الخط میں ع اور ہمزہ دو علامتیں ہیں۔ ع عربی میں حلقی (Pharyngeal) مصمتہ ہے، لیکن اردو میں اپنے ماقبل یا مابعد مصوتے میں ضم ہوکر بولا جاتا ہے۔ یہی عمل اردو میں ہمزہ کے ساتھ ہوتا ہے جو اگرچہ عربی میں حلقی بندشی مصمتہ (Glottal Catch) ہے، لیکن اردو میں دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان کرتا ہے[5]؛ یعنی یہ کہ اردو میں ع اور ہمزہ دونوں کی اصلی آواز باقی نہیں رہی، لیکن گنتی کے چند الفاظ مثلاً نفع، شمع، تعلق، تعجب وغیرہ میں اردو کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے محتاط تلفظ میں ع اور ہمزہ کا تلفظ خفیف سی صوتی کھٹک کے ساتھ کرتا ہے، اس لیے فونیم کے گوشوارے میں اسے بالکل نظرانداز کردینا مناسب نہ ہوگا۔ مگر ایسا چونکہ صرف سماج کے ایک طبقے تک محدود ہے اور بولنے والے کی تہذیبی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے، حلقی بندشی آواز کو اردو کی حاشیائی فونیم (Fringe Phoneme) ماننا چاہیے۔ اسی لیے اس علامت کو گوشوارے میں قوسین میں رکھا گیا ہے۔

ژ بول چال میں اکثر و بیشتر ز میں تبدیل ہوجاتا ہے، لیکن چونکہ اس کا استعمال بھی سماج کے ایک محدود طبقے میں پایا جاتا ہے، اس لیے اسے بھی حاشیائی فونیم کی حیثیت سے گوشوارے میں شامل کیا گیا ہے اور قوسین میں ظاہر کیا گیا ہے۔[6]

---

5 ملاحظہ ہو اسی کتاب کا مضمون 'ہمزہ کیوں؟'

6 ایلی زارن کووا کے بعض دوسرے تسامحات کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے:

(1) مشدد مصمتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایلی زارن کووا نے پکا/ پکّا کے ساتھ، جانا/ جاننا کو گڈمڈ کردیا ہے۔ ان مثالوں میں پکّا میں مشدد مصمتہ ہے، لیکن جاننا میں نون پر تشدید نہیں، بلکہ دونوں نون کے درمیان انحذائی مصوتہ (Elliptical vowel) ہے۔ یعنی سپکٹرم میں

صوتیاتی تجزیے کی وضاحت

گوشوارے میں بائیں ہاتھ کے عمودی کالم میں امتیازی خصوصیات درج کی گئی ہیں۔ اوپر کے افقی کالم میں اردو آوازوں کی علامتیں ہیں۔ یہ آوازیں جن امتیازی خصوصیات کی حامل ہیں، ان کے سامنے جمع کا نشان بنادیا گیا ہے اور اگر نہیں ہیں تو نفی کا نشان درج کیا گیا ہے۔ اگر کوئی خصوصیت کسی آواز کے تقابل میں مدد نہیں دیتی، یا اگر اس آواز کی تفریق دوسری خصوصیات کی مدد سے پہلے ہی مکمل ہوچکی ہے، تو اس آواز کے سامنے صفر کا نشان بنایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ امتیازی خصوصیت اس آواز کی تفریق کے لیے فاضل (Redundant) حیثیت رکھتی ہے۔ اس مقالے کے شروع میں جن 12 امتیازی خصوصیات کی تفصیل پیش کی گئی ہے، اردو آوازوں کی تفریق کے لیے ان میں سے صرف دس کام آتی ہیں۔ نویں خصوصیت منقطع/ غیر منقطع (Checked/Unchecked) اور بارھویں خصوصیت تیز/کند (Sharp/ Plain) یہاں نہیں لی گئی ہیں۔ موخرالذکر قسم کی آوازیں اردو میں موجود نہیں ہیں۔

اب گوشوارے پر نظر ڈالتے ہوئے اول پہلی خصوصیت یعنی مصوتی/ غیر مصوتی (Vocalic/ Non-vocalic) کو لیجیے۔ اس کے سامنے صرف تین خانوں یعنی مصوتی غنیت، ل اور ر کے سامنے جمع کا نشان ہے، باقی تمام خانوں میں نفی کا نشان ہے۔

دونوں کے درمیان معمولی وقفہ یا (Release) ہے۔ یہ انحذ انی مصوتہ مرکزی مصوتے زبر /ə/ کی ذیلی صوت ہے اور معنی کی تفریق میں مدد دیتا ہے، ملاحظہ ہو اقلی جوڑا: سُنّی (اہل سنت) اور سُننی (زید کو گالیاں سننی پڑیں)۔ پہلی مثال میں خاص قسم کا مصمتی خوشہ ہے، دوسری میں نہیں ہے۔

(2) /س/ اور /ز/ کی تفریق ثابت کرنے کے لیے انھوں نے /sīnā/ اور /zīnā/ کی مثال دی ہے۔ یہ غلط ہے؛ /sina/ سینہ اور /zīna/ زینہ ہونا چاہیے۔

انھوں نے ڑ کو ڈ کی ڑھ کو ڈھ کی ذیلی آواز مانا ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ اردو اور جدید ہندی دونوں میں ڈ اور ڑ دونوں الگ الگ فونیم ہیں۔ اس سلسلے میں دیکھیے، ڈاکٹر گیان چند جین کا مضمون ''اردو کے چند کوزی تجھوتیے'' مطبوعہ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم اگست، 15 اگست، 15 اکتوبر 1961۔ نیز ملاحظہ ہوں اقلی جوڑے اُجڑا/ اُجڑ؛ گڑبڑ/ گڈمڈ۔

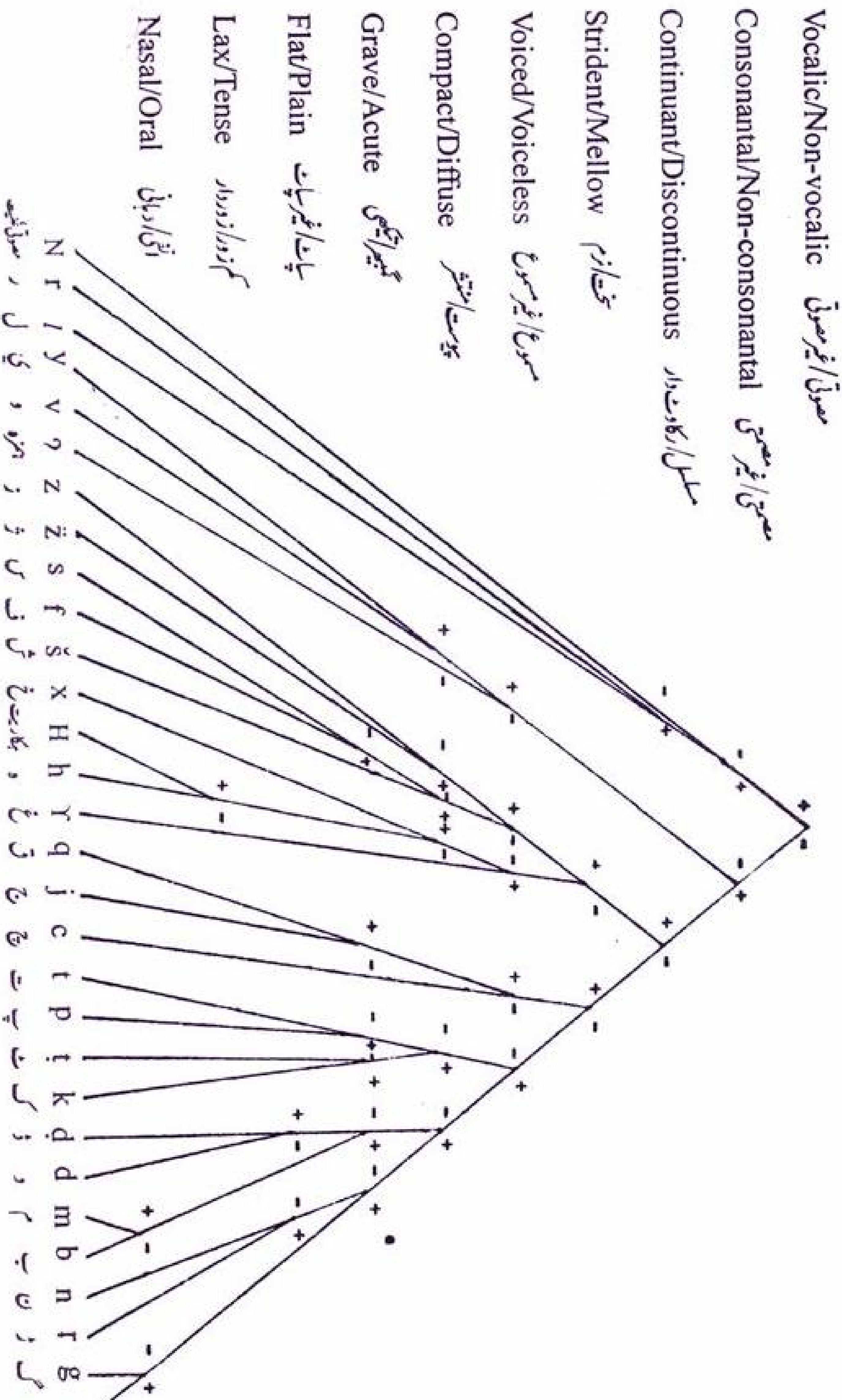
Vocalic/Non-vocalic
Consonantal/Non-consonantal
Continuant/Discontinuous
Strident/Mellow
Voiced/Voiceless
Compact/Diffuse
Grave/Acute
Flat/Plain
Lax/Tense
Nasal/Oral
N r l y v ʔ z ž s f š x H h ɣ q j c t p ṭ k ḍ d m b n r g ŋ

	N	r	l	y	v	?	z	ž	s	f	š	x	H	h	ɣ	q	j	c	t	p	ṭ	k	ḍ	d	m	b	n	ṛ	g	ŋ
Vocalic/Non-Vocalic مصوتی/غیرمصوتی	+	+	+	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
Consonantal/Non-Consonantal مصمتی / غیرمصمتی	-	+	+	-	-	-	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+	+
Continuant/Discontinuous مسلسل / رکاوٹ دار	0	-	+	0	0	0	+	+	+	+	+	+	+	+	+	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
Strident/Mellow سخت / نرم	0	0	0	0	0	0	+	+	+	+	+	-	-	-	-	+	+	+	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
Voiced/Voiceless مسموع / غیرمسموع	0	0	0	+	+	-	+	+	-	-	-	-	-	-	+	+	+	-	-	-	-	-	+	+	+	+	+	+	+	+
Compact/Diffuse پیوست / منتشر	0	0	0	+	-	0	-	+	-	-	+	+	-	-	0	0	0	0	-	-	+	+	-	-	-	-	+	+	+	+
Grave/Acute گمبھیر / تیکھی	0	0	0	0	0	0	0	0	-	+	0	0	0	0	0	+	-	0	-	+	-	+	-	-	+	+	-	-	+	+
Flat/Plain سپاٹ / غیرسپاٹ	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	+	0	+	-	0	0	-	+	0	0
Lax/Tense کم زور / زوردار	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	+	-	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0
Nasal/Oral انفی / دہانی	+	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	0	+	-	+	0	-	+

اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو مصمتوں میں صرف تین آوازیں مصوتی (Vocalic) ہیں، اور باقی سب غیر مصوتی (Non-vocalic)۔ وجہ یہ ہے کہ ل، ر اور مصوتی غنیت اپنی سمعیاتی خصوصیات کی وجہ سے مصوتوں سے قریب ہیں اور ان کے سپکٹرم میں اسی طرح کے سمعیاتی خطوط بنتے ہیں جیسے کہ مصوتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

دوسری امتیازی خصوصیت مصمتی/ غیر مصمتی (Consonantal/ Non-consonantal) ہے۔ پہلی اور دوسری میں سے ایک خصوصیت ہر زبان میں لازماً پائی جاتی ہے۔ اردو میں پہلی خصوصیت کی طرح یہ خصوصیت بھی ہر آواز پر لاگو ہوتی ہے۔ اب ل، ر اور مصوتی غنیت میں سے ل اور ر تو مصمتی ہیں، اس لیے ان کے سامنے جمع کا نشان ہے، لیکن مصوتی غنیت غیر مصمتی ہے، اس لیے اس کے سامنے نفی کا نشان ہے۔ اسی طرح لہریے (Glides) ی، و غیر مصمتی ہیں اور ان کے سامنے نفی کا نشان ہے، جبکہ باقی تمام مصمتی آوازیں ہیں اور ان کے سامنے جمع کا نشان ہے۔ مصوتی غنیت کی پہچان یہیں سے مکمل ہوگئی یعنی مصوتی اور غیر مصمتی، کیونکہ اردو کی کوئی اور آواز محض ان دو خصوصیات کی حامل نہیں؛ چنانچہ اس پر بعد کی خصوصیات لاگو نہیں ہوں گی۔ اس لیے اس کے نیچے کے تمام خانوں میں صفر کے نشان لگا دیے گئے ہیں، سوائے دسویں خانے کے جو غنیت کا ہے۔ اس خانے میں جمع کا نشان ہے، یہ بتانے کے لیے کہ یہ آواز غیر غنّی مصوتوں سے الگ وجود رکھتی ہے۔

گوشوارے میں تیسری خصوصیت مسلسل/ رکاوٹ دار (Continuant/ Discontinuous) اردو میں ل اور ر کی تفریق کو مکمل کرتی ہے۔ رواں ل مسلسل آواز ہے اور تھپک دار ر رکاوٹ دار آواز ہے۔ مصوتی غنیت کی طرح ل اور ر بھی اب گوشوارے میں تمام دوسری آوازوں سے الگ پہچانی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ باقی خصوصیات ان کی تفریق کے لیے فاضل ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے باقی خانوں میں صفر کے نشان لگا دیے گئے ہیں۔ بقیہ آوازوں میں ف، س، ز وغیرہ صفیری آوازیں مسلسل ہیں، اس لیے ان کے سامنے جمع کا نشان ہے۔ لہریوں کو چھوڑ کر باقی سب کے سامنے نفی کا نشان ہے، کیونکہ وہ رکاوٹ دار آوازیں ہیں۔ لہریوں کی تفریق میں اس

خصوصیت سے کوئی مدد نہیں ملتی، اس لیے ان کے خانوں میں صفر درج کی گئی ہے۔

چوتھی خصوصیت سخت/ نرم (Strident/ Mellow) کی ہے۔ صفیری آوازوں میں سے خ، غ، ہ اور ہکاریت نرم ہیں اور ف، س، ز، ش، ژ سخت۔ اسی طرح بندشی معکوسی اور غنّی آوازوں میں سے ق، چ اور ج سخت ہیں اور باقی سب نرم۔

پانچویں خصوصیت مسموع/ غیر مسموع (Voiced/ Voiceless) ہے۔ یہ ع، غ اور چ کی تفریق کو مکمل کرتی ہے؛ کیونکہ ی، و اور ہمزہ میں سے صرف ع غیر مسموع ہے؛ اسی طرح خ، غ، ہ اور ہکاریت میں صرف غ مسموع ہے؛ اور ج، چ اور ق میں صرف چ غیر مسموع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تین آوازوں یعنی ع، غ اور چ کی الگ الگ پہچان مکمل ہوگئی۔ باقی آوازوں میں ز، ژ مسموع ہیں، ف، س، ش غیر مسموع؛ اور پ، ت، ٹ، ک غیر مسموع ہیں اور ب، د، ڈ، گ اور ڑ، م، ن، ڼ مسموع ہیں۔

چھٹی خصوصیت پیوست/ منتشر (Compact/ Diffuse) ہے۔ یہ چھ آوازوں /ی/ : /و/ ؛ /ژ/ : /ز/ ؛ /ش/ بمقابلہ /ف/ ، /س/ ؛ اور /خ/ بمقابلہ /ہ/ اور /ہکاریت/ کی تفریق کو مکمل کرتی ہے۔ باقی آوازوں میں ک اور ٹ پیوست ہیں اور ان کے مقابلے میں پ اور ت منتشر ہیں۔ اسی طرح گ، ڼ بمقابلہ ب اور م؛ ڑ بمقابلہ ڈ؛ اور ن بمقابلہ د پیوست خصوصیت کی حامل ہیں۔

ساتویں خصوصیت گمبھیر/تیکھی (Grave/ Acute) ہے جو آٹھ آوازوں یعنی /س/ : /ف/ ؛ /ج/ : /ق/ ؛ /ت/ : /پ/ ؛ /ٹ/ : /ک/ کی الگ الگ تفریق کو مکمل کرتی ہے۔ ان جوڑوں میں پہلی آواز تیکھی اور دوسری گمبھیر ہے، اس لیے کہ پہلی میں دوسری کے مقابلے پر صوتی جوف نسبتاً زیادہ خانہ دار ہے، اور دوسری کے سپکٹرم کے بالائی حصے میں مقابلتاً زیادہ قوت کا اجتماع ملتا ہے۔

آٹھویں خصوصیت سپاٹ/ غیر سپاٹ (Flat/ Plain) کا استعمال اردو میں محدود نوعیت کا ہے اور یہ صرف معکوسی/ غیر معکوسی آوازوں کی تفریق میں مدد دیتی ہے۔

معکوسی آوازوں میں /ٹ/ کی تفریق کے لیے یہ خصوصیت فاضل ہے، کیونکہ /ٹ/ کی پہچان اس سے پہلے گمبھیر/تیکھی کی مدد سے مکمل ہوچکی ہے۔ البتہ اس کی مدد سے /ڈ/ بمقابلہ /ڈ/ اور /ڑ/ بمقابلہ /ن/ کی تفریق مکمل ہوتی ہے۔

نویں خصوصیت زوردار/ کمزور (Tense/ Lax) مصمتوں میں صرف /H/ یعنی ہکاریت پر لاگو ہوتی ہے اور اسے /ہ/ یعنی /h/ سے الگ کرتی ہے۔ ہکاریت کمزور آواز ہے اور /ہ/ نسبتاً زوردار۔

دسویں خصوصیت (انفی/ دہانی) بھی محدود نوعیت کی ہے اور صرف ناک کی آوازوں پر لاگو ہوتی ہے۔ اس گوشوارے میں ناک کی آوازیں چار ہیں۔ ن، ں، م اور صوتی غنیت۔ ان میں سے صوتی غنیت اور ں کی تفریق پہلے مکمل ہوچکی ہے، چنانچہ ان کے خانوں میں جمع کا نشان فاضل ہے۔ البتہ یہ خصوصیت /م/ سے /ب/ اور /ن/ سے /گ/ کی تفریق کو پورا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

اس طرح اردو کی 30 مصمتی آوازوں کی باہمی کلی تفریق مکمل ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، ان آوازوں کی امتیازی خصوصیات ان کی علامتوں کے نیچے جمع اور نفی کے نشانات کی صورت میں درج ہیں۔ آزمائش کے لیے ان میں سے کسی آواز کو لیجیے، اس کی امتیازی خصوصیات کے نشانات باقی 29 آوازوں کے نشانات سے مختلف ہوں گے۔ پس ثابت ہوا کہ ان میں سے ہر آواز باہمدگر مختلف ہے اور زبان کے نظام میں اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظریے کی سب سے بڑی خوبی جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے، یہ ہے کہ اس کے نتائج خود اپنی صحت کی تصدیق کردیتے ہیں۔

ان 30 آوازوں کے تجزیے کی مندرجہ بالا تفصیل شاخدار درخت (Branching Tree) کی مدد سے زیادہ واضح طور پر سمجھی جاسکتی ہے۔ اس نقشے کی ابتدا پہلی خصوصیت سے ہوتی ہے، اس مقام سے دو شاخیں نکل رہی ہیں؛ ایک طرف جمع کا نشان ہے، دوسری طرف نفی کا۔ اس مقام پر 30 آوازوں میں سے ہر آواز یا تو

مصوتی ہوگی یا غیر مصوتی۔ اگر مصوتی ہے تو اسے جمع کے نشان والی شاخ کی طرف رکھا جائے گا اور غیر مصوتی ہے تو اسے نفی کے نشان والی شاخ کی طرف۔ اسی طرح دوسری، تیسری، چوتھی اور باقی تمام خصوصیات کا معاملہ ہے، جنھیں ہندسوں سے ظاہر کردیا گیا ہے۔ ہر ہندسے سے یعنی ہر شاخ سے پھر دو شاخیں نکلتی ہیں اور ماخذ شاخ کی آوازوں کو ہاں یا نہیں یعنی مثبت یا منفی خصوصیات کی بنا پر ان دو شاخوں میں سے ایک پر بٹ جانا ہوتا ہے۔ (البتہ جو آواز کسی شاخ پر اکیلی رہ گئی ہے، اس شاخ سے کسی مزید شاخ کے پھوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس آواز کی تفریق باقی تمام آوازوں سے مکمل ہوچکی ہے)۔ اس طرح نیچے پہنچتے پہنچتے یہ درخت 30 شاخوں میں بٹ جاتا ہے، اور ہر شاخ سے ایک اور صرف ایک آواز متعلق رہ جاتی ہے جو اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر باقی تمام آوازوں سے مختلف ہے؛ اگر مختلف نہ ہوتی تو ماخذ شاخ سے الگ شاخ پر تنہا آہی نہ سکتی۔ یہ نقشہ علامتی منطق کی اچھی مثال ہے۔ کسی بھی آواز کو لیجیے، جہاں تک وہ ماخذ شاخ پر دوسری آوازوں کے ساتھ چلی آئی ہے، اس کی اور ان دوسری آوازوں کی امتیازی خصوصیات مشترک ہیں، لیکن جہاں وہ بعض دوسری آوازوں کے ساتھ دوسری شاخ پر بٹ گئی ہے، تو اس لیے کہ اس کی امتیازی خصوصیات ماخذ شاخ کی آوازوں سے مختلف اور ساتھی آوازوں سے مشترک ہوگئی ہیں، اور آخر میں جہاں وہ بالکل تنہا کسی شاخ پر رہ گئی ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ یہاں سے اس کی خصوصیات باقی تمام آوازوں سے مختلف ہوگئی ہیں اور ان سب سے الگ اس کی پہچان مکمل ہوگئی ہے۔ اس طرح اس شاخدار درخت کی مدد سے امتیازی خصوصیات کے صوتیاتی تجزیے کی صحت کی سو فی صد تصدیق ہوجاتی ہے۔

(تحریر وسکانسن 1965، طبع نذر ذاکر 1968)

اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی
امتیازی خصوصیات کی روشنی میں[1]

امتیازی خصوصیات (Distinctive Features) کی روشنی میں اردو مصمتوں کا تجزیہ پچھلے مضمون میں پیش کیا جاچکا ہے۔[2] زیرِ نظر مضمون میں اردو مصوتوں سے بحث کی جائے گی۔ امتیازی خصوصیات کے نظریے کا تعارف اور سمعیاتی صوتیات (Acoustic Phonetics) کے مبادیات چونکہ مذکورۂ صدر مقالے میں پیش کیے جاچکے ہیں، یہاں ان کی تکرار نہیں کی جائے گی۔ ان مباحث کے لیے اس مقالے سے رجوع کرنا چاہیے۔ اس مقالے میں اردو مصوتوں کی امتیازی خصوصیات اور ان خصوصیات کی توضیح کے لیے سمعیاتی نقوش یعنی سپکٹروگرام پیش کیے جائیں گے۔

تجزیاتی مواد

درمیانی حالت	مِیل	میل	مَل	مَول	مُل
	مِل	مَیل	مال	مول	مؤل

---

1 اس مضمون میں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ اس تحقیقاتی کام کا حصہ ہے جو میں نے اردو صوتیات اور سمعیاتی صوتیات سے متعلق 1965 میں امریکہ کی وسکانسن یونیورسٹی اور انڈیانا یونیورسٹی میں مکمل کیا تھا۔ اس میں فورڈ فاؤنڈیشن اور وسکانسن یونیورسٹی المنائی ریسرچ ایسوی ایشن کی گرانٹ سے مدد ملی، جس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

2 ملاحظہ ہو ''اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی: امتیازی خصوصیات کی روشنی میں'' مشمولہ نذر ذاکر، جلد اول، دہلی 1968

ابتدائی حالت	اِپش*	ایز*	اَس*	اَوس*	اُس
	اِس	اَیز*	آس	اوس	اؤس*

آخری حالت	کی	کے	گہ*	گو*	—
	کِہ	گے	کا	کو	کؤ

کلید — سے مراد ہے، نہیں پایا جاتا، اور * سے مراد ہے مقید صرفیہ (Bound Morpheme)

مصوتے	اِي	i	اے	e	...َ	ə	اَو	ɔ	و	u
	...ِ	I	اَے	æ	آ	a	او	o	اؤ	ū

پہلے مضمون میں بتایا جاچکا ہے کہ بارہ امتیازی خصوصیات میں سے اردو آوازوں کی درجہ بندی کے لیے صرف دس کام آتی ہیں؛ ان میں سے مصوتوں کے لیے صرف چار کی ضرورت پڑتی ہے۔

شکل نمبر ایک پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلی خصوصیت مصوتی/ غیر مصوتی (Vocalic / Non-Vocalic) کی مدد سے تمام مصوتے مصمتوں سے چھٹ کر الگ شاخ پر آجاتے ہیں۔

دوسری خصوصیت زوردار/ کمزور Tense/ Lax ہے۔ مصوتوں میں زوردار فونیم کا وقفہ کمزور فونیم سے نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ مصوتوں کے زمانی وقفے (Duration) کا چارٹ (شکل نمبر 6) اور سپکٹروگرام دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ /I/ کے مقابلہ میں /i/، / ə / کے مقابلے میں /a/ اور اسی طرح /u/ کے مقابلے میں /ū/ کا زمانی وقفہ کہیں زیادہ ہے۔ اردو، ہندی میں یوں بھی ان کی حیثیت خفیف اور طویل مصوتوں کی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ /e/ کے مقابلے میں /æ/ اور /o/ کے مقابلے میں / ɔ / کا زمانی وقفہ اگرچہ اتنا طویل نہیں جتنا پہلے تین جوڑوں کا ہے، لیکن نسبتاً طویل ہے۔ مثال کے طور پر ابتدائی حالت میں /e/ اور /o/ کا وقفۂ زمانی 38 سائیکل فی سیکنڈ ہے اور /æ/ اور / ɔ / کا 42 سائیکل فی سیکنڈ۔ گویا ان میں خفیف/ طویل کا وہ رشتہ موجود

ہے جو پہلے چھ مصوتوں میں ہے۔ چنانچہ اس خصوصیت کی مدد سے /i/، /e/، /æ/، /a/، /ɔ/ اور /ū/ کی تفریق باقی پانچ مصوتوں سے ہوتی ہے۔ شکل نمبر ایک میں پانچ مصوتے زوردار خصوصیت کی شاخ پر اور باقی پانچ کمزور خصوصیت کی شاخ پر چلے جاتے ہیں۔ شاخ دار درخت سے نیچے کے گوشوارے میں زوردار آوازوں کے خانے میں جمع کا نشان ہے اور باقی خانوں میں نفی کا۔

تیسری خصوصیت گمبھیر اور تیکھی (Grave/ Acute) ہے۔ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مصوتوں کی پہچان میں پہلے دو سمعیاتی خط (Formant) زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ گمبھیر آوازوں میں سپکٹرم کے بالائی حصے میں مقابلتاً زیادہ قوت کا اجتماع ہوتا ہے۔ تیکھی آوازوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ گمبھیر آوازوں میں دوسرا سمعیاتی خط نسبتاً نیچے ہوتا ہے۔ گمبھیر آوازیں بیرونی (Peripheral) اور تیکھی آوازیں نسبتاً درمیانی (Medial) ہوتی ہیں۔ اردو مصوتوں میں / ɔ/، /ū/، /o/، /u/ نسبتاً گمبھیر آوازیں ہیں، اور /æ/، /i/، /e/، / I / تیکھی۔ سپکٹروگرام سے مقابلہ کرنے اور شکل نمبر 3 کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ گمبھیر آوازوں میں دوسرا سمعیاتی خط نسبتاً نچلے حصے میں ہے۔ /I/ چونکہ تیکھی آواز ہے، اس میں پہلا اور دوسرا سمعیاتی خط ایک دوسرے سے خاصے دور ہیں، جبکہ /u/ میں یہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل پاس ہیں، اور سپکٹرم کے نچلے حصے میں ہیں۔ مصوتوں میں /ū/ سب سے زیادہ گمبھیر اور /i/ سب سے تیکھی آواز ہے۔ اس لیے شکل نمبر (1) کے نیچے کے گوشوارے میں گمبھیر آوازوں کے نیچے جمع اور تیکھی آوازوں کے نیچے نفی کا نشان ملتا ہے۔ /a/ اور / ɔ/ کا معاملہ دوسرا ہے۔ / ɔ/ بیشک /e/ کے مقابلے میں تو گمبھیر آواز ہے، لیکن /o/ کے مقابلے میں تیکھی آواز ہے۔ اسی طرح /a/ بھی /æ/ کے مقابلے میں گمبھیر، لیکن / ɔ / کے مقابلے میں تیکھی ہے۔ اسی لیے ان دونوں آوازوں کے خانے میں جمع اور نفی دونوں نشان اوپر نیچے لگا دیے گئے ہیں، اور یہیں سے باقی تمام مصوتوں سے ان دونوں کی تفریق مکمل ہوجاتی ہے۔

اب چوتھی اور آخری خصوصیت پیوست /منتشر (Compact/ Diffuse) کو لیجیے۔ پیوست آوازوں میں سمعیاتی خطوط سپکٹرم کے مرکز میں نمایاں طور پر ساتھ

ساتھ ملتے ہیں، جبکہ منتشر آوازوں میں ایک یا ایک سے زیادہ سمعیاتی خط مرکز سے ہٹے ملتے ہیں۔ پیوست مصوتوں میں دوسرا اور تیسرا سمعیاتی خط ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔ کھلے مصوتے سب سے زیادہ پیوست اور بند مصوتے سب سے زیادہ منتشر مانے گئے ہیں۔ /a/ کے سپکٹروگرام کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ دوسرا اور تیسرا سمعیاتی خط مرکز میں نمایاں طور پر ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔ جبکہ /I/ میں یہ مرکز سے ہٹے ہوئے ہیں۔ نیز /I/ میں پہلا سمعیاتی خط بنیاد کے پاس ہے اور /a/ میں یہ خاصا اونچا ہے۔ شکل نمبر 3 کی مدد سے یہ بات اور بھی اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ /ū/ کے مقابلے میں /ɔ/، /i/ کے مقابلے میں /æ/، اور /u/ کے مقابلے میں /o/ اور /I/ کے مقابلے میں /e/ کے سمعیاتی خطوط ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں، یعنی ان جوڑوں میں سے دوسری آواز پیوست ہے۔ چنانچہ ان کے سامنے جمع کا اور باقی کے سامنے نفی کا نشان بنادیا گیا ہے۔ اس طرح /ə/ کے مقابلے میں /a/ بھی پیوست آواز ہے لیکن ان دونوں مصوتوں کی تفریق باقی تمام مصوتوں سے پچھلی خصوصیت کی بنا پر ہوچکی ہے۔ اس لیے ان کے سامنے صفر کا نشان لگادیا گیا ہے۔

تجزیے کی اس منزل تک پہنچنے کے بعد ہر مصوتہ شاخ دار درخت کی شاخوں پر بٹتے بٹتے تنہا رہ گیا ہے اور ذیل کے گوشوارے میں بھی ہر مصوتے کی خصوصیات کی نشاندہی اس طرح کی جاچکی ہے کہ نشانات کے اعتبار سے ہر مصوتہ باقی تمام مصوتوں سے مختلف قرار پاتا ہے۔ یعنی امتیازی خصوصیات کی مدد سے ان سب مصوتوں کی الگ الگ اور باہمدگر پہچان مکمل ہوگئی ہے۔

شکل نمبر 2 اردو مصوتوں کی امتیازی خصوصیات کو مختصر ترین طور پر پیش کرتی ہے۔ یہ ایک مخمس ہے۔ اس کے پانچ اطراف ہیں اور دو سطحیں۔ ہر کونے پر کسی نہ کسی مصوتے کی علامت درج ہے، یعنی کوئی کونا خالی نہیں ہے۔

پہلی خصوصیت زوردار/کمزور نچلی اور اوپری سطحوں کے تقابل سے ظاہر ہے یعنی /æ/، /a/، /ɔ/، /ū/ اور /i/ زوردار آوازیں ہیں اور /e/، /ə/، /o/، /u/ اور /I/ نسبتاً

کمزور آوازیں ہیں۔ دوسری خصوصیت گمبھیر/ تیکھی کا تضاد دائیں طرف اور بائیں طرف کے خانوں سے ظاہر ہے، یعنی /ɔ/، /o/، /u/اور /ū/ گمبھیر آوازیں ہیں اور /æ/، /e/، /I/ اور /i/ نسبتاً تیکھی آوازیں ہیں۔ /a/ اور /ə/ چونکہ گمبھیر اور تیکھی کے بین بین ہیں، ان کو مخمس کے بیچ کے خط سے ظاہر کیا گیا ہے۔ تیسری خصوصیت پیوست/ منتشر کا تضاد مخمس کے سب سے باہر والے نقطوں اور سب سے اندر والے نقطوں سے ظاہر کیا گیا ہے، یعنی /æ/، /e/، /o/ اور /ɔ/ پیوست آوازیں ہیں اور /i/، /I/، /u/ اور /ū/ نسبتاً منتشر آوازیں ہیں۔

شکل نمبر 3 کے بائیں طرف کے اعداد صوتی تواتر (Frequency) کو سائکل فی سیکنڈ کے حساب سے ظاہر کرتے ہیں۔ اوپری لکیر اوپر لکھے ہوئے مصوتے کے اوپری سمعیاتی خط کو بہ اعتبار صوتی تواتر ظاہر کرتی ہے؛ اور اسی طرح نچلی لکیر نچلے سمعیاتی خط کو۔ اس شکل کی مدد سے مصوتوں کی گمبھیر/تیکھی اور پیوست/منتشر خصوصیت نہایت آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر کے تجزیے میں اس سے مدد لی ہے۔

شکل نمبر 4 کے چارٹ میں انھیں سمعیاتی خطوط کے صوتی تواتر کو ابتدائی، درمیانی اور آخری تینوں حالتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں سوالیہ نشان ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک کے سمعیاتی مطالعے کی بنا پر اس آواز کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

شکل نمبر 5 میں بائیں ہاتھ کی عمودی لکیر مصوتوں کے پہلے سمعیاتی خط کو ظاہر کرتی ہے اور اوپر کی افقی لکیر دوسرے سمعیاتی خط کو۔ مثلاً /i/ کا پہلا سمعیاتی خط 225 اور دوسرا 2400 سائکل فی سیکنڈ پر بنتا ہے۔ چنانچہ گراف پر 225 اور 2400 کے اتصال پر /i/ کو لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح سمعیاتی خطوط کے اعداد کی مدد سے گراف پر تمام مصوتوں کے جتنے نقطے بنیں گے، ان سب کو آپس میں ترتیب وار جوڑنے سے مصوتوں کا چارٹ تیار ہوجاتا ہے۔ اس میں اور روایتی چارٹ میں فرق یہ ہے کہ اس چارٹ کی بنیاد سمعیاتی صوتیات کے مشینی سائنسی تجزیے پر ہے۔

شکل نمبر 6 مصوتوں کے سپکٹروگرام میں وقت کے محور (axis) پر حاصل شدہ ان کا زمانی وقفہ ظاہر کرتی ہے جو سیکنڈ کے سوویں حصے یعنی Centiseconds میں ہے۔ اس نقشے سے دوسری خصوصیت یعنی زوردار/ کمزور کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سے ایک اور اہم بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اردو کے طویل مصوتے، اردو کے خفیف مصوتوں سے درمیانی حالت میں عام طور پر تین گنا سے بھی زیادہ بڑے ہوتے ہیں، اور اردو کے زوردار مصوتے کمزور مصوتوں سے چار پانچ سینٹی سیکنڈ طویل پائے گئے ہیں۔

(تحریر وسکانسن 1965، طبع ارمغان مالک 1970)

شکل نمبر 1

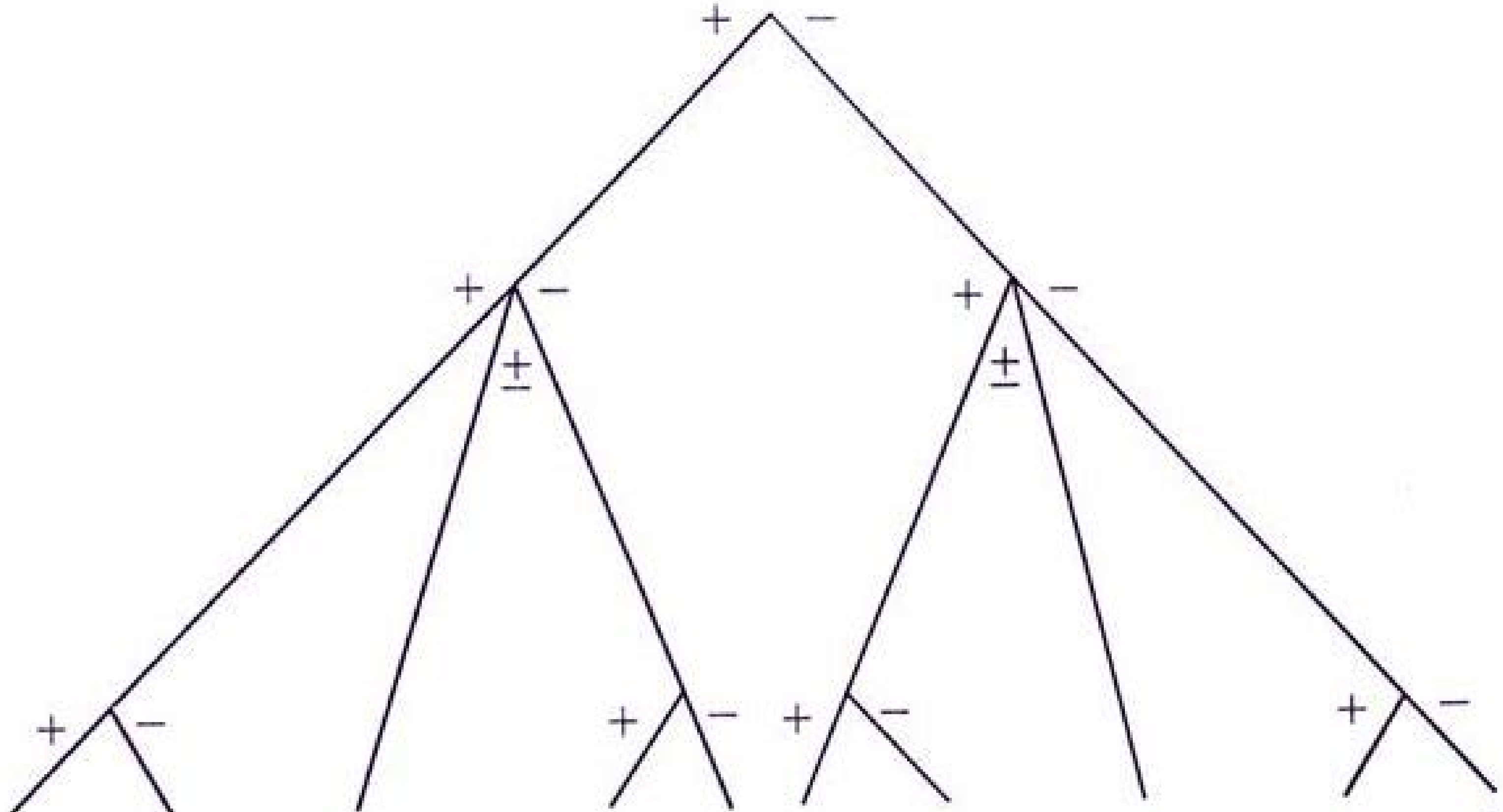

	ɔ	ū	a	æ	i	o	u	ɘ	e	I
Tense/ Lax	+	+	+	+	+	−	−	−	−	−
Grave/ Acute	+	+	±	−	−	+	+	±	−	−
Compact/ Diffuse	+	−	0	+	−	+	−	0	+	−

شکل نمبر 2

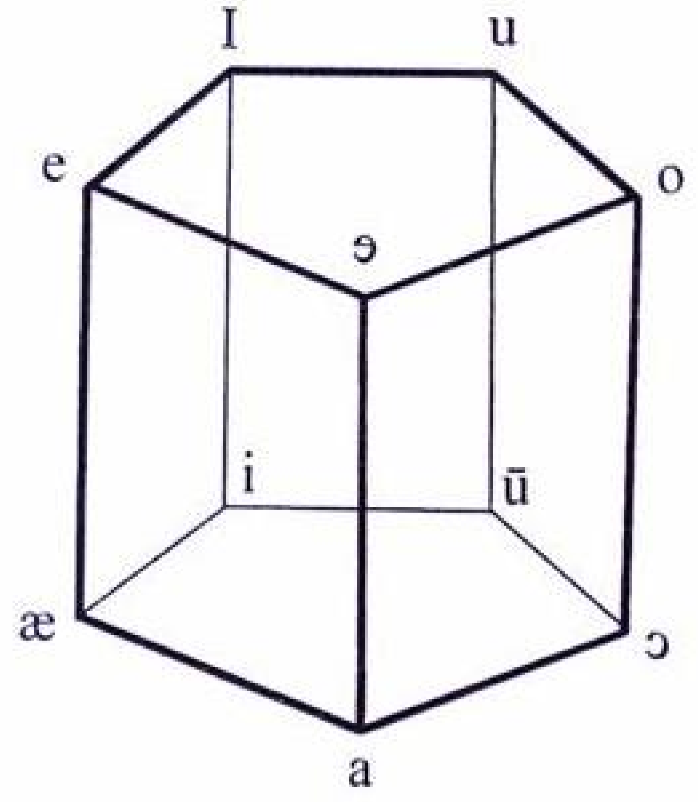

Tense/ Lax	: bottom/ top
Grave / acute	: right hand side/ left hand side
Compact/ Diffuse	: extreme outer points/ extreme inner points

شکل نمبر 3

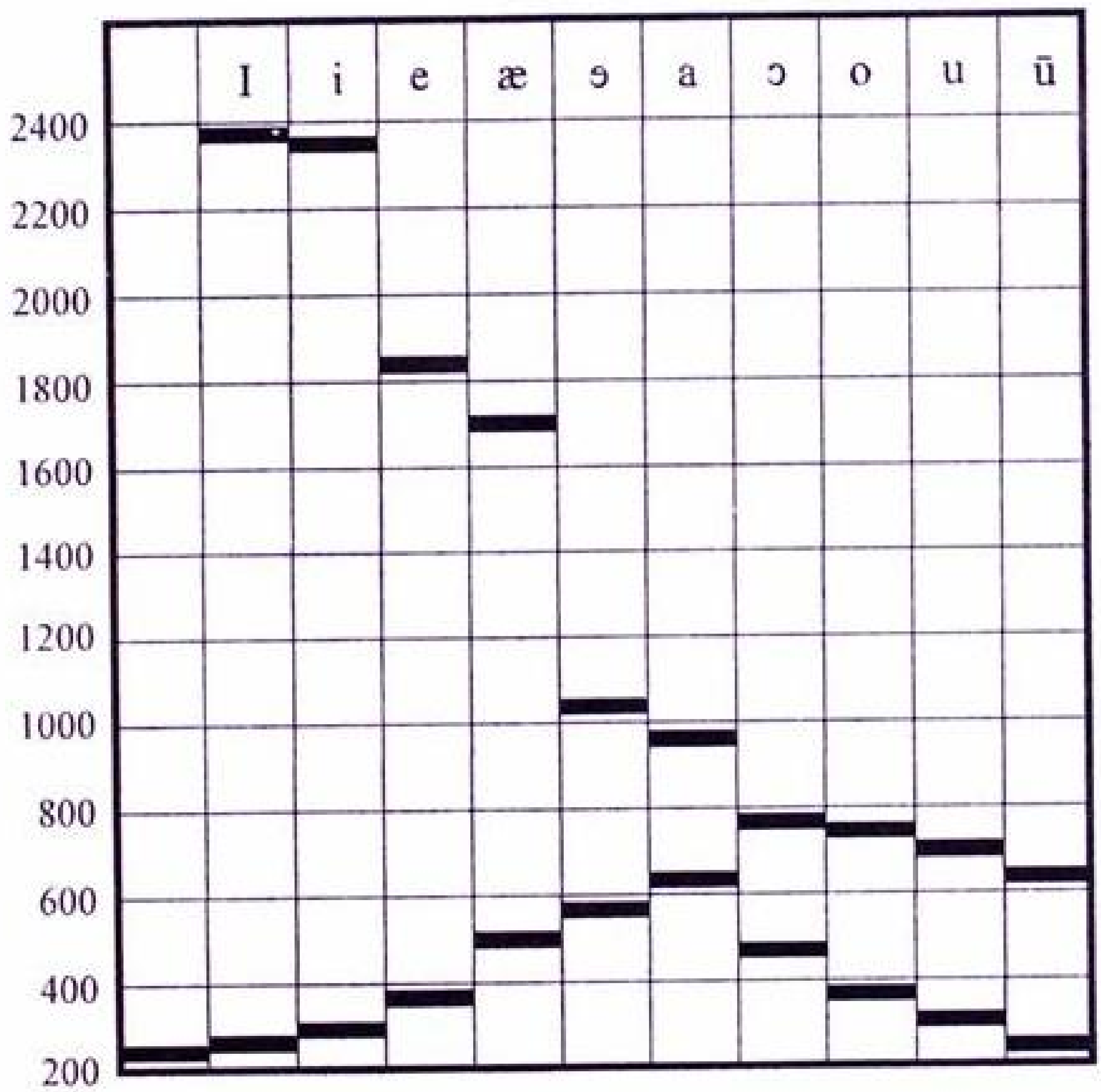
I
i
e
æ
ɘ
a
ɔ
o
u
ū
2400
2200
2000
1800
1600
1400
1200
1000
800
600
400
200

شکل نمبر 4

Formant Frequencies
صوتی تواتر (سائیکل فی سیکنڈ)

	medial درمیانی حالت		initial ابتدائی		final آخری	
	F1 پہلا سمعیاتی خط	F2 دوسرا سمعیاتی خط	F1 پہلا سمعیاتی خط	F2 دوسرا سمعیاتی خط	F1 پہلا سمعیاتی خط	F2 دوسرا سمعیاتی خط
i	225	2400	225	2400	250	2350
I	275	2375	250	2400		
e	400	1850	400	1825	400	1900
æ	500	1700	500	1700	500	1700
ə	550	1025	525	1050		
a	625	975	600	1000	625	975
ɔ	475	800	475	775	475	800
o	375	750	375	750	350	700
u	300	700	325	700		
ū	200	650	200	650	200	600

شکل نمبر 5

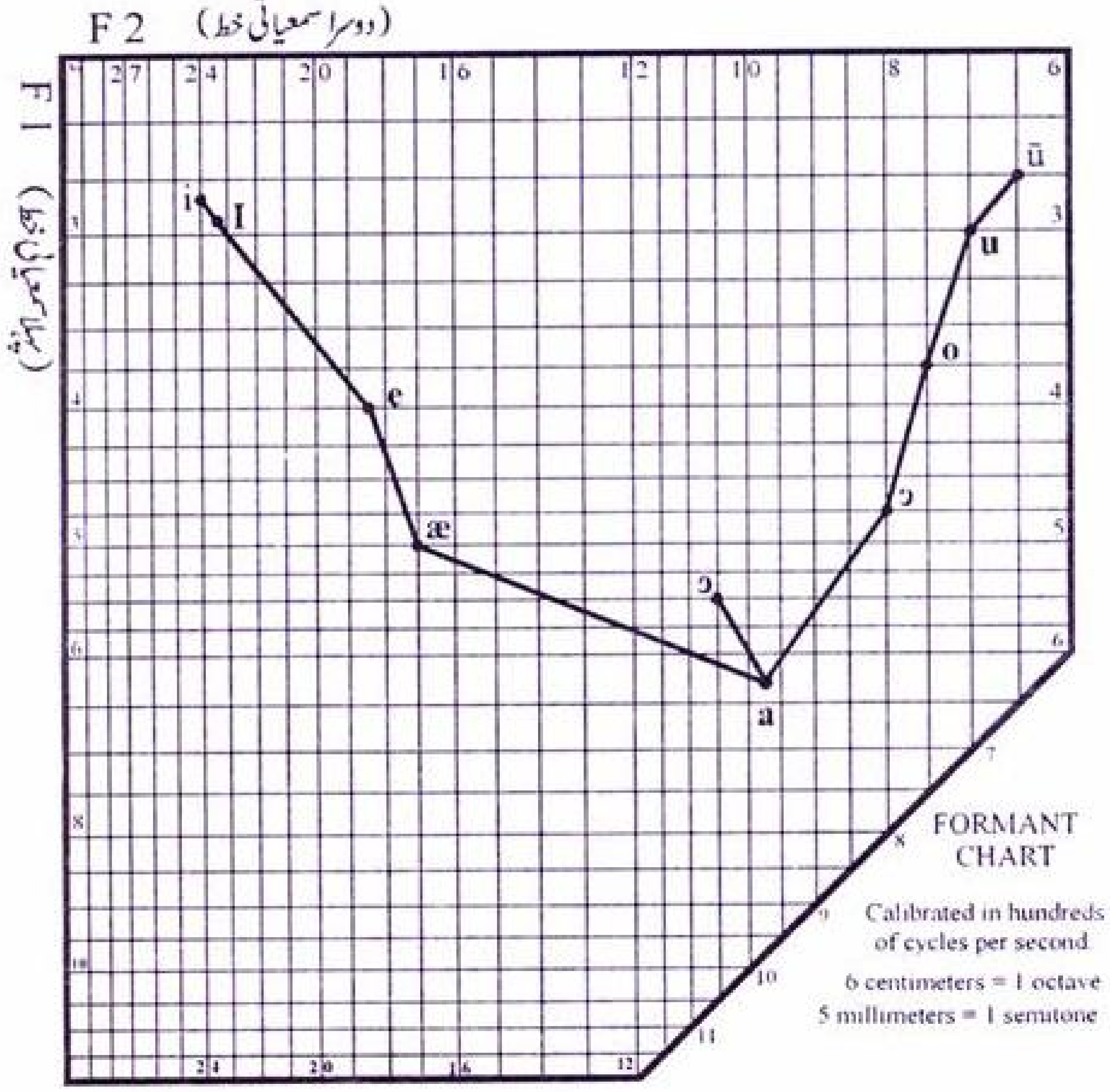
F 2
(دوسرا سمعیاتی خط)
F 1
FORMANT
CHART
Calibrated in hundreds
of cycles per second
6 centimeters = 1 octave
5 millimeters = 1 semitone

شکل نمبر 6

Duration

(in centiseconds)

زمانی وقفہ (سنٹی سیکنڈ میں)

	medial درمیانی حالت	initial ابتدائی	final آخری
i	34	34	40
I	12	15	
e	30	38	44
æ	34	42	45
ə	10	14	
a	34	38	40
ɔ	35	42	46
o	30	38	38
u	8	14	
ū	28	34	46

خفیف : طویل = 1 : 3 زوردار : کمزور = 5 : 4 سنٹی سیکنڈ

Trench, Trubner & Co.
—. 1966. A comparative dictionary of the Indo-Aryan languages. London: Oxford University Press.
Varmā, Rām Candra. 1958. Sankṣipt Hindī śabdsāgar. 6th ed. Benares: Nāgrīpracāriṇī Sabhā.
Vasiliu, Emanuel. 1966. Towards a generative phonology of Daco-Rumanian dialects. Journal of Linguistics 2.79–98.

Reprinted from GENERAL LINGUISTICS
Pennsylvania State
University Press, Univ. Park & London
Vol. 14, No. 3, (1974), 129-155.

—. 1971. Historical linguistics. A survey of linguistic science, ed. by William Orr Dingwall, 576-649. College Park: University of Maryland Linguistics Program.
Lass, Roger. 1971. Boundaries as obstruents: Old English voicing assimilation and universal strength hierarchies. Journal of Linguistics 7.15–30.
Mehrotra, Ramesh Chandra. 1964. Hindi phonemes. Indian Linguistics 25.234–46.
Narang, Gopi Chand, and Donald A. Becker. 1971. Aspiration and nasalization in the generative phonology of Hindi-Urdu. Language. 47.646–67.
Pandit, P.B. 1958. Old Gujarati pronunciation: A note on linguistic change. Vidya, Journal of the Gujarat University 1.1–9.
— 1963. Sanskritic clusters and caste dialects. Indian Linguistics 24.70–80.
Pathak, R. C. 1946. Bhargava's standard illustrated dictionary of the Hindi language. Hindi-English ed. Benares: Narendra Bhargava.
Platts, John T. 1930. A dictionary of Urdū, Classical Hindī, and English. 5th impression. London: Oxford University Press.
Postal, Paul M. 1968. Aspects of phonological theory. New York: Harper & Row.
Pray, Bruce R. 1970. Topics in Hindi-Urdu grammar. (Research monograph 1.) Berkeley: Center for South and Southeast Asia Studies, University of California.
Saporta, Sol. 1965. Ordered rules, dialect differences, and historical processes. Lg. 41.218–24.
Savel'eva, L. V. 1965. Jazyk gudžarati. Moscow: Izdatel'stovo «Nauka».
Shīrānī, Maẕhar M. (ed.) 1966. Maqālāt-e Ḥāfiẓ Mahmūd Shīrānī. Lahore: Majlise-e Taraqqī-e Adab.
Srivastava, R. N. 1969. Review of Studies in Hindi-Urdu, I, by A. R. Kelkar. Lg. 45.913–27.
Turner, Ralph Lilley. 1931. A comparative and etymological dictionary of the Nepali language. London: Kegan Paul,

Leipzig: VEB Verlag Enzyklopädie.
Hockett, Charles F. 1958. A course in modern linguistics. New York: Macmillan.
Hyman, Lary M. 1970. How concrete is phonology? Lg. 46.58–76.
Jain, Gain Chand. 1961a. Urdū kē cand kōzī tajṣautiyē. Hamārī Zabān 8/1.11–2.
—. 1961b. Urdū kē cand kōzī tajṣautiyē-2. Hamārī Zabān 8/15.7.
—. 1961c. Urdū kē cand kōzī tajṣautiyē-3. Hamārī Zabān 10/15.1–2, 11–2.
Kelkar, Ashok R. 1968. Studies in Hindi-Urdu, I: introduction and word phonology. (Building Centenary and Silver Jubilee series, 35.) Poona: Deccan College.
Kellogg, S. H. 1893. A grammar of the Hindi language. 2nd ed. London: Routledge & Kegan Paul.
Keyser, Samuel J. 1963. Review of The pronunciation of English in the Atlantic States, by Hans Kurath and Raven I. McDavid, Jr. Lg. 39.303–16.
Khan, Masud Husian, 1955. A phonetic & phonological study of the word in Urdu. (Deparment of Urdu Studies, 1.) Aligarh, India: Muslim University.
—. 1966. Muqaddamah-e tārīkh-e zabān-e Urdū. Karachi: Urdū Akademī.
King, Robert D. 1968. Root versus suffix accent in the Germanic present indicative. Journal of Linguistics 4.247–65.
— 1969. Historical linguistics and generative grammar. Englewood Cliffs, N.J.: Prentice-Hall.
Kiparsky, Paul. 1965. Phonological change. Cambridge, Mass.: MIT doctoral dissertation.
—. 1968a. Linguistic universals and linguistic change. Universals in linguistic theory, ed. by Emmon Bach and Robert T. Harms, 170-202. New York: Holt, Rinehart & Winston.
—. 1968b. How abstract is phonology? Mimeographed. Bloomington: Indiana University Linguistics Club.

REFERENCES

Abdullah, Sayyid (ed.) 1951. Nawādir ul-alfāẓ ma'a Gharā'ib ul-lughāt. Karachi: Anjuman Taraqqī-e Urdū.

Bach, Emmon. 1968. Two proposals concerning the simplicity metric in phonology. Glossa 2.128–49.

Bailey, T. Grahame. 1956. Teach yourself Urdu. London: English Universities Press.

Becker, Donald A. 1967. Generative phonology and dialect study: An investigation of three modern German dialects. Austin: University of Texas doctoral dissertation.

Bhatia, K. C. 1960, Hindī akṣar. Rājarṣi abhinandan granth, 547-73. New Delhi.

Bloomfield, Leonard. 1930 dʒṛmṇ ç ɛnd × Le maître phonétique 3.8.27–8.

Chatterji, Suniti Kumar. 1926. The origin and development of the Bengali language. Calcutta: Calcutta University Press.

Chaturvedi, Mahendra, and Bhola Nath Tiwari. 1970. A practical Hindi-English dictionary. Delhi: National Publishing House.

Chomsky, Noam, and Morris Halle. 1968. The sound pattern of English. New York: Harper & Row.

Dixit, R. Prakash. 1963. The segmental phonemes of contemporary Hindi. Austin: University of Texas master's thesis.

Elizarenkova, T. Ja. 1961. Differencial'nye élementy soglasnyx fonem xindi. Voprosy Jazykoznanija 1961:5.22–33.

Ferozsons' Urdu-English dictionary. n.d. Revised ed. Karachi: Ferozsons Ltd.

Grierson, George Abraham. 1916. Linguistic survey of India, vol. IX, part I. Calcutta: Office of the superintendent of government printing.

Halle, Morris. 1962. Phonology in generative grammar. Word 18.54–72.

Hälsig, Margot. 1967. Grammatischer Leitfaden des Hindi.

be maintained. Here the geographical area in which the speakers reside plays an important role. We have found the flap pronunciation to be predominant among speakers from the Eastern Hindi-speaking area as well as among speakers from the Braj region of Western Hindi. The dialect specimens presented in Grierson (1916), moreover, show the existence of the flap pronunciation in the Dāṇg dialects, Kanaujī, and Bundēlī as well.[32]

§5. Conclusion. We have undertaken the present study with two aims in mind. On the one hand, we have sought (in §§1–3) to contribute to the scholarly discussion surrounding the status of the retroflex flaps [ṛ] and [ṛʰ] in the phonology of Hindi-Urdu by reconsidering this perennial problem in the ordered-rule framework of generative grammar. We have argued in this connection that it is both possible and desirable to construct a phonology of Hindi-Urdu in which the retroflex flaps are completely absent at the level of systematic phonemics. On the other hand, we have tried (in §4) to illustrate the type of dialectological insight that can be gained from the generative approach by comparing the treatment accorded the retroflex flaps in two varieties of Hindi-Urdu. To the extent that the two varieties in question correspond at least loosely to the linguistic traditions known as 'Hindi' and 'Urdu', our study casts some light on an aspect of this linguistic dichotomy which could not be fully understood as long as linguists were content to describe phonology be means of item-and-arrangement models.

---

32. It is interesting to note that retroflex flaps also follow nasalized vowels in Bengali, Bhojpuri, Bihari, Maithili, and Nepali (cf. Chatterji 1926:365 and Turner 1966). In Gujarati, on the other hand, a dialect difference of the kind we have seen in Hindi-Urdu exists: While the standard language shows voiced retroflex stops after nasalized vowels, certain dialects show retroflex flaps in this position (P. B. Pandit: personal communication).

We submit that cases of rule reordering compatible with Kiparsky's principle constitute excellent evidence against Chomsky and Halle's supposition, for longer derivations (and hence more, not less 'computation') are an inevitable result of increasing rule efficiency and a recurrent consequence of increasing rule transparency.

Having considered the question of how the rule-order difference between Hindi-Urdu Varieties A and B may have come about, let us now turn our attention to the characterization of these two dialects in terms of the speakers who use them. Inspection of some widely available dictionaries suggests that the forms of speech which we have arbitrarily labeled 'A' and 'B' may be roughly conterminous with 'Urdu' and 'Hindi', respectively. Of the 60 doublets listed at the beginning of this section, all are represented in some form in *A dictionary of Urdū, Classical Hindī, and English* (Platts 1930), 29 in *Ferozsons' Urdu-English dictionary*, 41 in *A practical Hindi-English dictionary* (Chaturvedi & Tiwari 1970), 51 in *Sankṣipt hindī śabdsāgar* (Varma 1958), and 50 in *Bhargava's standard illustrated dictionary of the Hindi language* (Pathak 1946). 80% of the items cited by Platts and 97% of those found in Ferozsons' dictionary are given only with a retroflex stop or with a clear indication that the stop pronunciation is preferable to the flap pronunciation.[31] In the three Hindi dictionaries named, however, the situation is quite different. Here the flap pronunciation is the unique choice with regard to 61% of the words listed by Chaturvedi & Tiwari, 75% of those listed by Varma, and 78% of those listed by Pathak. The impression that speakers educated in Urdu prefer [ḍ] (or [ḍ^h]) to [ṛ] (or [ṛ^h]) in the environment 'after nasalized vowel' is confirmed by such scholars as Jain (1961a:12) and Khan (1966:148). That Hindi-educated speakers prefer [ṛ] (or [ṛ^h]) in this position with equal consistency cannot, however,

31. Platts expresses his disapproval of a particular pronunciation by labeling it 'dialectal', 'rustic', or 'vulgar' or by referring the dictionary user to another pronunciation.

It is interesting to note that while Kiparsky's principle is not challenged by Chomsky and Halle (1968), it is ignored by them when (on p. 63) they make the following statements:[30]

> The question of how an internalized grammar is used in performance (speech production or perception) is of course quite open. Nevertheless, it seems reasonable to suppose that the grammar should be selected in such a way as to minimize the amount of 'computation' that is necessary, and the 'length of derivation' is one factor in determining 'complexity of computation'. Naturally, this principle must be regarded as quite tentative. We will adhere to it where a choice arises, but we have very little evidence for or against it. To find empirical evidence bearing on a principle of this degree of abstractness is not an easy matter, but the issue is important, and one should bear it in mind in a detailed investigation of phonological structure.

If we examine the efficiency with which these three forms of Hindi-Urdu employ their shared rules, we find that while only two changes are effected in the sample derivations presented for Variety A-1, the number of changes rises to three in Variety A-2 and to four in Variety B. If we compare the transparency of the rules in the three varieties, we discover that while neither Rule 1 nor Rule 2 is transparent in A-1, Rule 2 is transparent in A-2 and both rules are transparent in B. In view of what we have said about Kiparsky's reordering principle, it is tempting to hypothesize that the order found in A-1 corresponds to the relative chronology in which Rules 1, 2, and 3 were originally acquired by all forms of Hindi-Urdu and that A-2 and B are the products of subsequent reorderings in the direction of greater efficiency or transparency. Owing, however, to the fact that the Devanagari script has no symbol for a postconsonantal shwa, it is very difficult to date precisely the historical sound change reflected in Rule 2. While that change apparently belongs to the New Indo-Aryan period (cf. Pandit 1963:75 and Turner 1931:xvii) and is therefore more recent than the change mirrored in Rule 1, we have been unable to find a clear indication of the relative age of Rules 2 and 3. The documentary evidence needed to confirm our hypothesis that Rule 2 antedates Rule 3 as a part of Hindi-Urdu phonology is therefore lacking.

30. In a footnote on p. 272, however, Chomsky and Halle explain a dialect difference with the aid of Kiparsky's reordering principle!

Hindi-Urdu Variety A-1:

	/āNgan – ōN/	/b^{h}ōNḍ + ā/
	↓	↓
Rule 1	--------	--------
	↓	↓
Rule 2	--------	--------
	↓	↓
Rule 3	ā̃gan + ōN	b^{h}ō̃ḍ + ā
	↓	↓
	⋮	⋮
	↓	↓
	[ā̃gənō̃]	[b^{h}ō̃ḍā]

Hindi-Urdu Variety A-2:

	/āNgan – ōN/	/b^{h}ōNḍ + ā/
	↓	↓
Rule 1	--------	--------
	↓	↓
Rule 3	ā̃gan + ōN	b^{h}ō̃ḍ + ā
	↓	↓
Rule 2	ā̃gn + ōN	--------
	↓	↓
	⋮	⋮
	↓	↓
	[ā̃gnō̃]	[b^{h}ō̃ḍā]

Hindi-Urdu Variety B:

	/āNgan – ōN/	/b^{h}ōNḍ + ā/
	↓	↓
Rule 3	ā̃gan + ōN	b^{h}ō̃ḍ + ā
	↓	↓
Rule 1	--------	b^{h}ō̃ṛ + ā
	↓	↓
Rule 2	ā̃gn + ōN	--------
	↓	↓
	⋮	⋮
	↓	↓
	[ā̃gnō̃]	[b^{h}ō̃ṛā]

of Hindi-Urdu Varieties A and B. If we compare the sample derivations presented above with an eye to the efficiency with which the two varieties employ Rules 1 and 3, we discover that the nonhistorical order found in Variety B is superior to the chronological order preserved in Variety A. If we examine the two varieties in terms of Kiparsky's concept of rule transparency, we find that Rule 1 is opaque in Variety A (since [pā̃ḍe], [k^{h}ā̃ḍ], and [b^{h}ō̃ḍā] contain retroflex stops in environments which match the structural description of Rule 1) but transparent in Variety B (since [pā̃ṛē], [k^{h}ā̃ṛ], and [b^{h}ō̃ṛā] no longer contain retroflex stops in these environments). Hence, regardless of which formulation of Kiparsky's principle is adopted, Variety B emerges as more highly valued than Variety A. A universal principle governing rule reordering thus provides an explanation for the development of the former out of the latter.[29]

---

29. While we are on the subject of rule order, it is interesting to examine how another rule, Rule 2, is ordered with respect to Rules 1 and 3. In §3.1 we saw that Rule 2 must apply after Rule 1. In our earlier article (Narang & Becker 1971:666n), however, we noted that Rules 2 and 3 are less rigid in their order of application, some speakers applying them in one order and some in the other. Hence one finds that the oblique plural of such nouns as [ā̃gən] 'courtyard' and [b^{h}ā̃jək] 'ropemaker' are pronounced [ā̃gənō̃], [b^{h}ā̃jəkō̃] by some speakers of Hindi-Urdu and [ā̃gnō̃], [b^{h}ā̃jkō̃] by others. Now since Rule 2 must always follow Rule 1 but may apply either before or after Rule 3, it follows that speakers of Variety B must apply the three rules in the order 3-1-2 but that speakers of Variety A may apply them in either one of two possible sequences: 1-2-3 or 1-3-2. We shall refer to that version of Variety A associated with the order 1-2-3 as Variety A-1 and to that version associated with the order 1-3-2 as Variety A-2. The following sample derivations demonstrate that the three different orders of applications of Rule 1, 2 and 3 yield distinct phonetic outputs: →

thus suggests that discrepancies in the order in which related dialects apply shared rules sometimes mirror differences in the relative chronology in which two or more historical sound changes reached the areas where the dialects in question are spoken. Appealing though Keyser's suggestion is, it obviously presupposes that the sound changes reflected in the differently ordered rules belong to the same historical period. Apparently, however, the historical sound change corresponding to our Rule 1 took place 'during the First M[iddle]I[ndo-]A[ryan] period [i.e. 600-200 B.C.], if not earlier' (Chatterji 1926:17 & 249), while that corresponding to Rule 3 was among the developments which 'ushered in the N[ew] I[ndo-]A[ryan] period [i.e. 1000 A.D.—]' (Chatterji 1926:17 & 259). Hence, a different explanation is needed from the one advanced by Keyser. Such an explanation can be found in the concept of rule reordering.

Kiparsky (1968a:196-200) asserts that rule reordering, i.e. the shifting of phonological rules out of one order of application into another, is a major form of linguistic change and that 'the direction of reordering is predicted by general principles which assign certain types of order a higher value than others'. One of these 'general principles' is formulated by Kiparsky (1968a:200) as follows: 'Rules tend to shift into the order which allows their fullest utilization in the grammar'. In a subsequent reformulation of this principle, Kiparsky (1971:621–3) exchanges the notion of rule efficiency for a concept of rule transparency and arrives at the following statement: 'Rules tend to be ordered so as to become maximally transparent'. Here transparency is to be understood as the opposite of opacity, a concept which Kiparsky explains as follows: 'A rule A → B/C—D is opaque to the extent that there are surface representations of the form (i) A in [the] environment C—D or (ii) B in [an] environment other than C—D'. The differences inherent in the two versions of Kiparsky's reordering principle need not concern us in this study, for the original formulation and the later revision have identical implications for the analysis

Hindi-Urdu Variety A:

	/pēḍ/	/sāNp/	/pāNḍē/	/k^hāNḍ/	/b^hōNḍ+ā/
Rule 1	pēṛ	----	-----	------	-------
Rule 3	---	sā̃p	pā̃ḍē	k^hā̃ḍ	b^hō̃ḍ+ā
	⋮	⋮	⋮	⋮	⋮
	[pēṛ]	[sā̃p]	[pā̃ḍē]	[k^hā̃ḍ]	[b^hō̃ḍā]

Hindi-Urdu Variety B:

	/pēḍ/	/sāNp/	/pāNḍē/	/k^hāNḍ/	/b^hōNḍ+ā/
Rule 3	---	sā̃p	pā̃ḍē	k^hā̃ḍ	b^hō̃ḍ+ā
Rule 1	pēṛ	----	pā̃ṛē	k^hā̃ṛ	b^hō̃ṛ+ā
	⋮	⋮	⋮	⋮	⋮
	[pēṛ]	[sā̃p]	[pā̃ḍē]	[k^hā̃ḍ]	[b^hō̃ḍā]

The derivations presented above serve to illustrate the dialectological insights that we can gain if, following Halle (1962:62), we 'focus [our attention] on the grammars of the dialects, i.e., on the ordered set of statements that describe the data, rather than on the data directly'. Before attempting to replace our provisional designations 'Variety A' and 'Variety B' with a more descriptive set of names, let us inquire how rule-order differences of the kind that distinguish these two forms of Hindi-Urdu come about.[28]

Addressing himself to the question, Keyser (1963:312) states that 'a specific ordering of a given set of rules may in certain cases reflect their acquisition through time'. He

28. Similar cases of dialect differentiation attributable to differences in rule order have been discussed by Keyser (1963), Kiparsky (1965 & 1968a), Saporta (1965), Vasiliu (1966), Becker (1967), and King (1968 & 1969).

$$\begin{vmatrix} +\text{consonantal} \\ -\text{grave} \\ +\text{diffuse} \\ +\text{flat} \\ +\text{voiced} \end{vmatrix} \rightarrow [-\text{obstruent}] / \begin{bmatrix} \text{V} \\ -\text{nasal} \end{bmatrix} - \begin{Bmatrix} \text{V} \\ + \end{Bmatrix}$$

I.e., /ḍ/ and /ḍʰ/ are realized as [ṛ] and [ṛʰ], respectively, when they are preceded within the same morpheme by an ORAL vowel and followed by a vowel or a morpheme boundary.

It is, however, quite unnecessary to complicate Rule 1 in this fashion. We have argued elsewhere (Narang & Becker 1971) that the nasalized vowels of Hindi-Urdu can be derived from underlying sequences of oral vowel plus nasal consonant by means of the following rule:

(3) (morpheme-level)

$$\underset{1}{\begin{bmatrix} +\text{syllabic} \\ +\text{tense} \end{bmatrix}} \underset{2}{[+\text{nasal}]} \underset{3}{\text{C}} \Rightarrow \underset{1}{[+\text{nasal}]} \underset{2}{\theta} 3$$

I.e., when within a morpheme a nasal consonant is preceded by a long vowel and followed by a consonant, the nasal is deleted with compensatory nasalization of the vowel.[26]

If this is true, the forms containing [ḍ] or [ḍʰ] after a nasalized vowel can be obtained simply by ordering Rule 1 before Rule 3 while those containing [ṛ] or [ṛʰ] can be derived by applying the two rules in the reverse order. The following sample derivations serve to illustrate this point:[27]

---

26. Short nasalized vowels are derived mainly from long vowels which have undergone this rule (cf. Narang & Becker 1971:663–5).

27. For the sake of comparison we include in these derivations [pēṛ] 'tree', a word containing a retroflex consonant but no nasalized vowel, and [sā̃p] 'snake', a word containing a nasalized vowel but no retroflex consonant.

[rē̃ḍ]/[rē̃ṛ] 'castor-oil plant'
[sā̃ḍ]/[sā̃ṛ] 'bull, steer'
[sā̃ḍā]/[sā̃ṛā] '(a species of sand lizard)'
[sā̃ḍni]/[sā̃ṛni] 'female camel'
[sū̃ḍ]/[sū̃ṛ] 'elephant's trunk'
[sū̃ḍā]/[sū̃ṛā] '(a small insect destructive to grain)'
[sū̃ḍi]/[sū̃ṛi] 'navel'
[sū̃ḍkā]/[sū̃ṛkā] 'camel's hump'
[ṭā̃ḍəw]/[ṭā̃ṛəw] 'frantic dance of the God Shiva'
[ṭā̃ḍ]/[ṭā̃ṛ] 'armlet'
[ṭā̃ḍā]/[ṭā̃ṛā] 'caravan'

The reader cannot have failed to notice that all of these forms share a striking characteristic: They all contain a nasalized vowel immediately before their alternating retroflex sounds. That this is no accident can be inferred from the fact that those of our informants who consistently pronounce the above words with a retroflex stop, as long as the nasalization of the preceding vowel is maintained, pronounce a retroflex flap when—in the case of individual items—the nasalization of the vowel has been idiosyncratically lost. Hence, one finds [bā̃ḍʰ]/[bā̃ṛʰ], [ḍʰū̃ḍʰnā]/[ḍʰū̃ṛʰnā], [mē̃ḍ]/[mē̃ṛ], [mē̃ḍʰā]/[mē̃ṛʰā], [mō̃ḍʰā]/[mō̃ṛʰā] and [mū̃ḍ]/[mū̃ṛ] rendered sometimes as [bāṛʰ], [ḍʰūṛʰnā], [mēṛ], [mēṛʰā], [mōṛʰā], and [mūṛ], but never as *[bāḍʰ], *[ḍʰūḍʰnā], *[mēḍ], *[mēḍʰā], *[mōḍʰā], and *[mūḍ]. In what way, however, is the existence of the doublets listed above related to the nasalization of the preceding vowel?

Two explanations come to mind. On the one hand, it is possible that the discrepancy between the phonologies of those who say [pā̃ḍē], [kʰā̃ḍ], [bhō̃ḍā] and those who say [pā̃ṛē], [kʰā̃ṛ], [bʰō̃ṛā] reflects a difference in the form in which the speakers in question have acquired Rule 1. While the forms containing [ṛ], are compatible with Rule 1 as formulated in §2, those containing [ḍ] might be interpreted as the output of the following variant of Rule 1:

(1″) (morpheme-level)

[gɔ̃ḍā]/[gɔ̃ṛā] 'alms distributed among beggars upon the arrival of a marriage procession at the village of the bride'
[hā̃ḍī]/[hā̃ṛī] 'earthen pot for cooking'
[hā̃ḍnā]/[hā̃ṛnā] 'to wander aimlessly'
[kā̃ḍī]/[kā̃ṛī] 'rafter, beam'
[kā̃ḍnā]/[kā̃ṛnā] 'to trample'
[k^{h}ā̃ḍ]/[k^{h}ā̃ṛ] 'coarse sugar'
[k^{h}ā̃ḍā]/[k^{h}ā̃ṛā] 'straight double-edged sword'
[kū̃ḍā]/[kū̃ṛā] 'tub, trough'
[lā̃ḍ]/[lā̃ṛ] 'penis'
[lē̃ḍ]/[lē̃ṛ] 'hard excrement'
[lɔ̃ḍā]/[lɔ̃ṛā] 'boy'
[lɔ̃ḍī]/[lɔ̃ṛī] 'girl' [25]
[mā̃ḍī]/[mā̃ṛī] 'starch, paste'
[mā̃ḍnā]/[mā̃ṛnā] 'to rub, besmear'
[mē̃ḍ]/[mē̃ṛ] 'limitary dike'
[mē̃ḍ^{h}ā]/[mē̃ṛ^{h}ā] 'ram'
[mō̃ḍ^{h}ā]/[mō̃ṛ^{h}ā] 'stool made of reeds or cane'
[mū̃ḍ]/[mū̃ṛ] 'head'
[mū̃ḍnā] [mū̃ṛnā] 'to shave'
[ō̃ḍā] [ō̃ṛā] (~[ɔ̃ḍā]/[ɔ̃ṛā]) 'deep'
[pā̃ḍē] [pā̃ṛē] 'learned man, (subcaste of Brahmans)'
[pǣ̃ḍ] [pǣ̃ṛ] 'path, way'
[pɔ̃ḍā]/[pɔ̃ṛā] '(a variety of sugarcane)'
[rā̃ḍ]/[rā̃ṛ] 'widow'
[rā̃ḍkā]/[rā̃ṛkā] 'blockhead'

---

25. To illustrate his claim that 'there is a good deal of vacillation in assigning a lexical item to V^{n}ḍV or V^{n}ṛV', Kelkar (1968:41-2) points to idiolects in which both pronunciations of these two lexical items exist side by side. The idiolects in question are said to use the forms [lɛ̃ḍā] and [lɛ̃ḍī] both in the general sense of 'boy' and 'girl' and in the specialized sense of 'boy partner in paederasty' and 'female slave'; [lɔ̃ṛā] and [lɔ̃ṛī], on the other hand, are associated only with the latter, pejorative meanings. While we do not deny that dialect interaction may occasionally give rise to such contrasts within a given idiolect, we question whether they are as common as Kelkar's initial statement would lead one to believe.

of [ṛ] and [r] in some of these words. We therefore reject it in favour of the previous alternative and assume that the underlying representations of the two suffixes are /r+ā/ and /r+ī/.

§4. Doublets containing nasalized vowels. In the preceding paragraphs we have attempted to justify the inclusion of Rule 1 in the generative phonology of Hindi-Urdu. Thus far, however, we have overlooked an important set of words which occur in two distinct forms. In the speech of some speakers of Hindi-Urdu, these words always contain a voiced retroflex stop; in the speech of others they consistently have a voiced retroflex flap. A partial list of these forms is presented below:

[ā̃ḍ]/[ā̃ṛ] 'egg testicle'
[æ̃ḍ]/[æ̃ṛ] 'worthless'
[bā̃ḍā]/[bā̃ṛā] 'an animal whose tail has been cut off'
[bā̃ḍʰ]/[bā̃ṛh] 'fence'
[bā̃ḍī]/[bā̃ṛī] 'small stick'
[bē̃ḍā]/[bē̃ṛā] 'crooked, oblique'
[bʰā̃ḍ]/[bʰā̃ṛ] 'jester'
[bʰā̃ḍā]/[bʰā̃ṛā] 'pot, utensil'
[bʰō̃ḍā]/[bʰō̃ṛā] 'ugly'
[bī̃ḍ]/[bī̃ṛ] 'heap, bundle of reeds or grass'
[bō̃ḍnā]/[bō̃ṛnā] 'to entwine'
[cʰā̃ḍnā]/[cʰā̃ṛnā] 'to vomit'
[ḍā̃ḍ]/[ḍā̃ṛ] 'oar'
[ḍā̃ḍī]/[ḍā̃ṛī] 'beam of a pair of scales'
[ḍā̃ḍnā]/[ḍā̃ṛnā] 'to punish'
[ḍʰō̃ḍī]/[ḍʰō̃ṛī] (~ [ḍʰū̃ḍī]) 'pod'
[ḍʰū̃ḍʰnā]/[ḍʰū̃ṛʰnā] 'to search'
[gā̃ḍ]/[gā̃ṛ] 'anus'
[gā̃ḍā]/[gā̃ṛā] 'sugarcane'
[gā̃ḍīw]/[gā̃ṛīw] 'bow, bow of Arjuna'
[gā̃ḍū]/[gā̃ṛū] 'sodomite, coward' (< [gā̃ḍ]/[gā̃ṛ])
[gē̃ḍā]/[gē̃ṛā] (<[gæ̃ḍā]/[gæ̃ṛā] 'rhinoceros'
[gō̃ḍ]/[gō̃ṛ] '(a tribe in Central India)'
[gō̃ḍā]/[gō̃ṛā] 'cattle pen'

[pəgṛī] '(little) turban'	[pāg] 'turban'
[pəgṛī] '(small) bedstead'	[peleŋg] 'bedstead'
[peŋkʰṛī] 'petal'	[pəŋkʰ] 'feather, wing, blade'
[ṭə̃gṛī] 'short leg'	[ṭā̃g] 'leg'

The occurrence of a morpheme-initial [ṛ] in these suffixes raises once again the question whether our Rule 1 is properly formulated. There are, however, at least two ways of deriving the retroflex flap of these suffixes that necessitate no change either in rule 1 or in our basic contention that no retroflex flaps need be posited in the lexicon of Hindi-Urdu. On the one hand, one can assume that the [ṛ] of the suffixes [ṛ|ā] and [ṛ|ī] represents a systematic-phonemic /ḍ/ but that the underlying forms of these suffixes begin with a lax /a/ which is deleted by Rule 2 after the application of rule 1. The major weakness of this solution is that the postulated vowel is not realized phonetically in words like [ləŋgṛā], [pələŋgṛī], and [pəŋkʰṛī] where the application of Rule 2 should be blocked by the presence of a consonant cluster ([ŋg] or [ŋkʰ]) immediately before the affected vowel (cf. Narang & Becker 1971:648). A more satisfactory explanation is that the retroflex flap of the two suffixes is derived from a segment other than /ḍ/ by means of a special rule operating in the environment '+–+'. Lest this rule involve too many features, the segment chosen as the source of [ṛ] should be very similar to the latter phonetically. An ideal segment would be the dental flap /r/. Support for this choice is provided by the fact that some of the derived forms listed above (viz. [ə̃kʰṛī], [cəmṛā], [kʰōpṛī], [pəŋkhṛī] and [ṭə̃gṛī] are pronounced by some speakers with dental rather than retroflex flaps. For such speakers the words in question could be marked as simple exceptions to the rule converting /r/ into [ṛ].

A third solution involves deriving [ṛ|ā] and [ṛ|ī] from /ḍ+ā/ and /ḍ+ī/ and expanding the structural description of Rule 1 to include the environment '+–+'. While this alternative would be somehwat less costly than the last one mentioned, it would fail to shed any light on the alternation

a degemination rule is a high price to pay in accounting for a few exceptional forms, we would argue that the rule simplifying final geminates by no means applies only to the forms under consideration here. Final degemination is common, for example, in such Arabic loanwords as [hədd] 'boundary, limit' and [rədd] 'returning, rejection'.[23] It is tempting, moreover, to suppose that the same rule, coupled with a rule of compensatory lengthening, is responsible for the alternation of geminate and single consonants observed in [nikəmmā] 'worthless' vs. [kām] 'work' and [hətt^{h}ā] 'handle' vs. [hāt^h] 'hand'.[24] However, a third pair—[həḍḍī] 'bone' vs. [hāṛ] 'bone'—suggests that the simplification of geminates with compensatory lengthening of a preceding vowel is accomplished by a separate rule which applies before, not after Rule 1.

§3.5. Morpheme-initial [ṛ]. In §3.1 we examined several words ending in [ṛ] plus the gender-case-number morphemes [ā] and [ī]. Since the portion of those words preceding their final CV-sequences never occurs alone, there is no reason to posit a morpheme boundary before [ṛ]. In many other words, however, final [ṛ | ā] and [ṛ | ī] are clearly (bimorphemic) derivational suffixes. Some of these words together with the forms from which they are derived are presented below:

Derived forms	Forms from which derived
[ə̃khrī] '(little) eye'	[ā̃k^h] 'eye'
[cəmṛā] 'skin, hide'	[cām] 'leather'
[dəmṛī] '(an obsolete coin)'	[dām] 'price, value'
[k^{h}ōpṛī] 'skull'	[k^{h}ōpā] 'coconut kernel'
[ləŋgṛā] 'lame'	[ləŋg] 'lameness'
[muk^{h}ṛā] '(little) mouth, face'	[muk^h] 'mouth, face'

23. See Khan (1955:29) for some discussion of these forms.

24. These words are examined by Pray (1970:111).

few other linguists in the 1950's would have accepted. Pandit (1958:7-8), for example, regards a similar contrast of [ḍ] (<MIA [ḍḍ]) and [ṛ] (<MIA [ḍ]) in certain dialects of Modern Gujarati as evidence for the existence of a phonemic distinction which is absent in Standard Gujarati.[22] Aware of the unorthodox nature of his solution, Khan tries to increase its acceptability by asserting that the [ḍ] which he analyzes as a phonemic geminate /ḍḍ/ is pronounced 'more emphatically' than other voiced retroflex stops and by noting that it is usually doubled in the Devanagari orthography of Hindi.

As generative phonologists proposing essentialy the same analysis, we are on firmer ground than taxonomic phonemicist Khan. Since in generative grammar considerations of simplicity take precedence over potential phonetic contrasts, it is safe to say that no generative phonologist would be prepared to postulate a costly underlying distinction between /ḍ/ and /ṛ/ solely on the basis of the small number of forms presented above. A difference of opinion would arise among generative phonologists only with regard to the manner in which the final postvocalic [ḍ] of [gəḍ], [kʰəḍ], and [ujəḍ] is prevented from undergoing Rule 1. Some would insist that deriving such forms from underlying representations containing geminate retroflex stops is a dubious 'trick' and that the only legitimate way of accounting for these words would be to provide them with a special rule feature <–Rule 1> (cf. Kiparsky 1968b). In response to such criticism, we would point out that the use of rule-exception features can lead, as demonstrated by Hyman (1970), to some rather implausible analyses. In reply to the objection that the postulation of

---

22. Similarly, Hockett (1958:449-50 & 466-7) assigns [ĝ] and [ɣ̂] to separate phonemes in Alfredian Old English even though they contrast only in words such as [eĝ] 'edge' and [dǣɣ̂] 'day' where [ĝ] represents an earlier word-final geminate [ĝĝ] and [ɣ̂] represents an ealier single [ĝ].

charmer', [seḍʰōrā] 'seven types of food that are sent by the bride's parents on the occasion of the seventh month of her first pregnancy', and [kəḍʰərā] 'carder (by caste or occupation)'.

In the phonologies of many speakers of Hindi-Urdu, words of the kind just cited are either absent or pronounced in such a way as to make Kelkar's dissimilation rule unnecessary. Competing with the pronunciations discussed above, one finds, for example, the variants [gəṛəriyā], [gāṛər], [gāṛərū], ~ [gārəṛū] ~ [gāṛəṛū], [sədʰōṛā] ~ [sədʰōrā], and [kəṇḍērā]. Since, however, forms like [sədʰōrā] and [kədʰērā] have served authors such as Jain (1961b:7) as proof of the nonpredictability of the Hindi-Urdu retroflex flaps, we have included them in our discussion of apparent exceptions to Rule 1.

§3.4 Word-final [ḍ]. The lexicon of Hindi-Urdu contains a handful of words which may end in either a geminate [ḍḍ] or a single [ḍ]. We are referring to the following words: [gəḍḍ] ~ [gəḍ] 'heap, mass' (> the reduplicated forms [gəḍḍ|bəḍḍ] ~ [gəḍ|bəḍ] and [gəḍḍ|məḍḍ] ~ [gəḍ|məḍ] 'jumbled mass, confusion'), [kʰəḍḍ] ~ [kʰəḍ] 'deep pit', and [ujəḍḍ] ~ [ujəḍ] 'boorish'.[21] The first pronunciation cited for each of these is entirely in keeping with Rule 1, since geminate stops are not subject to the structural change of this rule. the pronunciation with final postvocalic [ḍ], on the other hand, requires some further explanation. We suggest that the phonologies of those speakers who use this pronunciation contain a special rule which, applying after Rule 1, simplifies word-final [ḍḍ] to [ḍ].

In making this suggestion, we are following the lead of Khan (1955:21), a taxonomic phonemicist who seems to have been willing to advocate a degree of abstractness that

21. A very short shwa is sometimes perceived after the final geminate [ḍḍ] of the first pronunciation cited for each of these words. We assume that this vowel, when present, is supplied by a late rule operating in word-final position after certain consonant clusters.

[sõṭʰ ḍāl]	[sõḍḍāl]	'put in ginger'
[ḍāk gʰər]	[ḍāggʰər]	'post office'
[sōc jāõ]	[sõjjāõ]	'think over'
[kucʰ cīzẽ]	[kuccīzẽ]	'some things'
[kəp binā]	[kəbbinā]	'without a cup'

As the first two examples indicate, the output of these rules may once again be a morpheme-final [ḍ]. Since voicing assimilation applies after Rule 1, however, the occurrence of such a stop is entirely compatible with the analysis of the voiced retroflex sounds proposed in §2.

§3.3. [ḍ] and [ḍʰ] in morpheme-internal VCV-sequences. Some occurrences of voiced retroflex stops which are rather puzzling when viewed solely in the context of Hindi-Urdu are illuminated somewhat when compared with analogous occurrences of [ḍ] in the Gujarati language. In Gujarati [ṛ] and [ḍ] alternate in such forms as [uṛi] '(she) flew' vs. [uḍaṛ] 'cause to fly', [uḍəṇ] 'one which flies' and [pəṛ] 'membrane' vs. [pəḍəḷ] 'film covering the eye, eyelid'. The rule responsible for this alternation states that [ṛ], which as in Hindi-Urdu represents an underlying /ḍ/, is changed back into a stop when followed by a vowel plus [ṛ], [ṇ], [ḷ], or [r].[20] In addition to accounting for the alternation of [ṛ] and [ḍ] in the forms just cited, this rule also explains the presence of a stop rather than a flap in nonalternating forms like Guj. [gaḍər] 'sheep'. Although there do not seem to be any Hindi-Urdu morphemes in which [ḍ] and [ṛ] alternate under the same conditions as in Gujarati, Kelkar (1968:39-40) invokes a similar, though less general dissimilation rule to account for the intervocalic retroflex stop of Hindi-Urdu [gəḍə-riyā] 'shepherd (by caste or occupation)'. As formulated by Kelkar, this rule states that a 'retroflex flap never occurs if [r] follows with or without an intervening vocoid sequence'. Additional words to which the rule applies include [gāḍər] 'sheep', [gāḍərū] 'snake

20. We are grateful to P.B. Pandit for calling our attention to the situation in Gujarati. For a more complete statement of the distribution of Guj. [ḍ] and [ṛ], see Savel'eva (1965:12).

[šəṭ | šāstrī] 'well-versed in all six schools of Indian philosophy'	[šəḍ | ripu] 'the six flaws of humanity or human nature'

Returning now to the form [muḍ | bʰəṛ], one might hypothesize that the morpheme-final [ḍ] which closes its first syllable has the same derivational history as the [ḍ] in the second column of /šəṭ/-compounds. The [ḍ] of [muḍ | bʰēṛ] alternates, however, not with [ṭ], but rather with [ṭh]: The word is a transparent compound of [muṭʰ] 'fist' and the root of the verb [bʰiṛnā] 'to collide'. There is thus a need for a rule that deaspirates the initial member of certain consonant clusters. Independent motivation for such a rule is provided by compounds like [kšut | pipāsā] 'hunger and thirst' (=[kšudʰ] 'hunger' + [pipāsā] 'thirst'; cf. Hälsig 1967:31). With the postulation of this rule, the [ḍ] of [muḍ | bʰēṛ] may be derived from an underlying /ṭʰ/ and the problem posed by its occurrence in morpheme-final position is solved.

It is no accident that all of the forms cited in this section to illustrate the rules of voicing assimilation and deaspiration have been Sanskrit compounds. We have chosen, such examples because the Sanskritic element is the only part of the Hindi-Urdu lexicon to which these two rules always apply (cf. Kellogg 1893:28). Other compounds, including [muḍ | bʰēṛ], undergo these rules only optionally. Hence, competing with the pronunciation cited by Jain, one finds a 'more careful' pronunciation [muṭʰ | bʰēṛ]. Additional Hindi-Urdu compounds in which the optional application of the voicing-assimilation rule can create morpheme-final voiced retroflex stops are [uḍʰ | eŋg | ən] (~[uṭʰ | əŋg | ən]) 'prop, wedge' and [uḍʰ | bæṭʰ] (~[uṭʰ | bæṭʰ]) 'rising up and sitting down, restlessness'. Dixit (1963:101-2), moreover, has shown that the same rules that we have seen in operation within compounds can, in rapid speech, apply across external word boundaries as well. Some of Dixit's examples are presented below:

NORMAL STYLE	RAPID STYLE	GLOSS
[kāṭ ḍālā]	[kāḍḍālā]	'cut off'

[dik] 'space' + [əmbər] 'clothes'
= [digəmbər] 'clad in space, naked'
[wāk] 'speech' + [ərtʰ] 'meaning'
= [wāgərtʰ] 'speech and meaning'
[wāk] 'speech' + [dəršen] 'view'
= [wagdəršən] 'philosophy of speech'
[jəgət] 'universe' + [īš] 'god'
= [jəgdīš] 'lord of the universe'[19]
[sət] 'good' + [iccʰā] 'wish'
= [sədiccʰā] 'good wish'
[set] 'good' + [guṇ] 'quality'
= [sədguṇ] 'virtuous'
[əp] 'water' + [jə] 'born'
= [əbjə] 'born in water, lotus'

To account for the changes illustrated here, an observationally adequate phonology of Hindi-Urdu will require a regressive assimilation rule that voices the final stop of one constituent of a compound when the initial segment of the next constituent is voiced. To the extent that this rule affects retroflex stops as well as those with other points of articulation its position in the ordered set of phonological rules is very important: Applied before Rule 1 the assimilation rule would lead to an alternation of [ṭ] and [ṛ]; applied after Rule 1 it would result in an alternation of [ṭ] and [ḍ]. The following derivatives of /šəṭ/ 'six' indicate that the latter ordering is the correct one:

[šəṭ|kōṇ] 'hexagon'	[šəḍ|bʰuj] 'hexagon'
[šəṭ|pəd] 'sex-legged'	[šəḍ|ānən] 'six-faced'
[šəṭ|kəṇd] 'having six parts'	[šəḍ|eŋg] 'the six main parts of the body'
[šəṭ|kərṇ] 'heard by six ears'	[šəḍ|ritu] 'the six seasons of the year'
[šəṭ|cekr] 'the six chakras according to hathayoga'	[šəḍ|rāg] 'the six main strains of Indian music'

19. The loss of the second shwa in the first element of this compound results from the application of Rule 2.

vowels plus nasal consonat.[8] Rules nasalizing the underlying oral vowels before nasal consonants and deleting the nasal consonants would be ordered after P1, so that words like [ā̃gənō̃] and [jʰē̃gəṛō̃] would be derived approximately as follows:

Underlying forms	/āngan+ōn/	/jʰēgaṛ+ōn
	↓	↓
P1	—	—
	↓	↓
Nasalization rules	[ā̃gan+ō̃]	[jʰē̃gaṛ+ō̃]
	↓	↓
Rule converting [a] to [ə]	[ā̃gən+ō̃]	[jʰē̃gəṛ+ō̃]

In the remainder of this study we shall investigate the phenomenon of nasalization in some detail, and we shall present additional arguments for treating the nasalized vowels as underlying oral vowels plus nasal consonant.

4. At the level of systematic phonetics, Hindi-Urdu possesses five nasal consonants [m n ṇ ɲ ŋ], plus nasalized vowels corresponding to each oral vowel. It is clear that the lexicon of the language would be extremely costly to describe if the inventory of systematic phonemes were equally large. Each vowel segment in the lexicon would have to contain a distinctive specification of plus or minus for the feature [nasal], and the nasal consonants would have to be distinctively specified for features whose values could be left blank in a less extensive phonemic system. A number of generalizations can be made, however, about the distribution of the nasal consonants and vowels at the level of systematic phonetics. As we shall demonstrate in this section, these generalizations enable us to predict the nasality value for vowels and, to a large degree, the point of articulation for the nasal consonants. Some of these generalizations are listed below :

---

8 This practice would be entirely consistent with all previous work in generative phonology; cf. Harms (1968:36): 'In the systematic phonemic analyses of languages with nasal vowels (such as French, Igbo), the interpretation of these as vowel plus nasal consonant has consistently proved superior to the unit nasal vowel solution.'

a cluster analysis based solely on considerations of lexical economy. The real question is, after all, not whether a more economical lexicon can be achieved by means of the cluster solution, but rather whether it should be. We have no reason to believe that it should

As indicated in our introductory remarks, P1 affords a certain insight not only into the nature of aspiration in Hindi-Urdu, but into the nature of nasalization as well. Consider, for example, what happens when the oblique plural ending [ō̃] is added to such nouns as [ā̃gən] 'courtyard', [jʰā̃jʰər] 'anklet', [jʰē̃gəṛ] 'cricket', [bʰā̃jək] 'ropemaker', and [sā̃bʰər] 'refreshments for a journey'. Most native speakers of Hindi-Urdu consistently pronounce these oblique plurals—in apparent contradiction to P1—with shwa intact. Now, one might argue that P1 is too general, in the same way that the rejected Rule 1e was too general, and that it must be restricted in its operation. This could be done simply by adding an extra feature specification to the first segment of its structural description. The resulting rule (P1′) is presented below :

$$(\text{P1}')\begin{bmatrix}+\text{syllabic}\\+\text{compact}\\-\text{tense}\end{bmatrix}\rightarrow\emptyset/\begin{bmatrix}\text{V}\\-\text{nasal}\end{bmatrix}\text{C}\;—\;\text{C}+\text{V}$$

I.e., a lax low vowel is deleted from a word in which it is preceded by the sequence 'oral vowel plus consonant' and followed by the sequence 'consonant plus vowel', provided that a morpheme boundary (+) intervenes between the latter two segments.

P1′ would account accurately for the retention of shwa in such oblique plural forms as [ā̃gənō̃], [jʰā̃jʰərō̃], [jʰē̃gəṛō̃], [bʰā̃jəkō̃] and [sā̃bʰərō̃]. It is, however, quite unnecessary to complicate P1 in this manner. On the contrary, P1 requires no complication whatever, if we interpret systematic-phonetic nasalized vowels not as the realizations of underlying nasalized vowels, but as the realizations of underlying oral

Note that this conclusion is supported by the operation of the Hindi-Urdu rules of stress placement. While we are not prepared at this time to present a detailed account of these rules, there can be little doubt that the position of stress in a Hindi-Urdu word is determined largely by the syllable structure of that word.[7] In light of this fact, it is very significant that words such as [əd^{h}ik] 'more' and [kid^{h}ər] 'where, whither' are stressed like all other words of the form C_0V̆CV̆C (cf. [nəˈzər] 'sight', [əˈləg] 'separate') on their second syllable, and not like words of the form C_0V̆CCV̆C (cf. [ˈbilkul] 'quite', [ˈbəndər] 'monkey') on their first.

The fact that the aspirated consonants of Hindi-Urdu function as units with regard to a few phonological rules is in itself not sufficient evidence to justify treating them as units at the level of systematic phonemics. It is, for example, conceivable that there are other rules of the phonology which treat the aspirates as clusters and, in addition, have to be ordered before both P1 and the rules of stress assignment. In the absence of such rules, however, we can see no justification for disallowing the unit phoneme analysis. Harms' claim (1966:603-4) that the aspirated stops of Bengali should be treated as underlying clusters in order to simplify the lexicon seems to us to be rather empty. In Harms' own words (1968:8) : 'The way in which we count symbols in the phonology (or grammar) should reward those descriptions which are more reasonable hypotheses about the phonological (or grammatical) processes of the languages, and penalize those descriptions which are less reasonable.' To us, there is nothing intrinsically more reasonable about an analysis which regards the aspirates as systematic-phonemic clusters than about an analysis which treats them as systematic-phonemic units. Hence, even if the frequency figures which Harms cites for the aspirated stops of Bengali were identical for those of Hindi-Urdu, we would still reject

7 For some discussion of the relation of syllable structure to stress placment, see Masud Husain (n.d., 31-6).

brought to bear on this classical problem with varying results. Arguing from the standpoint of acoustic phonetics, Srivastava 1968 has recently re-affirmed the 'traditional' analysis of Indian grammarians, according to which the aspirates comprise single units. Working in the framework of generative phonology, however, Harms (1966:603) has argued (with reference to Bengali) that the predominance of unaspirated consonants in the lexicon would make the cluster interpretation more economical and hence better. P1 now gives us an additional criterion by which to judge the relative merits of these conflicting positions: we may check to see how the consonants in question function with respect to P1. All we need do is take some stems which end in a sequence of the form $VC^h{}_ə C$ or $VC_ə C^h$ and see what happens when they stand before suffixes with initial vowels. If native speakers pronounce the stem morphemes in this situation without [ə], we shall have good evidence that aspirated consonants function as single segments in Hindi-Urdu. If, on the other hand, such morphemes retain [ə], we shall have a clear indication that the aspirated consonants function as clusters. Below are some stems of the kind needed for our experiment :

$VC^h{}_ə C$-type:

  [bæṭ^{h}ək] 'meeting, sitting' (noun)

  [pig^{h}əl] 'thaw' (verb stem)

$VC_ə C^h$-type:

  [səməj^h] 'understand' (verb stem)

  [uləj^h] 'quarrel' (verb stem)

Adding appropriate suffixes, we obtain the following forms:

  [bæṭ^{h}kẽ] 'meeting, sittings'

  [pig^{h}lā] 'thawed' (masc. sg.)

  [səmj^{h}ā] 'understood' (masc. sg.)

  [ulj^{h}ū̃] '(I may) quarrel' (subj.)

We thus conclude that the aspirated consonants of Hindi-Urdu function as units at the point in the phonology where P1 applies.

We may thus assume that the words of Group I are derived from the following underlying representations: / akaḍ+an/, /cupaḍ+ā/, /haḍak+ā+ā/, /ḣēkaḍ+ī/, /huḍak +ā/, /j^{h}agaḍ+ā/, /kapaḍ+ā/, / lakaḍ+ī/, / laḍak+ā/, / lomaḍ+ī/, /sukaḍ+an/, and /ṭukaḍ+ā/. The loss of the vowel in the second syllable of these underlying forms is easily accounted for by a rule which we have discussed elswehere (Narang & Becker 1971:646-53). This rule, which must apply after Rule 1, is formulated as follows:

$$(2)\qquad \begin{bmatrix} +\text{syllabic} \\ +\text{compact} \\ -\text{tense} \end{bmatrix} \rightarrow \varnothing \,/\, \text{VC} - \text{C} + \text{V}$$

I.e., a lax low vowel /a/, which a later rule will convert into [ə], is deleted from a word in which it is preceded by the sequence 'vowel plus consonant' and followed by the sequence 'consonant plus vowel', provided that a morpheme boundary (+) intervenes between the latter two segments.

The words [ləkṛī], [ləkəṛp^{h}ōṛ], [kəpṛā], and [kəpəṛkōṭ(^{h})] would therefore have the following derivations:

	/lakaḍ+ī/	/lakaḍ+p^{h}ōḍ/	/kapaḍ+ā/	/kapaḍ+kōṭ(^{h})
	↓	↓	↓	↓
Rule 1	lakaṛ+ī	lakaṛ+p^{h}ōṛ	kapaṛ+ā	kapaṛ+kōṭ(^{h})
	↓	↓	↓	↓
Rule 2	lakṛ+ī	--------------	kapṛ+ā	---------------
	↓ ⋮ ↓	↓ ⋮ ↓	↓ ⋮ ↓	↓ ⋮ ↓
	[ləkṛī]	[ləkəṛp^{h}ōṛ]	[kəpṛā]	[kəpərkōṭ(^{h})]

The situation with regard to the words of Group II is unfortunately less straightforward. None of these words, it would seem, has a related form in which its consonant cluster is interrupted by a vowel. Nonetheless, we favor deriving forms like [kēkṛā], [k^{h}iṛkī], and [p^{h}ēp^{h}ṛā] from underlying representations in which such a segment is present, i.e. from /kekaḍ+ā/, /k^{h}iḍak+ī/, and /p^{h}əp^{h}aḍ+ā/. The postulation of a segment /a/ in the abstract representations of morphemes in which it is never realized phonetically would

Group I:

[əkṛ | ən] 'stiffness'
[cupṛ | ā] 'oily, greasy'
[həṛk | ā | yā] 'mad, rabid'
[hēkṛ | ī] 'arrogance'
[huṛk | ā] 'pining, fretting'
[jʰegṛ | ā] 'quarrel' (noun)
[kəpṛ | ā] 'cloth'
[ləkṛ | ī] 'wood'
[ləṛk | ā] 'boy'
[lōmṛ | ī] 'vixen'
[sukṛ | ən] 'wrinkle'
[ṭukṛ | ā] 'bit, scrap'

Group II:

[kēkṛ | ā] 'crab'
[kʰiṛk | ī] 'window'
[pʰẹpʰṛ | ā] 'lung'

With regard to the form of Group I, the answer is simple. Although at the systematic-phonetic level the flaps of these words stand in a morpheme-internal consonant cluster (a position in which Rule 1 does not apply), the environment in which they are found at the systematic-phonemic level does meet the structural description of our rule. As the following list demonstrates, each word in Group I is derivationally related to a form in which its retroflex flap is separated from the other member of its consonant cluster by a shwa:

FORMS OF GROUP I	RELATED FORMS WITH SHWA
[əkṛən]	[əkəṛnā] 'to be stiff, arrogant'
[cupṛā]	[cupəṛnā] 'to butter'
[hərkāyā]	[həṛək] 'hydrophobia'
[hēkṛī]	[hēkəṛ] 'arrogant, unyielding'
[huṛkā]	[huṛəknā] 'to pine, fret'
[jʰəgṛā]	[jʰəgəṛnā] 'to quarrel'
[kəpṛā]	[kəpəṛkōṭ] 'cloth house, tent'
[ləkṛī]	[lekəṛpʰōṛ] 'woodpeeker'
[ləṛkā]	[leṛəkpen] 'boyhood'
[lōmṛī]	[lōməṛ] 'fox' (masc.)
[sukṛən]	[sukəṛnā] 'to shrink'
[ṭukṛā]	[ṭukəṛgədā] 'one who begs for scraps'

with Rule 1.[13] These words include:

Dictionary entry	Standard Hindu-Urdu	Gloss
[əsāḍʰ]	[əsāṛh]	'(name of a month)'
[bəḍʰnā]	[bəṛʰnā]	'to grow'
[pāḍā]	[pāṛā]	'male buffalo calf'
[pēḍū]	[pēṛū]	'belly below the navel'
[sāḍʰū]	[sāṛʰū]	'wife's sister's husband'
[gāḍī]	[gāṛī]	'cart'
[gāḍʰā]	[gāṛʰā]	'coarse cloth'
[guḍiyā]	[guṛiyā]	'doll'
[məḍʰnā]	[məṛʰnā]	'to envelop'
[məsūḍʰā]	[mesūṛʰā]	'gums'

Except in some special cases that will be treated below, the pronunciation of voiced retroflex stops in morpheme-final position after a vowel or in morpheme-medial position between vowels is today considered to be a regionalism by educated speakers of Hindi-Urdu.

§3. Some apparent exceptions to Rule 1. In §2 we presented a rule of flap formation adequate to describe the occurrence of voiced retroflex stops and flaps in the words presented there. In the remainder of this study we shall attempt to justify our formulation of that rule by answering some objections which might be raised against it.

§3.1. Morpheme-internal consonant clusters containing [ṛ]. Given Rule 1, the student of Hindi-Urdu might well ask how it accounts for the retroflex flaps in the forms of the following two groups:

13. Very little is known about 'Abdul Wāsi' other than that he lived during the reign of Aurangzeb (1658-1707) and was a native of Hāṅsā in Haryana. In revising 'Abdul Wāsi''s dictionary Khān-e Āṛzū rejected many entries as *zaban-e juhāl* 'language of the illiterate' or *zabān-e waṭaṇ-e sahib-e risālah* 'language of the home of the author' (cf. Abdullah 1951:31).

[ḍihūḍi]	[ḍihūṛi]	'threshold, porch'
[ēḍ]	[ēṛ]	'heel'
[gəḍ^h]	[gəṛ^h]	'fort'
[gāḍi]	[gāṛi]	'cart'
[lāḍ]	[lāṛ]	'tenderness'
[mæ̃ḍā]	[mæ̃ṛā]	'ramp, harrow'
[pīḍ^{h}i]	[pīṛ^{h}i]	'generation'
[səḍā]	[səṛā]	'decayed'

The Khari Boli dialect area alluded to above corresponds to that of Grierson's 'Vernacular Hindōstānī', 'the form of speech on which the Literary Hindōstānī that took its rise in Delhi is based' (Grierson 1916:63). It is, therefore, not surprising that early Urdu literature contains numerous examples of the preservation of a voiced retroflex stop in the environments specified by the structural description of Rule 1. Inspection of some of the literary texts from the 16th-18th centuries presented by Shīrānī (1966), for example, yields the following forms whose voiced retroflex stops are now pronounced as flaps in Standard Hindi-Urdu:

Old Urdu Literature	Standard Hindi-Urdu	Gloss
[b^{h}ēḍiyā]	[b^{h}ēṛiyā]	'wolf'
[būḍ^{h}ā]	[būṛ^{h}ā]	'aged'
[cəḍ^h]	[cəṛ^h]	'rise'
[c^{h}ōḍnā]	[c^{h}ōṛnā]	'to release'
[ḍāḍ^{h}i]	[ḍāṛhi]	'beard'
[jāḍā]	[jāṛā]	'winter'
[kāḍ^{h}nā]	[kāṛ^{h}nā]	'to take out'
[ōḍ^{h}ni]	[ōṛhni]	'head scarf'
[pəḍ^{h}nā]	[pəṛ^{h}nā]	'to read'
[sāḍē]	[sāṛē]/[sāṛ^{h}ē]	'plus half'

Even the Urdu dictionary *Nawadir ul-alfaz*, which Siraj ud-dīn 'Alī Khān-e Ārzū prepared in 1751 in a conscious attempt to overcome the dialectal bias of 'Abdul Wāsi 'Hāṅsāvī's *Gharā'ib ul-lughāt* (Abdullah 1951), contains many words with [ḍ] or [ḍ^h] that are now pronounced in accordance

	Initial	Medial	Final
ḍ	...	×	×
ḍḍ	×	...	×
ṇḍ	×	...	...
ṛ	×	...	...
ṛṛ	×	×	×
ṇṛ	×	×	×

Translating the generalizations embodied in this chart into a generative-phonological rule which also accounts for the analogous distributional pattern of [ḍʰ] and [ṛʰ], we arrive at Rule 1:

(1) (morpheme-level)

$$\begin{bmatrix} +\text{consonantal} \\ -\text{grave} \\ +\text{diffuse} \\ +\text{flat} \\ +\text{voiced} \end{bmatrix} \rightarrow [-\text{obstruent}] \,/\, V - \begin{Bmatrix} V \\ + \end{Bmatrix}$$

I.e.,/ḍ and/ ḍʰ/ are realized as [ṛ] and [ṛʰ], respectively, when they are preceded within the same morpheme by a vowel and followed by a vowel or a morpheme boundary.[11]

It should be noted that Rule 1 is not present in the phonologies of all speakers of Hindi-Urdu. In particular, medial and final [ḍ] and [ḍʰ] are often preserved in the Khari Boli region of the Upper Doab and in Haryana.[12] Hence, one finds such competing pronunciations as those displayed below:

Khari Boli/Haryani	Standard Hindi-Urdu	Gloss
[bəḍā]	[bəṛā]	'great'
[bəḍʰēlā]	[bəṛʰēlā]	'boar'

11. The choice of the stops rather than the flaps as the underlying forms from which the other class of sounds derives is dictated by considerations of naturalness and by the fact that the environments in which the flaps occur are more restricted and hence easier to state than those in which the stops are found.
12. Cf. Grierson (1916:213 & 253) and Jain (1961c:2).

flaps is highly desirable.[8] In §2 we shall attempt to formulate the main phonological rule upon which this treatment depends.

§2. The rule of flap formation. In the preceding section we saw a rather atypical selection of Hindi-Urdu words containing the sounds [ḍ ṛ ḍ^h ṛ^h]. A more representative set of examples is presented below:[9]

Unaspirated [ḍ]/[ṛ]	Aspirated [ḍ^h]/[ṛ^h]
[ḍər] 'fear'	[ḍ^{h}eŋg] 'type'
[sər|ḍūb] 'fully drowned'	[sər|ḍ^{h}ək|ī] 'first night of marriage'
[pəhāṛ] 'mountain'	[gəṛ^h] 'fort'
[g^{h}ōṛ|ā] 'horse'	[pəṛh|n|ā] 'to read'
[əḍḍ|ā] 'perch, stand'	[buḍḍ^h|ā] 'old, aged'
[ṭuṇḍ] 'stump of a branch or arm'	[ḍ^{h}uṇḍ^h] 'robber, thug'
[pəṇḍit] 'learned man'	[ḍ^{h}əṇḍ^{h}ōr|cī] 'public crier'
[pəṛōs] 'neighborhood'	[əṛ^{h}āī] (= [ḍ^{h}āī] 'two and a half'

The main facts of the distribution of [ḍ] and [ṛ] illustrated here are summarized by Khan (1955:20) in the following chart:[10]

---

8. There may be some further justification for this analysis in the morphophonemic alternation of [ṭ] and [ṛ] displayed in [c^{h}ūṭnā] 'to be released' vs. [c^{h}ōṛnā] 'to release', [p^{h}ūṭnā] 'to burst' [intr.] vs. [p^{h}ōṛnā] 'to burst' (tr.), [ṭūṭnā] 'to break' (intr.) vs. [tōṛnā] 'to break' (tr.), and [p^{h}əṭnā] 'to split' (intr. vs. [p^{h}āṛnā] 'to split' (tr). Pray (1970:110-2) suggests that the retroflex flap of the second member of each of these pairs may be derived SYNCHRONICALLY from an underlying geminate /ṭṭ/ by way of the following steps: /ṭṭ/ > {ṭ] > [ḍ] > [ṛ]. The last step in this derivation is effected by an unstated rule presumably very similar to our Rule 1.

9. Morphemes are separated here (and, when necessary, at other points in our study) by means of a vertical line (|). Notice that a cluster of [d^h] plus [d^h] cannot occur within a morpheme (cf. footnote 16).

10. In this chart the symbol 'X' stands for 'does not occur' and a sequence of three dots '...' for 'does occur'. It will be noted that the terms 'initial', 'medial', and 'final' all refer to the domain of the morpheme.

to contrast in analogous environments, the forms on the left differ in fact quite significantly from those on the right. Whereas the stops of the former are all morpheme-initial, the flaps of the latter are all morpheme-medial or morpheme-final. The refusal of the authors who cite such forms to attach any importance to this fact reflects the strict adherence of many taxonomic phonemicists to the view that 'the definition of a phoneme is properly made in purely phonetic terms' (Bloomfield 1930:28)—a position which Postal (1968:240) interprets as a synchronic extension of the Neogramarian claim that Lautgesetze are 'purely phonetic in both operation and environment'.[6] As generative phonologists, however, we are no longer encumbered by this dogma and are thus free to recognize with Khan (1955:20) that in general an intervocalic [ḍ] or [ḍ^h] 'is found only in compound words or after a prefix... Hence, to the extent that we are prepared to treat English and tatsama words as exceptions—by no means an unreasonable modus operandi[7]—there exists no serious obstacle in any of the forms quoted thus far to a phonological treatment of Hindi-Urdu which derives [ṛ] and [ṛ^h] from the same underlying segments as [ḍ] and [ḍ^h]. Since it leads to a substantial simplification of the Hindi-Urdu lexicon, such a treatment of the voiced retroflex stops and

---

6. Jain (1961c:12), for example, citing personal communication with Kelkar, states quite plainly that 'the discussion of simple and compound words pertains to the grammatical level, which has nothing to do with the phoneme' [our translation].
7. The literature on generative phonology contains many precedents for treating loanwords as exceptions. In some generative studies the exceptional character of foreign words is accounted for by including a diacritic feature such as [+foreign] in their lexical entries and a feature [—foreign] in the structural description of rules that apply only to native vocabulary (cf. Chomsky & Halle 1968:373). Kiparsky (1968b:12-3), on the other hand, argues that a second device, a rule-exception feature of the form [–Rule X], is more realistic in view of the fact that languages typically employ 'loanwords of varying degrees of assimilation.'

typical of this type of pair.[3]

[bāḍī] 'brassiere' (sg. of Eng. *bodice*)	[bāṛī] 'small garden'
[pəgōḍā] 'pagoda'	[pəkōṛā] '(pudding fried in oil or ghee)'
[pɛḍ] 'pad'	[pēṛ] 'tree'
[mūḍ] 'mood'	[mūṛ] 'head'
[sōḍā] 'soda'	[tōṛā] 'break'

The second type of pair commonly quoted to justify setting up separate flap phonemes juxtaposes a tatsama word, i.e. an unassimilated Sanskrit loanword, with an intervocalic [ḍ] and a fully integrated Hindi-Urdu form with an intervocalic [ṛ]. Pairs of this sort include the following:[4]

[āḍəmbər] 'vanity'	[āṛū] 'peach'
[uḍu] 'star'	[uṛū] '(I) may fly'

More interesting than either of these types of evidence, however, are pairs of the following kind:[5]

[suḍɔ̄l] 'shapely'	[cuṛæl] 'witch'
[wiḍəmbnā] 'mockery'	[b^{h}iṛənt] 'collision'
[suḍ^{h}ər] 'elegant', shapely'	[kuṛ^{h}ən] 'grudge, ill will'
[niḍ^{h}āl] 'wearied'	[ciṛ^{h}ā] 'vexed'
[bēḍhəb] 'ill-mannered'	[beṛ^{h}āw] 'increase'

Although at first glance these words seem to provide clear evidence for the ability of the retroflex stops and flaps

3. These examples have been drawn from Bailey (1956:xxxii), Dixit (1963:95-6), and Mehrotra (1964:240). All of them are also cited by Kelkar (1968:41).
GENERAL LINGUISTICS, VOL. 14, NO. 3
Published by The Pennsylvania State University Press,
University Park and London.
4. The first pair has been adduced by Mehrotra (1964:240) and the second by Dixit (1963:95). Both Sanskrit forms are also quoted by Kelkar (1968:41).
5. The first three pairs are from Mehrotra (1964:240) and the remaining ones from Dixit (1963:95).

GENERATIVE PHONOLOGY AND THE RETROFLEX FLAPS OF HINDI-URDU

DONALD A. BECKER
The University of Wisconsin

GOPI CHAND NARANG
The University of Delhi

§1. Introduction.[1] In the taxonomic-phonemic literature on Hindi-Urdu, it is a familiar observation that [ṛ] and [ṛʰ] are by and large in complementary distribution with [ḍ] and [ḍʰ], respectively. Although this observation has led some analysts[2] to regard the retroflex flaps as allophonic variants of the voiced retroflex stops, the existence of some minimal and subminimal pairs in which the flaps and stops contrast has prompted most investigators working in the taxonomic framework to treat [ṛ] and [ṛʰ] as independent phonemes.

The pairs most frequently cited by proponents of the independent-phoneme hypothesis are of three main types. The first consists of an English loanword containing an intervocalic [ḍ]—the normal Indian substitute for the English alveolar [d]—and a phonetically similar indigenous word containing an intervocalic [ṛ]. The following examples are

---

1. Our collaboration on the present study was made possible by grants awarded to Becker by the American Council of Learned Societies and the American Philosophical Society (Penrose Fund). We have benefited from discussions with P. B. Pandit, R. N. Srivastava, and M. G. Chaturvedi. We are especially indebted to Professors Pandit and Srivastava for their helpful comments on an earlier draft of this article.

2. We refer here to such linguists as Elizarenkova (1961:32), Bhatia (1960:551), and Khan (1955:20 & 1966:148).

HARMS, ROBERT T. 1966. The measurement of phonological economy. Lg. 42.602-11.
—1968. Introduction to phonological theory. Englewood Cliffs, N. J.: Prentice-Hall.
HOCKETT, CHARLES F. 1958. A course in modern linguistics. New York: Macmillan.
HOENIGSWALD, HENRY M. 1948. Declension and nasalization in Hindustani. JAOS 68.139-44.
HUSAIN, MASUD. n.d. A phonetic & phonological study of the word in Urdu. (Department of Urdu Studies, 1.) Aligarh, India: Muslim University.
KELKAR, ASHOK R. 1968. Studies in Hindi-Urdu, I: introduction and word phonology. (Building Centenary and Silver Jubilee series, 35.) Poona: Deccan College.
KELLOGG, S. H. 1893. A grammar of the Hindi language. 2nd ed. London: Routledge & Kegan Paul.
KING, ROBERT D. 1969. Historical linguistics and generative grammar. Englewood Cliffs, N. J.: Prentice-Hall.
KIPARSKY, PAUL. 1968a. Linguistic universals and linguistic change. Universals in linguistic theory, ed. by Emmo Bach and Robert T. Harms, 170-202. New York: Holt, Rinehart & Winston.
—. 1968b. How abstract is phonology¯(Unpublished.)
MEHROTRA, RAMESH CHANDRA. 1968. Hindī aur Sanskrit mẽ anuswār aur nāsikya vyanjan. Bhāṣaiṣṇa, 35-47. Raipur.
PRAY, BRUCE R. 1970. Topics in Hindi-Urdu grammar. (Research monograph 1). Berkeley: Center for South and Sourtheast Asia Studies, University of California.
SHARMA, ARYENDRA, AND HANS. J. VERMEER. 1963. Einführung in die Grammatik der modernen Hindi. Heidelberg: Julius Groos Verlag.
SRIVASTAVA, R. N. 1968. Theory of monophonematics and aspirated phonemes of Hindi. Acta Linguistica 18.363-73.
—. 1969. Review of Studies in Hindi-Urdu, I, by A. R. Kelkar. Lg. 45.913-27.
[Received 10 July 1970]

aspirated consonants was offered as a reliable indication that those segments are not to be derived from underlying clusters of consonant plus / h/.[21]

REFERENCES

CHOMSKY, NOAM, and Morris Halle. 1968. The sound pattern of English. New York: Harper & Row.

DIXIT, R. PRAKASH. 1963. The segmental phonemes of contemporary Hindi. Austin University of Texas master's thesis.

FIRTH, J. R. 1944. Introduction. In Colloquial Hindustani, by A. H. Harley, ix-xxx. London: Routledge & Kegan Paul.

---

21. We wish to thank Manindra K. Verma and Mrs. Manjari Agrawal Ohala for some useful criticism of an earlier draft of this article. It goes without saying that they in no way share the responsibility for any deficiencies which remain in our study. Mrs. Ohala has called our attention to the fact that Pray (1970:93) has already adduced the/ a/-deletion rule which we have labeled P1 as evidence for a unit analysis of the aspirated consonants of Hindi-Urdu. With regard to the nasalized vowels, however, he has stated (in contradistinction to us) that they do not block the application of P1 and should, therefore, not be regarded as underlying sequences. But Pray's only illustration of /a/-deletion in the evironment V̆C—C+V is the form [sə̆bʰlā] 'managed' (<[sə̆bʰəlnā] 'to manage'. We would prefer to view the loss of [ə] (</a/) in this case as the result not of P1 but of an optional rule which allows most speakers of Hindi-Urdu to delete a medial [ə] before a sequence of liquid plus vowel. As a result of this optional deletion rule, the word for 'beautiful woman' which we have transcribed as [sundərī] is frequently heard as [sundrī]. Other eamples include [meŋgəlī] ~ [məŋglī] 'born under the planet Mars' and [bəndərõ] ~ [bəndrõ] 'monkeys' (obl. pl.) On the other hand, we are aware of the fact that some speakers of Hindi-Urdu, unlike the majority of our informants, delete the shwa even in such forms as [ā̃gənõ] 'courtyards' (obl. pl.) and [bʰā̃jəkõ] 'ropemakers' (obl. pl.). We suggest that such speakers, while having the same underlying representations as those who retain the shwa, apply rules P1 and P2 in the order P2-P1. Kiparsky 196a has sought to explain this type of change in rule order in terms of grammar simplification. According to him, 'rules tend to shift into the order which allows their fullest utilization in the grammar'. Re-ordering P1 after P2 has precisely this result.

their short nasalized vowel. A low-level phonetic rule will be needed to insert a homorganic nasal consonant of very short duration before these voiced stops, thereby producing the forms [mə̃ṇgwānā]' [mə̃ṇgnī], [mə̃ṇgetər], [mū̃^{n}ḍnā], [mū̃^{n}ḍā], [mū̃^{n}ḍāī], [gū̃^{n}ḍ^{h}wānā], [gū̃^{n}d^{h}ānā], [gū̃^{n}d^{h}wāī], [mū̃^{n}dnā], [əd^{h}mū̃^{n}dā], [bə̃^{n}d^{h}nā], [bə̃^{n}d^{h}wānā], and [pĩ^{n}gūṛā]. The short homorganic nasal consonants represented here by raised [ṇ], [ṇ], and [n] will be inserted only after the rules of stress placement have operated. Hence, [mū̃^{n}ḍā] 'get shaved' (imp.) will be stressed with words of the form $C_0\breve{V}C\bar{V}$ (cf. [nəˈdī] 'river', [g^{h}əˈṛī] 'watch') on its second syllable, while [muṇḍā] 'the Munda language' (< underlying/mUNḍAA̹) will be stressed with words of the form $C_0\breve{V}CC\bar{V}$ (cf. [ˈcəlnā] 'to walk, move' [ˈutnā] 'that much') on its first.

In this section we have shown that the analysis of the Hindi-Urdu consonants and vowels proposed in §4 accounts not only for the phonetic generalizations upon which it was based, but for many apparent exceptions to those generalizations as well. We consider this to be a strong indication of the correctness of our analysis.

6. In conclusion, let us review briefly what we have done in this article. We have, above all, attempted to justify two claims about the generative phonology of Hindi-Urdu: that the aspirated consonants of this language must be treated at an abstract level of representation as units; and that the nasalized vowels are best derived from underlying sequences of vowel plus nasal consonant. With regard to the latter claim, we have argued in §4 that a substantial savings can be achieved in the lexicon by adotping an analysis which derives the nasalized vowels from underlying sequences of vowel plus nasal consonant. More compelling in our opinion, however, is the argument put forth in §3 that an important rule of Hindi-Urdu phonology treats the nasalized vowels as if they contained a final consonantal element. The fact that the same rule presupposes a unit analysis of the

[sīcnā] 'to be irrigated' [sīcāī] 'irrigation'	[sīcnā] 'to irrigate'
[pʰīkwānā] 'to cause to be thrown'	[pʰēknā] 'to throw'
[pʰūknā] 'to be blown'	[pʰūknā] 'to blow'
[sīknā] 'to be roasted'	[sēknā] 'to roast'
[dʰūknā] 'to be puffed at'	[dʰōknā] 'to puff (at a fire)'
[ḍʰəpnā] 'to be covered'	[dʰāpnā] 'to cover'
[ūcāi] 'height'	[ūcā] 'high'
[səpērā] 'snake charmer'	[sāp] 'snake'
[gəṭʰrī] 'knotted bundle'	[gāṭh] 'knot'
[gəwār] 'rustic' [gəwei] 'village population'	[gāw] 'village'
[bəṭāī] 'distribution' [bəṭwāī] '(wages for) distributing something'	[bāṭnā] 'to distribute'

Thus these forms present no evidence against our initial claim that it is possible to construct a generative phonology of Hindi-Urdu in which nasalization is redundant for vowels. Some additional examples of short nasalized vowels aristing from P6 are listed below:

Forms derived from [māgnā] 'to request, ask': [məgwānā] 'to send for, to cause to be brought', [məgnī] 'betrothal, asking in marriage', [məgētər] 'betrothed girl'.

Forms derived from [mūḍnā] 'to shave': [mūḍnā] 'to be shaved', [mūḍā] 'get shaved' (imp.), [mūḍāī] 'wages for shaving'.

Forms derived rom [gūdʰnā] 'to knead or string': [gūdʰwānā] 'to cause to be kneaded/strung', [gūdʰānā] 'to cause to be kneaded/strung', [gūdʰwāī] 'wages for kneading/stringing'.

Forms derived from [mūdnā] 'to close or cover': [mūdnā] 'to be closed or covered', [ədʰmūdā] 'halfclosed'.

Forms derived from [bādʰnā] 'to bind': [bədʰnā] 'to be bound', [bədʰwānā] 'to cause to bound'.

Form derived from [pīg] 'swing': [pīgūrā] 'cradle'.

These examples differ from those preceding to the extent that they all contain voiced rather than voicless tops following

By far the most striking examples of this alternation, however, occur in the verbal system. Here we find non-causative, active verbs with long vowels matched by their passive and causative counterparts with reduced vowels. This pattern is clearly displayed by the following forms:

Active	Passive	First Causative	Second Causative
[lādnā] 'to load'	[lədnā]	[lədānā]	[lədwānā]
[mānnā] 'to agree'	[mənnā]	[mənānā]	[mənwānā]
[mārnā] 'to beat'	[mərnā]	[mərānā]	[mərwānā]
[sāṛnā] 'to burn'	[səṛnā]	[səṛānā]	[səṛwānā]
[j^{h}āṛnā] 'to dust'	[j^{h}əṛnā]	[j^{h}əṛānā]	[j^{h}əṛwānā]
[sīnā] 'to sew'	[silnā]	[silānā]	[silwānā]
[lūṭnā] 'to loot'	[luṭnā]	[luṭānā]	[luṭwānā]
[b^{h}ūnnā] 'to roast'	[b^{h}unnā]	[b^{h}unānā]	[b^{h}unwānā]
[dēk^{h}nā] 'to see'	[dik^{h}nā]	[dik^{h}ānā]	[dik^{h}wānā]
[c^{h}ēdnā] 'to perforate'	[c^{h}idnā]	[c^{h}idānā]	[c^{h}idwānā]
[k^{h}ōlnā] 'to open'	[k^{h}ulnā]	[k^{h}ulānā]	[k^{h}ulwānā]
[tōlnā] 'to weigh'	[tulna]	[tulānā]	[tulwānā]
[dhōnā] 'to wash'	[d^{h}ulnā]	[d^{h}ulānā]	[d^{h}ulwānā]
[khōdnā] 'to dig'	[k^{h}udnā]	[k^{h}udānā]	[k^{h}udwānā]
[jōtnā] 'to plow'	[jutnā]	[jutānā]	[jutwānā]
[ghōlnā] 'to dissolve'	[g^{h}ulnā]	[g^{h}ulānā]	[g^{h}ulwānā]

All these examples demonstrate the need for a rule P6, which would shorten all long owels and raise mid ones in certain classes of deried words. While we shall not attempt a precise statement of this rule here, it should be abundantly clear that this rule is of crucial importance to an understanding of the distribution of nasalized vowels in Hindi-Urdu, for it provides an explanation for the occurrence of short nasalized vowels in the last and largest group of exceptions to generalization (a). As the following data show, all these forms can be derived from words with long nasalized vowels:

Derived Forms	Forms From Which Derived
[k^{h}ĩcnā] 'to be pulled'	[khĩcnā] 'to pull'
[k^{h}ĩcāī] '(wages for) pulling'	

[k^{h}ĩcāī], [sīcnā], [sīcaī], [p^{h}ĩkwānā], [p^{h}ūknā], [sĩknā], [d^{h}ūknā], [ḍ^{h}ə̃pnā], [ūcaī], [sə̃pērā], [gə̃ṭhrī], [gə̃ṭhīlā], [gə̃wār], [gə̃wəi], [bə̃ṭwāī]. All these words have one thing in common: they are derived forms. The importance of this fact will become manifest when we examine some of the derivational patterns of Hindi-Urdu. We begin with the large class of nouns in [āī] which are derived from verbs, nouns, and adjectives. Some examples of this type of derivation are listed below, along with the words from which they are derived :

Derived forms	Forms from which derived
[silāī] 'sewing'	[sīnā] 'to sew'
[piṭaī] 'beating'	[pīṭnā] 'to beat'
[bijāī] 'sowing'	[bīj] 'seed'
[miṭ^{h}āī] 'candy'	[mīṭ^{h}ā] 'sweet'
[dik^{h}āī] 'seeing'	[dēk^{h}nā] 'to see'
[lipāī] '(wages for) plastering'	[lēpnā] 'to plaster'
[kəṭāī] '(wages for) cutting'	[kāṭnā] 'to cut'
[kəṛhāī] 'embroidery'	[kāṛ^{h}nā] 'to embroider'
[kəmaī] 'earnings'	[kām] 'work'
[buwāī] '(wages for) seeding'	[bōnā] 'to seed'
[k^{h}udāī] '(wages for) digging'	[k^{h}ōdnā] 'to dig'
[jutāī] 'plowing'	[jōtnā] 'to plow'
[d^{h}ulāī] '(wages for) washing'	[dhōnā] 'to wash'
[cunaī] '(wages for) brickalying'	[cūnā] 'lime, mortar'

Here we note something very interesting: a kind of alternation between long and short vowels takes place whereby [ī] > [i], [ē] > [i], [ā] > [ə], [ō] > [u], and [ū] > [u]. that this alternation is by no means limited to the type of derivation illustrated above can be seen from the following examples:

[khilōnā] 'toy'	[k^{h}ēl] 'play'
[k^{h}ilāṛī] 'player'	
[cəhētā] 'beloved'	[cāh] 'love'
[cuhiyā] 'she-mouse'	[cūhā] 'mouse'
[muṭāpā] 'fatness'	[mōṭā] 'fat, chubby'
[luhār] 'blacksmith'	[lōhā] 'iron'
[b^{h}ikārī] 'beggar'	[b^{h}īk] 'alms'
[niclā] 'low'	[nīcē] 'low'

Accordingly, all that must be done to obtain the correct phonetic output for these forms is, as Srivastava suggests, to order our rules in such a way that P1 applies after the rules of nasal assimilation (P3 of our analysis). It will then be possible to derive all the forms in questions in the following manner:

Underlying representations after MS1-3		Rule P3		Rule P1				Phonetic output
/camak+ii̯laa̯/	→	—	→	camk+ii̯laa̯	→	...	→	[cəmkilā]
/damak+aa̯/	→	—	→	damk+aa̯	→	...	→	[dəmkā]
/ṭʰanak+aa̯/	→	—	→	ṭʰanka+aa̯	→	...	→	[ṭʰənkā]
/cʰanak+aa̯/	→	—	→	cʰank+aa̯	→	...	→	[cʰənkā]
/samajʰ+aa̯/	→	—	→	samjʰ+aa̯	→	...	→	[səmjhā]
/sanak+ii̯/	→	—	→	sank+ii̯	→	...	→	[sənkī]
/simaṭ+aa̯/	→	—	→	simṭ+aa̯	→	...	→	[simṭā]
/pinak+ii̯/	→	—	→	pink+ii̯	→	...	→	[pinkī]

The application of our five phonological rules in the order P3-P1-P2-P4-P5 will, incidentally, in no way lessen their ability to produce the correct phonetic realization for any of the examples previously cited.

Very similar in nature to the forms [cəmkilā], [dəmkā] etc. are the Arabic loans [inkār], [munkir], [munkər], [inkisār], [inkišāf], [munkišif], and [mənkūhə], which were also listed as exceptions to generalization (c). Here again the non homorganic nasal clusters do not exist in the systematic phonemic representations of the base morphemes (/nAkArA/, /kAsArA/, /kAšAfA/ , and /nAkAhA/), but arise only through the deletion of a vowel. A more complete phonology of Hindi-Urdu would presumably contain certain rules accounting for the behaviour of these Arabic forms. Such rules would have the status of minor rules, and would be applicable only to morphenes expressly marked to undergo them.

The last group of exceptional forms which can be shown to be compatible with our rules is that which includes [kʰĩcnā],

entered in the lexicon simply as /mUh/ and /mAh/.[20] Similarly, the modified version of P2, no longer applying to underlying long vowels but to underlying diphthongs, can be utilized to derive a second group of apparent exceptions to generalization (a). Such forms as [mɛ̃hdī], [mɛ̃hgā], [mɛ̃hgāī], [lɛ̃hgā], and [bɛ̃hgī] can now be derived by P2 from the underlying representations /mAhNdII̯/ , /mAhNgAA̯/ , mAhNgAA̯II̯/ , lAhNgAA̯/ , and /bAhNgII̯/.

No adjustment of any of our rules will be necessary to account for a third group of 'exceptions'. The forms [cəmkīlā], [dəmkā], [ṭʰənkā], [cʰənkā], [səmjʰā], [sənkī], [simṭā], and [pinkī] were all cited as exceptions to generalization (c)—which, it will be recalled, states that within a morpheme a nasal consonant agrees in point of articulation with a following non-uvular stop. However, as Srivastava (1969:923) rightly asserts with reference to [senkī] and [simṭā], the non-homorganic nasal clusters of these words do not exist at the systematic-phonemic level of representation, but arise only through the operation of the rule which we have labeled P1. In §1 and §3 we have already seen that this is true of [cəmkīlā], [səmjʰā], and [sənkī]. That the other words of this group of exceptions are subject to precisely the same morphophonemic alternation of shwa with zero is shown in the following :

Forms with Shwa	Forms without Shwa
[dəməknā] 'to glisten' (inf.)	[dəmkā] 'glistened' (masc. sg.)
[ṭʰənəktā] 'jingling' (masc. sg.)	[ṭʰənkā] 'jingled' (masc. sg.)
[cʰənəknā] 'to hiss' (inf.)	[cʰənkā] 'hissed' (masc. sg.)
[siməṭṭā] 'shrinking' (masc. sg.)	[simṭā] 'shrank' (masc. sg.)
[pinək] 'intoxication from eating opium, drowsiness'	[pinkī] 'drowsiness' (dimin. of [pinək]

20. The fact that the revised version of P4 nasalizes the /h/ in these words along with the preceding vowel should not disturb us. Firth (1944:xvi) suggests that these two forms might be transcribed with equal validity as [muŋh] and [meŋh] or as [muhŋ] and [mehŋ], for in both cases what is being rendered with [ŋ] (Firth's symbol for nasalization) and [h] is not so much a sequence of nasalized vowel plus [h] as a nasalized vowel 'with a breathy quality' or an ' "h"-colour[ing] especially at the end' [Firth, xv]. For some discussion of a prosodic analysis of Hindi-Urdu nasalization and aspiration, see Hoenigswald (1948:143-4) and Dixit (113-4).

While it is to be expected that various rules in the phonology of a given language will have exceptions, the validity of these rules would be open to serious doubt if the number of exceptions were very large. Luckily, the exceptions to our rules are quite limited. Indeed, many of the forms cited at the beginning of §4, as exceptions to generalizations (a)-(f), turn out upon further investigation to be compatible with our rules after all. This is true, for example, of the forms [mū̃h] and [mē̃h] that were listed as exceptions to generalization (a), according to which short vowels are rarely nasalized. There is, it seems, some justification for an analysis of the Hindi-Urdu vowel system which derives phonetic [ī ē ǣ ā ɔ̄ ō ū] from underlying sequences of vowel plus glide. The justification lies in the fact that the rules of stress placement alluded to in §3 make no distinction in their application between long vowels, on the one hand, and sequences of short vowel plus consonant, on the other. The adoption of a diphthongal analysis of the long vowels would thus greatly facilitate the statement of the stress placement rules, by enabling them to refer to syllables of the form $C_0\bar{V}$ or $C_0\breve{V}C$ simply as C_0VC, and to those of the form $C_0\bar{V}C$ or $C_0\breve{V}CC$ simply as C_0VCC. Throughout the remainder of this study, we shall assume that systematic-phonetic long vowels are derived from underlying dipthongs. This assumption will necessitate some minor changes in the formulation of the rules presented thus far. Notably, each occurrence of the feature bundle [+ syllabic, + tense] will have to be replaced by the sequence [+ syllabic] [–consonantal].[19] Once this is done, however, we make an interesting discovery : the exceptional forms [mū̃h] and [mē̃h] are now automatically nasalized by P4! They can now be

19. The environment of P1 would have to be altered to `V ([–consonantal] C ——C + V'.

and [gəwānā] in the lexicon with their nasalized vowel already specified as [+nasal], and to attach to them the rule feature <– MS1>, so that this specification will not be reversed by MS1. Morphemes like [šānt] which violate generalization (b) will be marked in the lexicon with the rule feature <– P2>. Exceptions to generalization (c), such as [imtihān] and [simt] will be listed with their aberrantly non-homorganic /m/ already specified as [+grave]; again a rule feature, this time <– MS3>, will prevent these morphemes from undergoing a general rule of the language.[17] Finally, forms such as [kārəṇ], [guṇ], and [prāṇ] will be entered in the lexicon with their retroflex nasal consonants already specified [–grave, + diffuse, + flat] and with the rule feature < – MS2>. The correctness of our approach is perhaps suggested by the fact that individual speakers of Hindi-Urdu often use pronunciations such as [həsnā], [kārən], [gun], and [prān], i.e. ones which conform exactly to the general rules that we have postulated. The behaviour of these individuals can be ascribed to the frequently observed phenomenon of grammar simplification, for in each case all that is required to obtain their pronunciation is the deletion of the special rule feature.[18] That words such as [šānt], [kāreṇ] [guṇ], and [prāṇ], on the one hand, and [imtihān] and [simt], on the other, should be treated as exceptions is further substantiated by the fact that native speakers of Hindi-Urdu have no difficulty in recognizing the Sanskrit origin of the former and the Arabo-Persian origin of the latter.

17. The facts that exceptions to MS1 cannot undergo MS2, and that exceptions to MS3 are also exceptions to P3, can be expressed by two redundancy rules : [–MS1] → [–MS2], and [–MS3] → [–P3]. Rules of the form[–Rule X] → [–Rule Y]' are introduced by Kiparsky 1968b as a device for capturing the 'hierarchy of foreignness' which exists in the vocabulary of a given language.

18. According to King (1968:129), a similar deletion of a morpheme feature from a lexical entry is responsible for the 'analogical' change of English *bring, brought, brought* to *bring, brang, brung*.

5. One of the most serious shortcomings associated with descriptive work done in the taxonomic framework was the failure of this approach to distinguish between the exception and the rule. Just as item-and-arrangement morphemics failed to make the fundamental distinction between suppletion and regular morphophonemic alternation, taxonomic phonemics regarded minimal pairs as conclusive evidence for the existence of particular phonemes, regardless of whether the cited forms were at all representative of the language under investigation.[15] Generative phonology, however, as Srivastava points out (1969 : 921-2), parts company with taxonomic phonemics on this matter. Concern for the over-all economy of the grammar prompts the generative phonologist to exclude atypical lexical items from undergoing the rules postulated to account for the shape and behavior of the typical morphemes of the languages. In the formulation of Rules P2-5 we have, therefore, made no attempt to accommodate exceptions to generalization (a) such as [hə̃snā], and [gə̃wānā],[16] or exceptions to generalizations (b)–(e) such as [šānt], [imtihān], [simt], [kārəṇ], [guṇ], and [prāṇ]. To have done so would have ment complicating our rules to an unacceptable extent and obscuring generalizations which are valid for the great majority of words in the language. Instead, we propose to enter the root morphemes of verbs like [hə̃snā]

15. This, of course, often led to very large phoneme inventories. It is, for example not at all unusual in the taxonomic literature on Hindi-Urdu to find analyses which posit four different nasal consonant phonemes /m n ṇ ŋ/ in addition to a phoneme of nasalization /˜/; cf. Dixit 1963, Kelkar 1968, and Mehrotra 1968.

16. If a thorough examination of the Hindi-Urdu lexicon were to uncover no examples of a morphene containing the sequence [ənw], a rule converting underlying /anw/into [ãw] might offer an acceptable way of deriving the nasalized vowel of [gə̃wānā] as well as that of a number of other words, including [kə̃wəl] 'lotus', [bʰə̃wər] 'whirlpool', and [sə̃wārnā] 'to decorate,. For the time being, however, we prefer the treatment of these words as simple exceptions to MS1.

(12) $cĀ \begin{bmatrix} +cns \\ +nas \end{bmatrix} d$ – (MS1) → $cā \begin{bmatrix} +cns \\ +nas \end{bmatrix} d$ – (MS2) → $cā \begin{bmatrix} +cns \\ +nas \\ +dif \\ +flt \end{bmatrix}$

d – (MS3) → *cānd* – (P2 → *cā̃d* → . . . → [*cā̃d*] 'moon'.

Derived in like manner are the long nasalized vowels in [ṭā̃g] 'leg', [sā̃p] 'snake', [dā̃t] 'tooth', [sā̃s] 'breath', [ū̃ṭ] 'camel', [sū̃ṛ] 'elephant's trunk', [ū̃cā] 'high', [gʰū̃ṭ] 'sip,' [ī̃ṭ] 'brick', [nī̃d] 'sleep', [sī̃g] 'horn', [gē̃d] 'ball', [pʰē̃knā] 'to throw', [tē̃duā] 'panther', [jʰē̃pnā] 'to be ashamed or shy', [ǣ̃ṭʰ] 'wreathe' (verb stem), [gʰō̃slā] 'nest', [gʰō̃p] 'thirst', [hō̃ṭ] 'lip', [sō̃ṭʰ] 'dry ginger', [sɔ̃f] 'anise', [bʰɔ̃k] 'barking'.

(13) $\begin{bmatrix} +cns \\ +nas \\ +grv \end{bmatrix} Ā$ — (MS1) → $\begin{bmatrix} +cns \\ +nas \\ +grv \end{bmatrix} ā$ – (MS2) → *mā* – (P4) → *mā̃* →

. . . → [mā̃] 'mother'

Derived in like manner are the long nasalized vowels in [mē̃] 'in', [mǣ̃] 'I'.

(14) $d^hŪĀ \begin{bmatrix} +cns \\ +nas \\ -grv \end{bmatrix}$ – (MS1) → $d^huā \begin{bmatrix} +cns \\ +nas \\ -grv \end{bmatrix}$ – (MS2) → *dʰūān* – (P5)

→ *dʰūā̃* → . . . → [dʰūā̃] 'smoke'.

Derived in like manner are the long nasalized vowels in [kuā̃] 'well', [kʰəṛāū̃] 'wooden sandal', [yəhā̃] 'here', [kəhā̃] 'where', [jehā̃] 'wherever', [ləṛkō̃] 'boys' [obl. pl.], [ləṛkiyā̃] 'girls' (dir. pl.), [mēzē̃] 'tables' (dir. pl.), [kərū̃] '(I may) do', [pā̃cwā̃] 'fifth'.

The vast majority of nasal consonants and vowels encountered in Hindi-Urdu at the systematic-phonetic level can be derived according to one of the fourteen patterns presented above. There remain, however, a number of words whose phonetic realizations cannot be obtained by means of the rules which we have postulated thus far. In §5 we shall examine some of these exceptions and consider how they might best be treated in a generative phonology.

Derived in like manner are the [n]'s before fricatives in [tenzīm] 'organizaton', [unfuwān] 'beginning', [ənfās] 'breaths', [mənzil] 'inn, caravansary', [mənsūb] 'connected', [mənšūr] 'diffused', [mənsəb] 'office', [mənzər] 'aspect, sight', [hens] 'swan, goose', [enš] 'portion', [uns] 'friendliness', [insān] 'man', [inšā] 'writing', [insāf] 'justice', [sənsār] 'world',

(10) $\text{j}\bar{\text{A}}\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\-\text{grv}\end{bmatrix} + \rightarrow \text{k}\bar{\text{A}}\text{r}$ – (MS1) → $\textit{jā}\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\-\text{grv}\end{bmatrix}$ + *kār* – (MS2) →

jān + *kār* (unaffected by P3 because of the presence of '+') → . . . → [jānkār] 'clever, experienced'

Derived in like manner are the morpheme-final [n]'s in [din/kər] 'weaver', [gun/gun/ā/nā] 'to hum, buzz', [pən|gʰəṭ] 'quay from which water is drawn', [tin|kā] 'a bit of dry grass',[14] [dunk|kā] 'crumb', [mən|kā] 'bead', [kən|ṭōp] 'helmet covering the ears', [ən|jān] 'unknown', [ən|bʰəl] 'misfortune', [ən|pəṛʰ] 'illiterate', [en|bən] 'discord, enmity', [qānūn|gō] 'revenue official', [xəzan|cī] 'treasurer', [bʰān|jā] 'sister's son', [kən|kəwwā] 'paper kite', [gʰin|gʰin|ā|nā] 'to hate'.

(11) $\textit{kĀ}\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\+\text{grv}\end{bmatrix}$ + *dĀr* – (MS1) → $\textit{kā}\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\+\text{grv}\end{bmatrix}$ + *dār* → (MS2) → *kām* + *dār* (unaffected by P3 because of the presence of '+') → . . . → [kāmdār] 'manager'

Derived in like manner are the morpheme-final [m]'s in [gʰūm|tā] 'strolling' (masc. sg.), [səm|tā] 'equality', [kəm|jōr] (=[kem|zōr] 'feeble', [cūm|kər] 'having kissed'.

14. The exact meaning of the suffix [kā] in [thinkā] 'a bit of dry grass', [dunkā] 'crumb', and [mənkā] 'bead' is difficult to determine. However, the fact that all three of these words denote something very small suggests that their [kā]-suffix may have diminutive force, as it does in [pəšukā] 'a small animal' (< [pəšu] 'animal'); cf. Kellogg (358).

Derived in like manner are the homorganic [ŋ]'s in [rəŋg] 'color', [reŋgīlā] 'colorful',[13] [rəŋgāwət] 'coloring', [seŋkōc] 'reserve, shrinking', [pəŋkʰ] 'feather', [səŋkʰiyā] 'arsenic', [šəŋkā] 'doubt', [šeŋkərā] 'name of a musical mode', [səŋg] 'together', [təŋg] 'narrow', [jəŋgəl] 'jungle', [ciŋgʰāṛ] 'roar', [uŋglī] 'finger', [əŋgiyā] 'bodice', [eŋgūr] 'grape', [bʰəŋg] 'hemp', [kəŋgāl] 'poor', [ləŋgūr] 'a kind of monkey', [bəŋgāl] 'Bengal', [kəŋgʰī] 'comb', [ləŋgōt] 'loincloth', [ləŋgṛā] 'lame'.

$$(8) \quad I \begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix} qIb\ \bar{A}z - (\text{MS1}) \rightarrow i \begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix} qib\bar{a}z - (\text{MS2}) - i \begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\+\text{dif}\\-\text{flt}\end{bmatrix} qibaz - (\text{MS3}) \rightarrow$$

inqibāz → . . . [inqibāz] 'detention'

Derived in like manner are the non-homorganic [n]'s before [q] in [ənqā] 'a fabulous bird', [inqisām] 'division', [inqilāb] 'revolution', [munqəṣim] 'divided', [menqūš] 'printed', [tenqīh] 'cleaning'.

$$(9) \quad \text{j}I \begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix} s - (\text{MS1}) \rightarrow \text{ji} \begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix} s - (\text{MS2}) \rightarrow \text{ji} \begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\+\text{dif}\\-\text{flt}\end{bmatrix} s - (\text{MS3}) \rightarrow jins$$

→ . . . → [jins] 'species'

13. In a more complete phonology of Hindi-Urdu, a low-level phonetic rule operating after the application of the rules of stress placement would convert the derivatives of [rəŋg] 'color' transcribed here as [rəŋgīlā] and [rəŋgāweṭ] into [rə̃ˈgīlā] and [rə̃ˈgāwəṭ]. This rule would read approximately as follows : shwa is nasalized and a following nasal consonant is deleted in pretonic position before a homorganic voiced stop. The alternation of shwa plus nasal consonant with nasalized shwa which is exhibited by [rəŋg] and its derivatives with shifted stress would also be visible in [ˈəŋg] 'body, limb' vs. [ə̃ˈgūṭʰā] 'thumb' and [ə̃ˈgūṭʰī] 'ring'; [ˈbʰəṇg] 'hemp' vs. [bʰə̃ˈgērā] 'maker of the beverage [ˈbʰəŋg]'; [ˈtəŋg] 'tight' vs. [tə̃giˈyānā] 'to tighten'; [ˈəndʰ] 'blind' vs. [ə̃ˈdʰērā] 'dark' and; [ə̃ˈdʰērī] 'darkness'; [ˈsəŋg] 'stone' vs. [sə̃ˈgin] 'stony, hard'.

'blind', [əndēše] 'consideration', [səndēsā] 'news, tidings', [tund] 'sharp', [jəntər] 'instrument', [gəndā] 'dirty', [cindī] 'fragment', [sənt] 'saint', [pənt^h] 'way', [cəndən] 'sandalwood', [d^{h}ənd^{h}ā] 'business', [d^{h}und^{h}lā] 'foggy', [məndā] 'sluggish', [cəndiyā] 'crown of the head'.

(5) $dA \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{ṇas} \end{bmatrix} ḍ$ – (MS1) → $ḍa \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{ṇas} \end{bmatrix} ḍ$ – (MS2) → $ḍa \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{nas} \\ +\text{dif} \\ -\text{flt} \end{bmatrix}$

$ḍ$ – (MS3) → *ḍanḍ*

– (P3) → *ḍanḍ* → . . . → [ḍeṇḍ] 'punishment'

Derived in like manner are the homorganic [ṇ]'s in [ḍəṇḍā] 'staff', [cəṇḍāl] 'degraded person, [ṭuṇḍ] 'stump of a branch or an arm', [məṇḍəl] 'disc of the sun or moon', [məṇḍī] 'market', [təṇḍ] 'dancing', [ləṇḍūrā] 'without a tail', [piṇḍā] 'body', [pəṇḍit] 'learned man', [b^{h}iṇḍī] 'okra, [luṇḍ muṇḍ] 'crippled, [ḍ^{h}əṇḍ^{h}ōrcī] 'public crier'.

(6) $mU \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{nas} \end{bmatrix} j$ – (MS1) → $mu \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{nas} \end{bmatrix} j$ – (MS2) → $mu \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{nas} \\ +\text{dif} \\ -\text{flt} \end{bmatrix}$

j – (MS3) → *munj*

– (P3) → muɲj → . . . → [muɲj] 'a sort of grass'

Derived in like manner are the homorganic [ɲ]'s in : [meɲc] 'stage, platform' [guɲj] 'humming of bees', [pəɲjāb] 'the Punjab', [məɲj^{h}lā] 'middle', [geɲj] 'marketplace', [cəɲcəl] 'sportive', [səɲjōg] 'conjunction', [səɲjīdgī] 'seriousness', [rəɲjīdə] 'grieved', [ɣuɲce] 'bud', [pəɲc^{h}ī] 'bird', [zəɲjīr] 'chain'.

(7) $zA \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{nas} \end{bmatrix} g$ – (MSI) → $za \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{nas} \end{bmatrix} g$ – (MS2) → $za \begin{bmatrix} +\text{cns} \\ +\text{nas} \\ +\text{dif} \\ -\text{flt} \end{bmatrix}$

g – (MS3) → *zang*

– (P3) → *zaŋg* → . . . → [zeŋg] 'rust'

Derived in like manner are the [n]'s in [nām] 'name', [nəgər] 'town', [nāk] 'nose', [nišān] 'mark', [nōṭ] 'bank note', [duniyā] 'world', [binā] 'without', [minəṭ] 'minute', [cīn] 'China', [zəmīn] 'land', [pɔ̄n] 'three-quarters', [ūn] 'wool', [ǣn] 'exact', [bəniyān] 'undershirt'.

$$(3)\quad lA\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix}b+\bar{A}\text{ - (MS1)}\rightarrow la\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix}b{+}\bar{a}\text{ - (MS2)}\rightarrow$$

$$la\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\+\text{dif}\\-\text{flt}\end{bmatrix}\text{b+ā - (MS3)}\rightarrow$$

lanb + ā – (P3) → *lamb + ā* → ... → [ləmbā] 'tall'

Derived in like manner are the homorganic [m]'s in [əmbər] 'ambergris', [əmbī] 'green mango', [imbisāt] 'joy', [əmbār] 'heap', [təmbākū] 'tobacco', [təmbū] 'tent', [cəmpət] 'invisible', [cəmpā] 'a kind of flower', [dumbālā] 'the outer corner of the eye', [kumbā] 'family',[12] [əcəmbʰā] 'surprise', [təmbōl] 'betel leaf', [təmbūrā] 'gourd, tamboura'.

$$(4)\quad hI\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix}d\bar{U}\text{ - (MS1)}\rightarrow hi\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\end{bmatrix}d\bar{u}\text{ - (MS2)}\rightarrow hi\begin{bmatrix}+\text{cns}\\+\text{nas}\\+\text{dif}\\-\text{flt}\end{bmatrix}$$

dū – (MS3) → hindu → ... → [hindū] 'Hindu'

Derived in like manner are the homorganic [n]'s in [zindān] 'prison', [zindəgī] 'life', [rind] 'libertine', [rundʰnā] 'to be restrained', [əndāz] 'style', [indr] 'Indra, the king of the gods', [indū] 'moon', [əndʰā]

12. The alternate pronunciation of this word as [kunbə] which is common among Urdu speakers is perhaps the result of the kind of re-interpretation of an unfamiliar vocabulary item which Hockett (1958.287) calls 'metanalysis'. The first three segments of the word may have been misconstrued by Muslim speakers of Urdu as Arabic [kun]—which begins the familiar line from the sacred text [kun fa yakun]—while the last two segments may have been re-interpreted as the initial morpheme of such Persian expressions as [bə-āsānī] 'with ease', [bə-ədəb] 'polite', and [bə-xudā] 'by God'. The presumed presence of a morpheme boundary between the third and fourth segments would account for the failure of the nasal consonant to assimilate to the following bilabial stop in point of articulation.

P5 accounts for the nasalized vowels in the words of Groups II and III while leaving unaffected such forms as [ān] 'honor', [ūn] 'wool', [ǣn] 'exact', [ām] 'mango', [jān] 'life', [kām] 'work', [hīn] 'inferior', [hēm] 'snow, gold' [yān] 'a kind of conveyance', [yām] 'a period of three hours', [imtihāṇ] 'test', [bəniyān] 'undershirt' and [dʰənwān] 'wealthy' (< underlying/ dʰan#wān/, with an internal word boundary). Of the four groups of words with final nasalized vowels, it is only the last and smallest which cannot be derived by means of P4 and P5. [hā̃] and [yū̃] will accordingly have to be entered in the lexicon with their vowels already specified as [nasal] and with a special morpheme feature <—MS1>.

With the presentation of P4 and P5, we have completed what we set out to do in this section. We have demonstrated that it is possible to construct a generative phonology of Hindi-Urdu in which nasality is redundant for vowels and in which the number of nasal consonants that must be distinguished in the lexicon is reduced to two: /m/ and /n/ (representable as the feature bundles[+consonantal, +nasal, +grave] and [+consonantal, +nasal, −grave], respectively). Some sample derivations will serve to clarify our approach:[11]

$$(1)\ \begin{bmatrix}+\text{cns}\\ +\text{nas}\\ +\text{grv}\end{bmatrix} At-(\text{MSI}) \rightarrow \begin{bmatrix}+\text{cns}\\ +\text{nas}\\ +\text{grv}\end{bmatrix} at-(\text{MS2}) \rightarrow mat \rightarrow \dots \rightarrow$$ [mət] 'not' (used with imperatives)

Derived in like manner are the [m]'s in milnā 'to meet', [mirc] 'pepper', [mātʰā] 'forehead', [məšhūr] 'famous', [məsjid] 'mosque', [mēz] 'table', [sāmān] 'baggage', səlām (a Muslim greeting), [həmēšə] 'always', [sumriti] 'recollection', [əmrūd] 'guava' [umr] 'age, lifetime', [imlī] 'tamarind tree', [kəmlā] (an epithet of the goddess Lakshmi).

$$(2)\ \begin{bmatrix}+\text{cns}\\ +\text{nas}\\ -\text{grv}\end{bmatrix} Ad+\bar{I}-(\text{MS1}) \rightarrow \begin{bmatrix}+\text{cns}\\ +\text{nas}\\ -\text{grv}\end{bmatrix} ad\text{-}\bar{\imath}-(\text{MS2}) \rightarrow nad+\bar{\imath} \rightarrow \dots \rightarrow$$ [nədi] 'river'

11. Throughout the sample derivations, capital letters are used to represent vowels with no specification for the feature [nasal]. The letters *m, n, ṇ, ɲ, ŋ,* refer only to segments which are distinctively specified for all three of the features [grave], [diffuse], and [flat].

Group II:

[dʰūā̃] 'smoke', [kuā̃] 'well'.

Group III:

[pā̃cwā̃] 'fifth' (<[pā̃c] 'five'), [dəswā̃] 'tenth' (<[dəs] 'ten'), [yəhā̃] 'here', [kəhā̃] 'where', [ləṛkō̃] (obl. pl. of [ləṛkā] 'boy'), [mēzē̃] (dir. pl. of [mēz] 'table'), [kərū̃] (1sg. subj. of [kərnā] 'to do').

Group IV:

[hā̃] 'yes', [yū̃] 'thus'.

It will be recalled that P2, the only source of nasalized vowels posited by us thus far, transforms underlying sequences of long vowel plus nasal consonant into long nasalized vowels only when followed by a consonant belonging to the same morpheme. Morpheme-final nasalized vowels are thus not derivable. Fortunately this deficiency in our analysis can be largely overcome by the addition of two rather simple, if somewhat ad hoc, rules. The first of thes, P4, expoits the absence of any Hindi-Urdu morpheme consisting of /m/ followed by a long oral vowel; it states that morphemes made up of /m/ plus long vowel are realized phonetically with nasalization throughout:

$$(\text{P4})\begin{bmatrix}+\text{syllabic}\\+\text{tense}\end{bmatrix}\rightarrow[+\text{nasal}]\ /\ +m\text{—}+$$

Accordingly, P4 accounts for the morpheme-final nasalized vowels in the words of Group I above. The second rule, P5, states that an underlying sequence of long vowel plus nasal consonant is realized as a long nasalized vowel if it stands in word-final position after a vowel or if, either alone or with a preceding glide, it constitutes an inflectional or derivational suffix:

$$(\text{P5})\underset{1}{\begin{Bmatrix}[+\text{syllabic}]\\ [\ ]+([-\text{consonantal}])\end{Bmatrix}}\underset{2}{\begin{bmatrix}+\text{Syllabic}\\+\text{tense}\end{bmatrix}}\underset{3}{[+\text{nasal}]}\underset{4}{\#}$$

$$\Rightarrow 1\ \underset{2}{[+\text{nasal}]}\ \underset{3}{\varnothing}\ 4$$

Hence, generalization (e) has already been incorporated into our description.

To account fully for generalization (f), we must posit a third morpheme structure rule.

(MS3) [+nasal] → [–grave]/ — [+obstruent]

This rule specifies a nasal consonant as [–grave] if it stands before an obstruent, and, coupled with MS2, will convert /N/ (i.e. the feature bundle [+consonantal, +nasal] into/n/ (i.e. the feature bundle [+consonantal], +nasal, –grave, +diffuse, –flat]) in the environment 'before an obstruent'. Since P3 does not affect nasal consonants before uvulars or fricatives, /n/ (< MS3) will not be assimilated to a following /q/ or non-dental fricative. Generalization (f) has thus been built into our phonology.

At the beginning of this section, we claimed that it is possible to derive the large inventory of nasal consonants and vowels which characterize Hindi-Urdu at the level of systematic phonetics from underlying representations containing far fewer nasal segments. Proceeding from a number of observations about the distribution of the nasal segments at the level of systematic phonetics, we have succeeded in formulating three morpheme structure rules (MS1-3) and two phonological rules (P2-3) which, to a large degree, justify our initial claim.[10] We have attempted to show that, with relatively few exceptions, all the nasal consonants and vowels of Hindi-Urdu can be derived from underlying representations in which only two nasal segments /m n/ are distinguished. Before we can turn our attention to other matters, we must, however, give some consideration to an important set of words whose morpheme-final nasalized vowels have thus far been ignored. These words include:

Group I:

[mā̃] 'mother', [mẽ] 'in', [mæ̃] 'I'.

---

10 The esential difference btween morpheme structure rules and phonological rules is assumed in this study to lie in the fact that the former fill in feature specifications left blank in the lexicon, while the latter switch existing specifications.

natural class of nasal consonants, then the word [ā̃kʰ] 'eye' could be listed in the lexicon simply as /ĀNkʰ/. MS1 would convert this underlying representation into [āNkʰ]. P2 would then complete the derivation, yielding the desired output [ā̃kʰ]

P3 captures generalization (c) by making a nasal consonant conform in point of articulation to a following stop which belongs to the same morpheme and is non-uvular. Rule P3 can, however, also be made to account for generalization (d). All we have to do to insure this is to construct our phonology in such a way that only two nasal consonants (/m and /n/) are distinguished at the level of systematic phonemics. If, in other words, the six points of articulation exhibited by the oral stops/p t ṭ c k q/ are specified in the manner shown below, the lexicon must contain no nasal consonants with the value [–diffuse] or [+flat];[9]

	p	t	ṭ	c	k	q
Grave	+	–	–	–	+	+
Diffuse	+	+	+	–	–	–
Flat	(–)	–	+	(–)	–	+

This constraint on the inventory of systematic phonemes will manifest itself as a segment structure rule, stating that all nasal consonants are redundantly [+ diffuse, – flat]:

$$\text{(MS2)}\ [+\text{nasal}] \rightarrow \begin{bmatrix} +\text{diffuse} \\ -\text{flat} \end{bmatrix}$$

This makes P3 the only source of phonetic [ŋ ɲ ṇ], and generalization (d) is thus implicit in our phonology.

Since MS2 and P3 restrict the occurrence of phonetic [ŋ ɲ ṇ], to morphemes in which they are followed by homorganic stops, P2 effectively excludes the possibility that any of these three segments could ever be preceded by a long vowel. This follows from the fact that P2 deletes any nasal consonant which occurs in a morpheme where it is preceded by a long vowel and followed by a consonant.

9 Such exceptions as do occur (e.g. [kārən], [guṇ], [prāṇ]) will be treated in §5.

captured by the following two phonological rules:

(P2) (morpheme-level)

$$\begin{bmatrix}+\text{syllabic}\\+\text{tense}\end{bmatrix}[+\text{nasal}]\,C \Rightarrow [+\text{nasal}]\varnothing 3$$

$$\begin{matrix}1 & \quad 2 & 3 & \quad 1 & 2\end{matrix}$$

(P3) (morpheme-level)

$$\begin{bmatrix}+\text{consonantal}\\+\text{nasal}\end{bmatrix} \rightarrow \left\{\begin{matrix}[-\text{next rule}]/\!-\!\begin{bmatrix}-\text{diffuse}\\+\text{flat}\end{bmatrix}\\ \begin{bmatrix}\alpha\text{grave}\\\beta\text{diffuse}\\\gamma\text{flat}\end{bmatrix}/\!-\!\begin{bmatrix}+\text{obstruent}\\-\text{continuant}\\\alpha\text{grave}\\\beta\text{diffuse}\\\gamma\text{flat}\end{bmatrix}\end{matrix}\right\}$$

Aside from P2, no special rule is required to capture generalization (a) if we assume that there are, in principle, no nasalized vowels present in the lexicon of Hindu-Urdu. This assumption would, of course, be made explicit in the phonology of the language by the presence of a redundancy rule in the morpheme structure component:

(MS1) [–consonantal] → [–nasal]

This rule states that all non-consonantal segments are redundantly [–nasal]. The exeptional character of morphemes containing short nasalized vowels is then implicit in the fact that P2, the only source of phonetic nasalized vowels, affects only long vowels. In §5 we shall return to the exceptional forms cited under generalization (a), and show that they can be handled in an intuitively satisfactory way.

P2 captures generalization (b) by deleting any nasal consonant whose presence at the level of systematic phonetics would violate the distributional constraint contained therein. Hence, if we let /Ā/ stand for the bundle of features which defines a low long vowel with no specification for nasality, and let /N/ represent the bundle of features defining the

(a) While long nasalized vowels abound in Hindi-Urdu, short nasalized vowels do not occur except in a small number of words, e.g. :

[hə̃snā] 'to laugh', [gə̃wānā] 'to lose';

[mũh] 'mouth', [mɛ̃h] 'rain';

[mɛ̃hdī] 'henna', [mɛ̃hgā] 'expensive, [mɛ̃hgāī] 'expensiveness', [lɛ̃hgā] 'a kind of skirt', [bɛ̃hgī] 'pole with slings on both ends for carrying loads';

[kʰĩcnā] 'to be pulled', [kʰĩcāī] '(wages for) pulling', [sĩcnā] 'to be irigated', [sĩcāī] 'irrigation', [pʰĩkwānā] 'to cause to be thrown', [pʰũknā] 'to be blown', [sĩknā] 'to be roasted', [ḍʰə̃pnā] 'to be covered', [ũcāī] 'height', [sə̃pērā] 'snake charmer', [gə̃ṭhṛī] 'knotted bundle', [gə̃ṭhīlā] 'knotty muscular', [gə̃wei] 'village population', [bə̃tāī] 'distribution', [bə̃twāī] 'wages for distributing something.

(b) Within a morpheme, long vowels never occur before consonant clusters of which the first member is a nasal consonant. Exception : [šānt] 'quiet'.

(c) Within a morpheme, a nasal consonant must agree in point of articulation with a following non-uvular stop. Exceptions to this generalization are :

[imtihān] 'test', [simt] 'direction';

[cəmkīlā] 'brilliant', [dəmkā] 'glistened' (masc. sg.), [ṭʰənkā] 'jingled' (masc. sg.), [cʰənkā] 'hissed' (masc. sg.), [səmjʰā] 'understood' (masc. sg.), [sənkī] 'whimsical', [simṭā] 'shrank' (masc. sg.) [pinkī] 'drowsiness'; [inkār] 'denial', [munkir] 'one who denies', [munkər] (name of an angel), [inkisār] 'humility', [inkišāf] 'disclosure', [munkišif] 'to be disclosed', [mənkūhə] 'married'.

(d) Velar, palatal, and retroflex nasal consonants occur exclusively before homorganic stops. Exceptions include [kārəṇ] 'cause', [guṇ] 'quality', [prāṇ] 'life'.

(e) Long vowels never occur before velar, palatal, or retroflex nasal consonants. An exception is [prāṇ] 'life'.

(f) Within a morpheme, the only nasal consonant which can occur before [q] or any frictive is [n].

The generalizations expressed above in words are

vowels plus nasal consonat.[8] Rules nasalizing the underlying oral vowels before nasal consonants and deleting the nasal consonants would be ordered after P1, so that words like [ā̃gənȭ] and [j^{h}ẽ̄gəṛȭ] would be derived approximately as follows:

Underlying forms	/āngan+ōn/	/j^{h}ēgaṛ+ōn
	↓	↓
P1	—	—
	↓	↓
Nasalization rules	[ā̃gan+ȭ]	[j^{h}ẽ̄gaṛ+ȭ]
	↓	↓
Rule converting [a] to [ə]	[ā̃gən+ȭ]	[j^{h}ẽ̄gəṛ+ȭ]

In the remainder of this study we shall investigate the phenomenon of nasalization in some detail, and we shall present additional arguments for treating the nasalized vowels as underlying oral vowels plus nasal consonant.

4. At the level of systematic phonetics, Hindi-Urdu possesses five nasal consonants [m n ṇ ɲ ŋ], plus nasalized vowels corresponding to each oral vowel. It is clear that the lexicon of the language would be extremely costly to describe if the inventory of systematic phonemes were equally large. Each vowel segment in the lexicon would have to contain a distinctive specification of plus or minus for the feature [nasal], and the nasal consonants would have to be distinctively specified for features whose values could be left blank in a less extensive phonemic system. A number of generalizations can be made, however, about the distribution of the nasal consonants and vowels at the level of systematic phonetics. As we shall demonstrate in this section, these generalizations enable us to predict the nasality value for vowels and, to a large degree, the point of articulation for the nasal consonants. Some of these generalizations are listed below :

8 This practice would be entirely consistent with all previous work in generative phonology; cf. Harms (1968:36): 'In the systematic phonemic analyses of languages with nasal vowels (such as French, Igbo), the interpretation of these as vowel plus nasal consonant has consistently proved superior to the unit nasal vowel solution.'

a cluster analysis based solely on considerations of lexical economy. The real question is, after all, not whether a more economical lexicon can be achieved by means of the cluster solution, but rather whether it should be. We have no reason to believe that it should.

As indicated in our introductory remarks, P1 affords a certain insight not only into the nature of aspiration in Hindi-Urdu, but into the nature of nasalization as well. Consider, for example, what happens when the oblique plural ending [ō̃] is added to such nouns as [ā̃gən] 'courtyard', [j^{h}ā̃j^{h}ər] 'anklet', [j^{h}ē̃gəṛ] 'cricket', [b^{h}ā̃jək] 'ropemaker', and [sā̃b^{h}ər] 'refreshments for a journey'. Most native speakers of Hindi-Urdu consistently pronounce these oblique plurals—in apparent contradiction to P1—with shwa intact. Now, one might argue that P1 is too general, in the same way that the rejected Rule 1e was too general, and that it must be restricted in its operation. This could be done simply by adding an extra feature specification to the first segment of its structural description. The resulting rule (P1′) is presented below :

$$(\text{P1}')\begin{bmatrix}+\text{syllabic}\\+\text{compact}\\-\text{tense}\end{bmatrix}\rightarrow \emptyset / \begin{bmatrix}\text{V}\\-\text{nasal}\end{bmatrix}\text{C} \;\text{—}\; \text{C}+\text{V}$$

I.e., a lax low vowel is deleted from a word in which it is preceded by the sequence 'oral vowel plus consonant' and followed by the sequence 'consonant plus vowel', provided that a morpheme boundary (+) intervenes between the latter two segments.

P1′ would account accurately for the retention of shwa in such oblique plural forms as [ā̃gənō̃], [j^{h}ā̃j^{h}ərō̃], [j^{h}ē̃gəṛō̃], [b^{h}ā̃jəkō̃] and [sā̃b^{h}ərō̃]. It is, however, quite unnecessary to complicate P1 in this manner. On the contrary, P1 requires no complication whatever, if we interpret systematic-phonetic nasalized vowels not as the realizations of underlying nasalized vowels, but as the realizations of underlying oral

Note that this conclusion is supported by the operation of the Hindi-Urdu rules of stress placement. While we are not prepared at this time to present a detailed account of these rules, there can be little doubt that the position of stress in a Hindi-Urdu word is determined largely by the syllable structure of that word.[7] In light of this fact, it is very significant that words such as [ədʰik] 'more' and [kidʰər] 'where, whither' are stressed like all other words of the form $C_0\breve{V}C\breve{V}C$ (cf. [nəˈzər] 'sight', [əˈləg] 'separate') on their second syllable, and not like words of the form $C_0\breve{V}CC\breve{V}C$ (cf. [ˈbilkul] 'quite', [ˈbəndər] 'monkey') on their first.

The fact that the aspirated consonants of Hindi-Urdu function as units with regard to a few phonological rules is in itself not sufficient evidence to justify treating them as units at the level of systematic phonemics. It is, for example, conceivable that there are other rules of the phonology which treat the aspirates as clusters and, in addition, have to be ordered before both P1 and the rules of stress assignment. In the absence of such rules, however, we can see no justification for disallowing the unit phoneme analysis. Harms' claim (1966:603-4) that the aspirated stops of Bengali should be treated as underlying clusters in order to simplify the lexicon seems to us to be rather empty. In Harms' own words (1968:8) : 'The way in which we count symbols in the phonology (or grammar) should reward those descriptions which are more reasonable hypotheses about the phonological (or grammatical) processes of the languages, and penalize those descriptions which are less reasonable.' To us, there is nothing intrinsically more reasonable about an analysis which regards the aspirates as systematic-phonemic clusters than about an analysis which treats them as systematic-phonemic units. Hence, even if the frequency figures which Harms cites for the aspirated stops of Bengali were identical for those of Hindi-Urdu, we would still reject

7 For some discussion of the relation of syllable structure to stress placment, see Masud Husain (n.d., 31-6).

brought to bear on this classical problem with varying results. Arguing from the standpoint of acoustic phonetics, Srivastava 1968 has recently re-affirmed the 'traditional' analysis of Indian grammarians, according to which the aspirates comprise single units. Working in the framework of generative phonology, however, Harms (1966:603) has argued (with reference to Bengali) that the predominance of unaspirated consonants in the lexicon would make the cluster interpretation more economical and hence better. P1 now gives us an additional criterion by which to judge the relative merits of these conflicting positions: we may check to see how the consonants in question function with respect to P1. All we need do is take some stems which end in a sequence of the form $VC^{h}{}_{ə}C$ or $VC_{ə}C^{h}$ and see what happens when they stand before suffixes with initial vowels. If native speakers pronounce the stem morphemes in this situation without [ə], we shall have good evidence that aspirated consonants function as single segments in Hindi-Urdu. If, on the other hand, such morphemes retain [ə], we shall have a clear indication that the aspirated consonants function as clusters. Below are some stems of the kind needed for our experiment :

$VC^{h}{}_{ə}C$-type:

[bæṭ^{h}ək] 'meeting, sitting' (noun)
[pig^{h}əl] 'thaw' (verb stem)

$VC_{ə}C^{h}$-type:

[səməj^{h}] 'understand' (verb stem)
[uləj^{h}] 'quarrel' (verb stem)

Adding appropriate suffixes, we obtain the following forms:

[bæṭ^{h}kẽ] 'meeting, sittings'
[pig^{h}lā] 'thawed' (masc. sg.)
[səmj^{h}ā] 'understood' (masc. sg.)
[ulj^{h}ũ] '(I may) quarrel' (subj.)

We thus conclude that the aspirated consonants of Hindi-Urdu function as units at the point in the phonology where P1 applies.

If these words were represented at the level of systematic phonemics as simple concatenations of morphemes (i.e. as /ā + mar+ aṇ/, /ku + cal+ an/, /su+cal+an/, and /ā+gam+an/), nothing would prevent Rule 1d from applying to them and producing the incorrect phonetic forms *[āmrəṇ], *[kuclən], *[suclən] and *[āgmən].[6] Such underlying representations would not, however, do justice to the constituent structure of these forms, for in each case the two morphemes which follow the prefix comprise an independent word. Hence, on the same 'general syntactic grounds' which prompt Chomsky & Halle (95) to analyse English *resolve* 'solve anew' as /rE#sɔlv/ and *re-serve* 'serve anew' as /rE#sɪrv/, we would want to represent [āmərəṇ], [kucələn], [sucələn] and [āgəmən], at the level of systematic phonemics as /ā#mar+aṇ/, /ku#cal+an/, /su#cal+an/, and /ā#gam+an/. The internal word boundary (#) would then block the deletion of the vowel of the second morpheme by Rule 1d. It is interesting to note that essentially the same analysis has been proposed by Sharma & Vermeer (1963:4) in their pedagogical grammar of Hindi; their statement reads as follows: 'Präfixe... werden bei der Aussprache des nachkonsonantischen "a" wie eigene Wörter behandelt.'

3. In §1 of this study we discussed at length the proper formulation of an important rule of Hindi-Urdu phonology. In §2 we examined two groups of exceptions to the same rule. We now turn our attention to an assessment of the implications of incorporating this rule—which we shall henceforth refer to as P1—into our description of Hindi-Urdu.

It turns out that P1 is particularly relevant to the question of whether the aspirated consonants of Hindi-Urdu are best regarded as single units or as clusters of unaspirated consonant plus /h/. A number of arguments have been

6 Cf. Chomsky & Halle (1968:364) : 'a rule in which the presence of formative boundary is not explicitly indicated applies also to strings containing any number of formative boundaries.' ('Formative boundary' is Chomsky & Halle's term for a 'morpheme boundary'.)

of /a/ (> [ə]) when inflectional endings are added to the forms on the right. This would be completely unwarranted, since the speakers of Urdu who pronounce the derived forms in /ī/ as given above use the following oblique plural forms :

Noun singular	Oblique plural
[fələk]	[fəlkō̃]
[nəzər]	[nəzrō̃]
[xəbər]	[xəbrō̃]
[ərəb]	[ərbō̃]
[səfər]	[səfrō̃]
[bədən]	[bədnō̃]
[cəmən]	[cəmnō̃]
[dɛhən]	[dɛhnō̃]
[səmən]	[səmnō̃]
[šɛhər]	[šɛhrō̃]
[dāwət]	[dāwtō̃]
[sɛhər]	[sɛhrō̃]
[sāhəb]	[sāhbō̃]

That the morpheme feature <—Rule 1d> cannot be attached to the derivational suffix /ī/ is demonstrated by the previously cited forms [imārtī] 'architectural' (< [imārət] 'building'), (< [šərārti] 'wicked' (< [šərārət] 'wickedness'), and [dik^{h}awṭī] 'ostentatious' (< [dik^{h}awəṭ] 'ostentation'), all of which undergo 1d. We are thus forced to adopt solution (b) and to enter words like [fələki] as single morphemes.

The second group of exceptions to Rule 1d includes various words with prefixes. Examples of such words are :

[āmərəṇ] 'until death' ([ā] 'to, toward'; [mər] 'die'; [əṇ] 'nominalizing suffix')

[kucələn] 'bad character' ([ku] 'bad'; [cəl] 'walk'; [ən] 'nom. suffix')

[sucələn] 'good character' ([su] 'excellent'; [cəl] 'walk'; [ən] 'nom. suffix')

[āgəmən] 'coming' ([ā] 'to, toward';[5] [gəm] 'go'; [ən] 'nom. suffix')

5. The meaning of this prefix in derivatives of [gəm] is discussed briefly by Kellogg (372).

Two ways of handling these exceptional forms immediately come to mind : (a) Each base morpheme on the right could be marked in the lexicon with a special morpheme feature <—Rule 1d> which would exempt the /a/ (> [ə]) of its second syllable from deletion before the suffix /ī/.

(b) Each derived form on the left could be entered in the lexicon as a single morpheme, i.e. without the morpheme boundary (+) required by the structural description of Rule 1d.

Since the derived forms on the left are not unique to Urdu, but are also found in Persian and Arabic, it is perhaps not unreasonable to assume that they were not derived anew by speakers of Urdu, but rather adopted as separate unanalysed lexical items. It is, for example, entirely possible that in some cases the forms on the left represent older borrowings into Urdu than the corresponding forms on the right. Viewed in this light, alternative (b) might be said to reflect the historical situation more accurately than alternative (a). Whether alternative (b) represents the better way of treating these forms in the synchronic phonology of Urdu is, of course, a question which must be resolved on purely synchronic grounds.

As it turns out, there is a strong synchronic argument in favor of solution (b) : solution (a) simply does not work. Providing the base morphemes on the right with a morpheme feature <—Rule 1d> would, to be sure, achieve the immediate goal of exempting the derived forms on the left from being realized phonetically as *[fəlkī], *[nəzrī], *[xəbrī], *[ərbī], *[səfrī], [bədnī], *[cəmnī], *[dɛhnī], *[səmnī], *[šɛhrī], *[dāwtī], *[sɛhrī], and *[sāhbī].[4] It would, however, have a very undesirable effect as well, for it would also prevent the loss

4. Most speakers of Hindi-Urdu would regard these asterisked pronunciations as perfectly normal. It should be recalled that we are dealing at the moment solely with the speech of educated speakers of Urdu.

2. To the best of our knowledge, 1d represents the optimal form of the /a/- deletion rule.[3] But this is not to say that Rule 1d is without exception in its operation. Words which are exempted from undergoing its structural change while seemingly satisfying its structural description are, however, restricted by and large to two easily identified groups of lexical items. The first group consists of certain derived nouns and adjectives of Arabo-Persian origin as pronounced by educated speakers of Urdu. Some of these forms are listed below, along with the stems from which they are derived :

Derived Forms	Stems
[fələkī] 'pertaining to the sky' (adj.)	[fələk] 'sky' (noun)
[nəzərī] 'visual'	[nəzər] 'vision'
[xəbərī] 'pertaining to the news'	[xəbər] 'news'
[ərəbi] 'Arabian'	[ərəb] 'Arab'
[səfərī] 'of the journey'	[səfər] 'journey'
[bədənī] 'of the body'	[bədən] 'body'
[cəmənī] 'of the garden'	[cəmən] 'garden'
[dɛhənī] 'of the mouth'	[dɛhən] 'mouth'
[səmənī] 'pertaining to jasmine'	[səmən] 'jasmine'
[šɛhərī] 'urban'	[šɛhər] 'city'
[dāwətī] 'invitational'	[dāwət] 'invitation'
[sɛhərī] 'of the morning'	[sɛhər] 'morning'
[sāhəbī] 'rule' (noun)	[sāhəb] 'lord' (noun)

[3] Srivastava (1969:919) has collapsed this rule with one of somewhat dubious synchronic motivation and arrived at the following formulation:

$$\begin{bmatrix} \text{V} \\ -\text{tns} \\ +\text{low} \end{bmatrix} \rightarrow \emptyset \ /(\text{C})\text{VC}\text{---}\left(\text{C}\begin{bmatrix} \text{V} \\ +\text{tns} \end{bmatrix}\right)\#$$

We reject this formulation on several grounds. First, the requirement that the syllable which follows the deleted segment contain a tense vowel prevents Srivastava's rule from accounting for the alternation of shwa with zero in the forms [mūrət] vs. [mūrti]. Second, the presence of '#' (word boundary) immediately after this tense vowel makes the rule incapable of describing the loss of [ə] in such forms as [niklēgā]. (< [nikəlnā], [ulṭānā]. (< [uləṭnā], and [cəmkīlā] (< [cəmək]). Finally, the absence of an obligatory morpheme boundary '+' in the structural description of Srivastava's rule results in the unwarranted deletion of [ə] from forms like the old name of Benares : [wārāṇəsī].

Although Rule 1c accounts accurately for the loss of [ə] (< underlying /a/) in all the shwa-less forms that have been examined thus far, it nevertheless contains a serious flaw. A glance at the pairs of inflectionally and derivationally related forms below will show that Rule 1c is too general in its application :

Forms without suffixes	Forms with suffixes
[dərəxt] 'tree'	[dərəxtȭ] 'trees' (obl. pl.)
[pələng] 'bed'	[pələngȭ] 'beds' (obl. pl.)
[sundər] 'beautiful'	[sundərī] 'beautiful woman'
[pustək] 'book'	[pustəkẽ̄] 'books'
[əkšər] 'letter'	[əkšərȭ] 'letters' (obl. pl.)
[bərtən] 'container'	[bərtənȭ] 'containers' (obl. pl.)
[šətrənj] 'chess'	[šətrəŋjȭ] '(types of) chess' (obl. pl.)

If left unaltered, Rule 1c would require deletion of the [ə] which is present in the penultimate syllable of the forms on the right. Fortunately, however, this situation can be remedied quite easily. It will be noted that the examples just above, in which the deletion of /a/ has not taken place, differ sharply from all those cited previously to illustrate the loss of /a/. The difference lies in the fact that all the forms which have lost their /a/ had only a single consonant before and after the vowel in question, while all the forms which have retained their /a/ (> [ə]) had more than one consonant preceding or following that vowel. Our rule must therefore be reformulated so that it can no longer apply to an /a/ which stands next to a consonant cluster. Rule 1d embodies the necessary reformulation :

$$\text{(1d)} \begin{bmatrix} +\text{syllabic} \\ +\text{compact} \\ -\text{tense} \end{bmatrix} \rightarrow \emptyset \ /\mathrm{VC}\text{—}\mathrm{C} + \mathrm{V}$$

i.e., a lax low vowel is deleted from a word in which it is preceded by the sequence 'vowel plus consonant' and followed by the sequence 'consonant plus vowel', provided that a morpheme boundary (+) intervenes between the latter two segments.

$$(1b)\ \begin{bmatrix}+\text{syllabic}\\+\text{compact}\\-\text{tense}\end{bmatrix} \rightarrow \emptyset\ [C_0VC_1 — C_1 + V$$

I.e. a lax low vowel is deleted from the second syllable of dissyllabic roots when the latter are followed within the same word by a morpheme beginning with a vowel.

Even in its generalized form 1b, however, our rule still fails to account for all the cases in the phonology of Hindi-Urdu in which shwa alternates with zero.

Consider, for example, the following paris of words :

[kəbūtər] 'male pigeon'	[kəbūtrī] 'female pigeon'
[imārət] 'building' (noun)	[imārti] 'architectural' (adj.)
[šərārət] 'wickedness'	[šərārtī] 'wicked'
[siyāsət] 'politics' (sg.)	[siyāstõ] 'politics' (obl. pl.)
[səjāwaṭ] 'decoration' (sg.)	[səjāwṭẽ] 'decorations' (pl.)
[dikʰāwaṭ] 'ostentation'	[dikʰāwṭī] 'ostentatious'
[pujārən] (= [pujārin]) 'worshiper' (fem. sg.)	[pujārnõ] 'worshipers' (obl. pl.)
[məhārət] 'expertise'	[məhārtõ] 'expertise' (obl. pl.

Here the vowel which is realized phonetically as [ə] in the last syllable of the forms on the left has been deleted from the corresponding forms on the right, even though it does not meet that part of the structural description of Rule 1b which demands that it stand in 'the second syllable of a dissyllabic root'. It appears then that our rule is still not sufficiently general and that it must undergo a further revision. We thus arrive at Rule 1c :

$$(1c)\ \begin{bmatrix}+\text{syllabic}\\+\text{compact}\\-\text{tense}\end{bmatrix} \rightarrow \emptyset\ /VC_1 — C_1 + V$$

I.e., a lax low vowel is deleted from a word in which it is flanked on both sides by at least one syllable if the vowel of the following syllable begins a new morpheme.

alternation of shwa with zero which is observable in the systematic-phonetic representations of the following examples :

Forms with shwa	Forms without shwa
[nikəlnā] 'to come out' (inf.)	[niklā] 'come out' (masc. sg.)
[nikəltā] 'coming out' (masc. sg.)	[niklēgā] 'will come out' (masc. sg.)
[uləṭnā] 'to turn upside down' (intr.)	[ulṭānā] 'to turn upside down' (tr.)
[gərəjtē] 'roaring' (masc. pl.)	[gərjēgī] 'will roar' (fem. sg.)
[bədəlnā] 'to change' (inf.)	[bədlū̃gā] '(I) shall change' (masc.)
[bədəlkər] 'having changed'	[bədlō] 'change!' (pl. imper.)
[bədəltī] 'changing' (fem. sg.)	[bədlānā] 'to cause to change' (inf.)
[cəməknē] 'to shine' (inf. intr., oblique case)	[cəmkānā] 'to shine' (inf. trans.)

The alternation of shwa with zero is, however, by no means limited to verbs. As the forms below show, it occurs with equal regularity in words belonging to other grammatical categories :

[ɔ̄rət] 'woman'	[ɔ̄rtē̃] 'women'
[səṛək] 'road'	[səṛkō̃] 'roads' (oblique pl.)
[mūrət] 'picture'	[mūrti] 'idol'
[sənək] 'craze' (noun)	[sənkī] 'crazy' (adj.)
[cəmək] 'brilliance'	[cəmkīlā] 'brilliant'
[rōšən] 'bright' (adj.)	[rōšnī] 'brightness' (noun)
[sūrət] 'shape'	[sūrtē̃] 'shapes'
[ādət] 'habit'	[ādtē̃] 'habits'
[milən] 'meeting, agreement'	[milnī] 'a part of the Hindu marriage ceremony'

To account for these and many other forms, Rule 1a must, therefore, be generalized in such a way that it is no longer restricted to verbs in its application. Rule 1b is the result of this generalization process :

aspiration and nasalization in the generative phonology of Hindi-Urdu.[1]

1. We begin our discussion with a restatement of Kellogg's rule as it might appear in a generative phonology of Hindi-Urdu. Rule la represents a 'literal translation' of Kellogg's rule from English prose into the distinctive-feature notation of generative phonology :

$$\text{(1a)} \begin{bmatrix} +\text{syllabic} \\ +\text{compact} \\ -\text{tense} \end{bmatrix} \rightarrow \emptyset \; [\text{v}C_0VC_1 \text{—} C_1 + V$$

i.e., a lax low vowel /a/, which a later rule will convert to [ə], is deleted from the second syllable of dissyllabic verbal roots when the latter are followed within the same word by a morpheme beginning with a vowel.

Rule 1a, as we have stated it, says no more and no less than Kellogg's original rule.[2] It thus accounts for the

---

1 The 'Hindi-Urdu' to which we refer is neither the highly Sanskritized Hindi nor the highly Perso-Arabicized Urdu of the purists, but rather the 'common core' language generally spoken by educated Hindus and Muslims in an area of the South Asian subcontinent that includes the states of Delhi, Uttar Pradesh, Madhya Pradesh, and Bihar, as well as parts of Punjab and Himachal Pradesh, and in such distant urban centers as Karachi and Calcutta, Delhi and Dacca, Hyderabad and Lahore.

2 The symbols C_0 and C_1 stand for 'zero or more consonants' and 'one or more consonants', respectively. Following Kellogg, we have specified no upper limit on the number of consonants which can appear in the root and no lower limit on the number of consonants which can begin the root. The lower limit of 'one' which we have attached to the second occurrence of the symbol C is implicit in the notion 'inherent *a*', while that attached to the third occurrence of C is dictated by the fact that an 'inherent *a*' is not normally pronounced in morpheme-final position. We interpret the word 'attenuate' as synonymous with 'delete', despite Kellogg's assertion (p. 12) that the loss of the inherent *a* is not complete, but rather results in the production of an 'obscure sound' which he himself had overlooked in the 1875 edition of his grammar.

Reprinted from LANGUAGE
Vol. 47, No. 3, September, 1971

ASPIRATION AND NASALIZATION IN THE GENERATIVE PHONOLOGY OF HINDI-URDU

GOPI CHAND NARANG AND DONALD A. BECKER
University of Delhi *University of Wisconsin*

An alternation of shwa with zero which is characteristic of a wide variety of morphemes is shown to support a generative phonological treatment of Hindi-Urdu in which aspirated consonants are analysed as units, while nasalized vowels are derived from underlying sequences of vowel plus nasal consonant. Some observations concerning the distribution of nasal segments at the level of systematic phonetics provide the basis for rules by which the five nasal consonants [m n ṇ ɲ ŋ] can be derived from underlying representations in which only two nasal segments are distinguished.

In Chapter I of his monumental *Grammar of the Hindi language,* Kellogg (1893 : 12) states the following rule: 'The... *a* [which is inherent in each consonant] is attenuated ... in the final syllable of dissyllabic verbal roots, before all the terminations beginning with vowels; as in ... *nik'lá* from the root ... *nikal.* But in the same roots, when the termination begins with a consonant, the *a* is fully vocalized, as, e.g., in ... *nikal'tá.* Although Kellogg presents this rule under the general heading 'Pronunciation of letters', it is much more than just a rule for interpreting the Devanagari orthography of modern Hindi. As we shall demonstrate in this study, it accounts for a morphophonemic alternation which, in addition to being one of the most pervasive in the entire language, sheds some revealing light on the phenomena of

Rampur Raza Library's Publication

© author

Urdu Zabaan aur Lisaaniyaat

by

Gopi Chand Narang

Year of Publication	:	2006
Price	:	Rs. 450
Composing	:	Mohd. Musa Raza
Publisher	:	**Dr. Waqarul Hasan Siddiqi** (Former Director ASI) OSD, Rampur Raza Library Qila, Rampur, Rampur - 244 901
Printed by	:	**Printology Inc.** 2660, Kucha Chellan Darya Ganj, New Delhi - 110 002.

ISBN : 81-87113-89-0

Urdu Zabaan
aur
Lisaaniyaat

by

Gopi Chand Narang

RAMPUR RAZA LIBRARY
Qila Rampur, Rampur 244 901

نے پچھلے دو دہوں کے دوران ادبی تنقید کے لسانی مضمرات پر کافی غور وفکر سے کام لیا ہے اور تنقید کے اُن تمام مسالک کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے جن کا رشتہ کسی نہ کسی اعتبار سے زبان یا لسانیات سے استوار ہے خواہ وہ روسی ہیئت پسندی ہو یا ساختیات وپس ساختیات یا مظہریت یا مابعد جدیدیت یا کوئی اور جدید نظریۂ تنقید۔ ان میدانوں میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ نارنگ صاحب اردو کے اولین نقادوں میں ہیں جنھوں نے نئی تنقیدی تھیوری اور نئے تنقیدی مباحث پر اس طرح قلم اٹھایا کہ اردو تنقید کی گویا کایا ہی پلٹ دی۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ خواہ وہ اسلوبیات ہو یا ساختیات وپس ساختیات یا مابعد جدیدیت یا قاری اساس تنقید، نارنگ صاحب نے تنقید کے ان تمام شعبوں میں بنیادی اور ٹھوس کام کیا ہے جس سے اہلِ نقد ونظر تا دیر مستفید ہوتے رہیں گے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا شمار اگرچہ علمائے ادب میں ہوتا ہے اور وہ اردو کے منفرد وممتاز اور بلند پایہ نقاد اور نظریہ ساز ہیں لیکن اردو زبان اور لسانیات سے بھی ان کی دلچسپی کچھ کم نہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نارنگ صاحب بنیادی طور پر ایک ماہرِ لسانیات ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ منتخب لسانیاتی مضامین پر مشتمل پروفیسر گوپی چند نارنگ کی یہ عالمانہ تصنیف اردو کے لسانیاتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کتابِ حوالہ کا نہ صرف اردو زبان اور لسانیات سے دلچسپی رکھنے والے اربابِ علم خیر مقدم کریں گے بلکہ عام اردو داں حلقے میں بھی اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ان یادگار مضامین کے مجتمع ہونے سے اب ان سے استفادہ آسان ہوجائے گا۔"

— پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
(علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

گوپی چند نارنگ کی بعض اہم تازہ کتابیں